ماہنامہ
چیف ایڈیٹر: محمود شام
انتہاؤں میں رابطہ
اطراف
کراچی
119
جون 2024

امریکی طالب علم اسرائیل کی بربریت کیخلاف میدان میں

(خصوصی تحریریں)

قیمت: پاکستان میں 400 روپے
بیرون پاکستان۔ 5 ڈالر

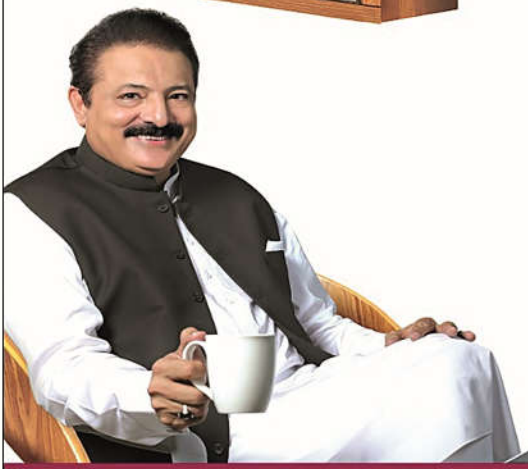

BUSINESS VALUE ACCOUNT
PLUS
UP TO
RS.
CRORE*
Free
Inventory
Insurance
New Benefits
Free Funds Transfer & Interbank Funds Transfer
Free ATM Transactions from Other Banks' ATMs
Plus Benefits
ATM Snatching Insurance
Business Inventory Insurance
Free Cheque Books
Free PayPak Debit Card
Free Pay Orders
Free Intercity Transactions
* Terms and Conditions apply.
ZABARDAST BANK - BEMISAAL SERVICE
021-111-100-333 0301-1177777
www.silkbank.com.pk /silkbankpk SMS 9873
SILKBANK
Yes we can

باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت ABC certified

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جلد 11: شمارہ: 5/6

جون 2024

قیمت فی پرچہ: 400 روپے۔ سالانہ: 4000 روپے۔ بیرون ملک۔ 50 ڈالر

چیف ایڈیٹر : محمود شام

mahmoodshaam@gmail.com

ایڈیٹر : خان ظفر افغانی

ریذیڈنٹ ایڈیٹرز: تنویر شہزاد (لاہور)، عبدالغفور چوہدری (کینیڈا)

نگراں شعبۂ اولاد۔ تربیت۔ تواضع : رخشندہ محمود نمائندہ خصوصی : محمد اجمل (کوئٹہ)

ڈیزائن : محمد شاہد رفیق : عکاسی : شکیل قریشی : مارکیٹنگ: محمد آصف : 0331-0063311

سرکولیشن منیجر: راجہ شاہد : 0300-8210636 , 0332-2561774

ویب سائٹ اہتمام : www.launchpad.pk

پبلک اور میڈیا ریلیشنز : دی پیسیج : www.thepassagepr.com

قانونی مشیر : نفیس صدیقی ایڈووکیٹ سپریم کورٹ nafislaw@cyber.net.pk

﴿جون خاص﴾ غزہ کے لیے امریکی طلبہ کی جدوجہد
☆عاصم متین خان (نیویارک) 11-14

اپنے شہر کو اچھی طرح جانیں۔ سمجھیں
اطرافیہ 05

غذائیت میں افادیت
☆سید ارتقا احمد زیدی 09

ایک فلسطینی اسسٹنٹ پروفیسر کی لافانی تحریر
☆ یحیٰ صوافطہ 15-17

چین اور روس کے درمیان قریبی تعلقات
☆ علی نواز گیلانی 19-20

عمر کا سورج
☆سعیدہ افضل کی آپ بیتی 21-23

میں شاپنگ کہاں، کیسے، کیوں کرتی ہوں؟
☆ دلچسپ آپ بیتیاں 27-35

کینیڈا میں پہلی بار یوم مئی
☆اطراف رپورٹ 36

حیدر آباد کی معیشت
☆پروفیسر شاداب احمد صدیقی 37-41

گوجرانوالہ کی معیشت
☆ صدام ساگر 42-44

منڈی بہاؤالدین کی معیشت
☆ڈاکٹر انور شاہین 45-47

کھڈا مارکیٹ کا نوحہ
☆ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی 51-52

عمرکوٹ کی معیشت عمرکوٹ کی بیٹیوں کی تحریریں
☆مونیکا۔ کھنوا۔ درشابائی 53-56

گجرات، باجوڑ، مظفر گڑھ، بورے والا، وزیر آباد، بھاگ، کوئٹے کی معیشت (☆اہم مضامین) 57-73

ہر باپ عظیم۔ لائق تعظیم صدف بنت اظہار، ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی، پروفیسر شاداب احمد صدیقی، عاصم متین خان، فرزین لہرا، پناہ بلوچ، مقبول خان کا اپنے والد کو خراج عقیدت 74-82

تذکرہ کتابوں کا
☆ خان ظفر افغانی 91-93

یونیورسٹیاں | تربیت | ٹی وی ڈرامہ | حسن و زیبائش | تیمارداری | یادداشتیں

لائبریریاں | سائنسی ادارے | معیشت | سیاحت | مشترکہ خاندان | بین الاقوامی کتابیں

ایڈیٹر پبلشر: طارق محمود شام۔ پرنٹر: اسلم ذکی عائشہ پرنٹرز۔ مقام اشاعت : اے 262 بلاک 3 گلشن اقبال کراچی۔

خط و کتابت صرف اس پتے پر: اے 262، بلاک 3، گلشن اقبال، کراچی۔ فون: 0300-8210636

ای میل: Mahmoodshaam@gmail.com ویب سائٹ: www.atraafmagazine.com

PEBS Hospital

A Project of Pakistan Eye Bank Society

www.pakistaneyebank.org.pk 021-6977733-55

اطرافیہ

اپنے شہر کو اچھی طرح جانیں۔ سمجھیں

سب سے پہلے تو آپ سب قارئین 'اطراف' کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ کہ اب جب ملک پر ابتلائیں نازل ہو رہی ہیں۔ حرف مطبوعہ بالخصوص زوال کی طرف گامزن ہے۔ حرف و دانش کی سماج میں کوئی ضرورت نہیں رہی۔ ان سفاک دنوں میں آپ 'اطراف' سے وفاداری بشرط استواری قائم رکھے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے میڈیا ہاؤسز کے جریدے دم توڑ چکے ہیں۔ آپ کی وابستگی۔ مستقل خریداروں کی طرف سے ہر سال بروقت خریداری کی تجدید۔ کچھ تدبر شناس صنعت کار تاجر احباب کی طرف سے اشتہارات کا عطیہ۔ عطیہ اس لیے کہ 'اطراف' اتنا کثیر الاشاعت تو نہیں ہے کہ ان کی مصنوعات کا اس کے اوراق میں اشاعت سے فروخت میں اضافہ ہوتا ہو۔ بینکوں۔ اسپتالوں۔ زرمبادلہ۔ فلاحی اداروں کے اشتہارات دراصل ادراک۔ متانت۔ تہذیب اور اقدار کی سرپرستی سے آپ حرف نوازوں کی مسلسل کرم فرمائی سے 'اطراف' جولائی 2024 سے اب تک باقاعدگی سے آپ کے گھر میں رجسٹرڈ ڈاک سے پہنچ رہا ہے۔

ہمارا بنیادی پیغام بھی یہی ہے کہ پاکستان کے ہر شہری میں اپنی دھرتی ماں سے ایک لازوال یگانگت کی آبیاری کریں۔ ہمارا ایمان ہے کہ وفاق پاکستان کے صوبے بلوچستان۔ کے پی کے۔ سندھ۔ بلوچستان۔ اور وحدتیں آزاد جموں و کشمیر۔ گلگت بلتستان دنیا کے حسین ترین علاقے ہیں۔ جہاں ایک ہی دن میں چاروں پانچوں موسم کہیں نہ کہیں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہمارا محل وقوع بہت ہی اہم اور حساس ہے۔ ہم ہر مہینے اپنے اوراق کے ذریعے مملکت خداداد کے ہر فرد میں اپنے شہر سے ایک اٹوٹ رشتہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دوسرے ملکوں سے بھی ایسے مضامین اور کتابیں تلاش کر کے ترجمہ کرتے ہیں جن میں اپنی مٹی سے عشق کا درس ہوتا ہے۔

ہم پہلی اشاعت سے ہی پڑھنے والے کے دل میں یہ حقیقت جانشین کرتے آئے ہیں کہ اپنے شہر کا۔ اپنی گلیوں کا احترام کریں۔ اس شہر میں آپ پیدا ہوئے یا حصول رزق کے لیے آپ نے اسے اپنایا ہے۔ اور جس شہر نے آپ کو گود لیا ہے وہ آپ کی ماں ہے۔ اس کے قدموں تلے جنت ہے۔ آپ کا بچپن اس کی گلیوں میں پلتا بڑھتا ہے۔ آپ اس کے اسکولوں یا مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایک کارآمد شہری بننے کی تربیت پاتے ہیں۔ اس کی فضائیں آپ کے جسم کو بلوغت سے ہمکنار کرتی ہیں۔ ذہن کو پختگی عطا کرتی ہیں۔ جینے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ مشکلات سے مزاحمت کی ہمت بخشتی ہیں۔ آپ اعلیٰ ہیں یا ادنیٰ۔ کسی اعلیٰ سرکاری عہدے پر ہیں۔ یا کسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ یا اپنی دکان کھولے ہوئے ہیں۔ یا کسی بھی سطح پر اس شہر کی خدمت کر رہے ہیں تو یہ شہر آپ کی پہچان ہے۔

'اطراف' آپ سے یہ گزارش کرتا ہے کہ آپ اپنی شناخت یعنی اس شہر کے خدوخال کو اچھی طرح جاننے کی کوشش کریں۔ اس کی صدیوں سے گزریں۔ اس کے حدود اربعہ پر غور کریں۔ اس کی تاریخ پر فخر کریں۔

اب دنیا دوسرے ہزارے میں داخل ہوئی ہے۔ ان دونوں ہزاریوں میں آپ کے شہر نے کتنی نسلوں کو سنبھالا ہے۔ ہمارے اکثر شہر تو پانچ ہزار آٹھ ہزار دس ہزار سال کی عمر کے ہیں۔ انہوں نے کتنی تہذیبوں کو پروان چڑھایا۔ کتنے زمانے دیکھے۔ کتنے حملہ آوروں کو برداشت کیا۔ 'اطراف' کی کوشش یہ ہے کہ ہر شہر کا سراپا قلمبند کیا جائے۔ اس کی زلفیں کس کے شانے پر پریشان ہوتی ہیں۔ وہ کب سائیں سائیں کرتا ہے۔ کب لاپتہ ہوتا ہے۔ کب بازیاب۔

اس میں اسکول مدرسے کالج جامعات تو پہلے سے تھیں۔ اب جدید دور کے علوم کتنے طلوع ہوئے ہیں۔ شہر کے بیٹوں بیٹیوں کو آج کے جدید آلات۔ سوشل میڈیا کے مقامات آہ و فغاں تک کتنی رسائی ہے۔ کیا انہیں آج کے زمانے کی ایجادات اور ہنر کی تربیت دی جارہی ہے۔ کیا ہمارے نوجوانوں میں انٹرنیٹ پر ترقی یافتہ شہروں کی سہولتیں دیکھ کر اپنے شہر کو بھی ویسا بنانے کی امنگ تنگ کرتی ہے۔ زندگی کتنی آسان ہے۔ شہروں پر مافیاؤں کا راج کس کس شعبے میں ہے۔ بلدیاتی ادارے۔ میونسپل کمیٹیاں۔ میونسپل کارپوریشن۔ میٹروپولیٹن کارپوریشنیں۔ یونین کونسلیں۔ کس حد تک بااختیار ہیں۔ اپنے مسائل کے حل کے لیے کیا اپنے وسائل کافی ہیں۔ یا دوسرے شہروں سے کوئی مدد لینا پڑتی ہے۔ ہر سال اس شہر سے بڑے شہروں کی طرف کتنی منتقلی ہوتی ہے۔

شہروں میں روایتی میلے منعقد ہو رہے ہیں یا نہیں۔ جہاں انسان ہی نہیں حیوانوں کی بھی نمائش ہوتی تھی۔

شہر کے اساتذہ اور سماجی کارکنوں کا احترام کتنا ہے۔ شہر کے افسر۔ کمشنر۔ ڈپٹی کمشنر۔ اور دوسرے عہدیدار شہریوں کی خدمت کرتے ہیں۔ یا ان پر بادشاہی چاہتے ہیں۔

آپ کے شہر کے ہیرو کون ہیں اور ولین کون۔

اس شمارے میں بھی کچھ معلومات انہی سلسلوں کی ہے۔ آئندہ بھی ہم یہی کوشش کریں گے۔

اپنے شہر سے عشق کریں۔ اسے اچھی طرح جانیں۔ اس کے ہر لمحے کو محفوظ کریں۔ فیس بک۔ ویب سائٹ پر اپنے شہر کا حسن دوسرے شہروں تک پہنچائیں۔

اپنے احباب کو 'اطراف' کی مستقل خریداری کے لیے بھی قائل کریں۔

محمود شام

kundun

Now Introduces 3 - 5 Pieces New Design Trolly Bags With Small Beauty Case Different Colour
Original Fiber Material JIAN LUGGAGE Is The Best Way For Travelling

Also Deals in Shawls , Kashmir Shalws, Pashmina, Embroidery
Shahtoosh, Kalamkar & Jamawar

Address: Adullah Haroon Road Opp. Hotel Metropole.
Ph: +92 21 35686641-42 Fax: +92 21 35684349

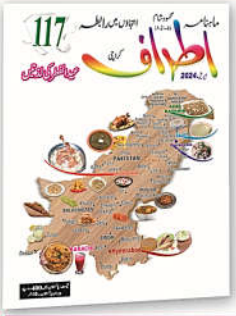

السلام علیکم اطراف

پاکستانی بہو اور شادی کے بعد کے عام مسائل

مارچ کا 'اطراف' کا شمارہ ''عورت نمبر'' تھا، اس میں امریکہ میں مقیم تارکین وطن پاکستانی خواتین، ان کی کامیابیوں، روزمرہ کی جدوجہد، عام گھریلو معاملات اور روزمرہ کے دیگر مسائل پر ایک تحریر میں طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد کچھ دوستوں نے اور جاننے والوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ہر خاندان میں جلد یا بدیر وقوع پذیر ہونے والے اہم ترین مسئلے کے بارے میں بعض نہایت اچھے نکات اٹھائے۔

ماں باپ اپنے بیٹے بیٹیوں کی شادی کرتے وقت یہ بھی سوچتے ہیں کہ وہ خوشگوار شادی شدہ زندگی گزاریں۔لیکن جب بچے شادی کے بعد خوش نہ ہوں تو نہ صرف بچوں کا سکون خراب ہوتا ہے بلکہ ان کے ماں باپ کا سکون بھی ختم ہو جاتا ہے۔ بالخصوص لڑکی کے ماں باپ کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

ماں باپ اپنے بیٹا بیٹی دونوں ہی کی پرورش پیار محبت سے کرتے ہیں لیکن بیٹی کے بارے میں ماں باپ کی فکر زیادہ ہوتی ہے کیونکہ جس بیٹی کو وہ زیادہ پیار سے حفاظت سے ناز و نعم سے پالتے ہیں وہ بیٹی کی پریشانی کو جس طرح برداشت کرتے ہیں وہ ایک بیٹی کے ماں باپ ہی جان سکتے ہیں۔

سسرال والے شادی کرتے وقت دنیا کی بہترین، خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی کو اپنی بہو کے لئے تلاش کرتے ہیں، لیکن اکثر شادی کے بعد انکا رویہ اپنی بہو کے لئے یکسر بدل جاتا ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کے ماں باپ کا عمل دخل تو بہت محدود ہوتا ہے جبکہ لڑکے کے ماں باپ کا عمل دخل چوبیس گھنٹے رہتا ہے اور لڑکی کی اور اپنے بیٹے کی نقل و حرکت پر ان کی نظر ایسے رہتی ہے جیسے پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کی فوجی نقل و حرکت پر رکھتے ہیں۔ سسرال والوں کو بچوں کی خوشی کے لئے اور خوف خدا کرتے ہوئے اپنی بہوؤں کو اپنی بیٹی ہی سمجھ کر پیار دینا چاہیئے۔ تا کہ ان کا بیٹا بھی خوش رہے، بہو بھی اور پورا خاندان بھی سکون سے رہے گا۔ یہ ایک عام زندگی کا اصول ہے کہ اگر آپ کسی کو عزت اور پیار دینگے تو دوسرا شخص بھی اور خاص طور پر آنے والی بہو بھی اپنی پوری کوشش کرے گی کہ سب سسرال والے خوش رہیں۔ اس بات کو روا ستی سوچ اور رویئے سے ہٹ کر سب کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے تب ہی حالات اور تعلقات میں بہتری کی امید ہو سکتی ہے۔

شادی سے پہلے لڑکے کے گھر میں جب گھر کے تمام معاملات میں گھر کے مرد فیصلے کرتے ہیں لیکن بہو کے آنے کہ بعد گھر کے مرد بیک سیٹ پر چلے جاتے ہیں اور خاتون خانہ گھر کا چارج سنبھال لیتی ہیں اور ایک خوف میں کہ کہیں بیٹا اپنی بیوی کے کنٹرول میں نہ آجائے ایک بلا وجہ کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے جو بعض اوقات نہایت خطرناک حد پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ پاکستان میں تو کبھی کبھار لیکن بھارت میں تو اکثر و بیشتر بہو اس کشمکش میں اپنی جان بھی گنوا دیتی ہے۔

اگر شادی کے بعد گھر میں آنے والی بہو کو بتدریج گھریلو معاملات کا چارج دے کر اپنی اچھی امیدوں کے بارے میں بتا دیں تو شاید حالات بہتر ہی رہیں۔لیکن افسوس کہ اکثر ایسا نہیں ہوتا۔

اس معاملے میں عموی طور پر گھر کے مردوں کے کان بہت کچے ہو جاتے ہیں اور بہو گھر میں آنے کے بعد ان کی فیصلہ کرنے کی قوت بھی شائد ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ زندگی کے اس نازک موڑ پر سسر کو اور نئے شادی شدہ شوہر کو اپنی ذمہ داری مکمل سمجھداری کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔ اور لڑکے کے باپ کو چاہیئے جب بیٹے کی شادی کر دی ہے تو اسے اپنے تجربے کی روشنی میں اس کی نئی ذمہ داری پوری کرنے میں مدد کریں نہ کہ اس کی اپنی نئی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مزاحمت کریں، سسرال والے اپنے بیٹے اور بہو کو خوش دیکھ کر خوش ہوں نہ کہ ناک بھوں چڑھائیں۔ لڑکے کے باپ کو چاہئے کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنی بہو کے لئے ایسا کردار ادا کرنے میں مدد کریں جیسا وہ اپنے داماد وں یا اپنی بہنوں کے شوہر میں دیکھنا چاہیں گے۔

نئے شادی شدہ جوڑے کا یہ نیا سفر ہوتا ہے جس میں ان کو کوئی پچھلا تجربہ نہیں ہوتا اس سلسلے میں شادی کے اوائل میں گھر کے تمام افراد کی مثبت معاونت ان کی ساری زندگی کو خوشگوار بھی بنا سکتی ہے اور جہنم بھی۔ بہو کے لیے مشکل حالات ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے گھر بار کو چھوڑ کر ایک نئے ماحول میں آئی ہوتی ہے اور اس کو اپنے آپ کو اس نئے ماحول میں ایڈجسٹ کرنا ہوتا ہے جہاں ہر چیز نئی ہوتی ہے نئے لوگ نیا ماحول۔ یہ بات پاکستان میں اور بالخصوص پاکستان سے شادی ہو کر باہر ممالک جانے والی بہوؤں کے لئے یکساں طور پر درست ہے۔ سسرال میں منفی اور نامساعد حالات بہو کے اس نئے سفر کو مزید پیچیدہ کر دیتے ہیں۔ بہو کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی ہوتی ہے لیکن لڑکی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو کر آتی ہے اس کی امید ہوتی ہے کہ اس کا شوہر اور سسرال والے اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ اکثر اگر کوئی تیار نہیں ہوتا تو وہ لڑکا یعنی لڑکی کا شوہر ہوتا ہے جسکی وجہ سے خود لڑکے کے لئے اور بالخصوص اس کی بیوی کے لئے مشکلات کا لامتناہی سفر شروع ہو جاتا ہے۔

مائیں اپنی بیٹیوں کو شادی کے بعد کی سسرال میں کامیاب زندگی گزارنے کے سارے ڈھنگ سکھاتی ہیں۔ پھر بھی لڑکی چاہے کتنی گھڑ کیوں نہ ہو اسے سسرال میں یا شوہر سے یہ طعنہ سننے کو ضرور ملتا ہے کہ تمہارے ماں باپ نے کچھ سکھایا نہیں۔ زیادہ تر لڑکیاں یہ طعنہ سن کر خاموش رہتی ہیں یہ نہ صرف لڑکی کی بے عزتی ہوتی ہے بلکہ لڑکی کے ماں باپ کی بھی۔ لیکن لڑکے کی کسی بات پر لڑکی اپنے شوہر سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ تمہارے ماں باپ نے کچھ سکھایا نہیں۔ اور یہ بات صحیح بھی ہے کہ زیادہ تر باپ ایسے ہیں جو اپنے بیٹے کو شادی کے بعد کی ذمہ داریوں کے لئے تیار نہیں کرتے۔ وہ نہیں بتاتے کہ اب تمہاری ذمہ داریاں بطور ایک شوہر کے بڑھیں گی کیسے ان ذمہ داریوں کو اور دوسری ذمہ داریوں میں توازن رکھنا ہے۔ اور آج لڑکیوں کی شادی شدہ زندگی میں مسائل کی بڑی وجہ لڑکے کے باپ کی یہ کوتاہی ہے جو وہ اس ذمہ داری کے لئے تیار نہ کر کے اپنے بیٹے کو نکما بنا دیتے ہیں جو اکثر شادی کی ناکامی یا غیر خوشگوار شادی شدہ زندگی کی صورت میں نکلتا ہے۔ لڑکے کے باپ اگر غور کریں تو یہ ان کی اپنے بیٹے کی شادی سے پہلے کی بڑی اہم ذمہ داری ہوتی ہے جو کم ہی لوگ پوری کرتے ہیں۔

نئے شادی شدہ جوڑے کی زندگی کے چند سال ایک ایڈجسٹمنٹ کے ہوتے ہیں جہاں لڑکی کو اپنے نئے گھر میں تمام لوگوں کو سمجھنا ہوتا ہے جو اس کے لیے سب نئے ہوتے ہیں لڑکے کے لیے تبدیلی کوئی نہیں ہوتی سوائے اس کی زندگی میں ایک خوشگوار اضافے کے جو اس کو بیوی کی صورت میں ملا ہوتا ہے اس کے علاوہ کوئی نئی تبدیلی نہیں ہوتی یہ اب لڑکے کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ لڑکی کی ایڈجسٹمنٹ کو آسان بنائے۔ لڑکا اپنی بیوی کو جس قدر سمجھ سکتا ہے، گھر کا کوئی اور دوسرا فرد اس کو نہیں سمجھ سکتا اس لیے لڑکے کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو اچھا وقت دے تا کہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ لڑکے کو اپنے اور اپنے گھر والوں کے درمیان میں اور اپنی بیوی کے درمیان میں ایک ایسے مثبت رابطے کا کام کرنا چاہیئے جو سب کو ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دے۔ اور جن

قارئین کے خطوط

باتوں سے غلط فہمیاں ہوتی ہیں ان کو دور کرے۔ روائتی طور پر لڑکے کو یہ پریشانی ہوتی ہے کہ کہیں گھر والے یہ نہ سمجھیں کہ لڑکا اپنی بیوی کے کنٹرول میں تو نہیں جا رہا اس لیے بعض اوقات لڑکے اپنی بیوی کو وقت دینے کے بجائے فاصلہ رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ بلکہ اکثر تو لڑکے شادی کے بعد بیوی کے بجائے اپنے گھر والوں کو زیادہ وقت دینے لگتے ہیں جو شائد وہ شادی سے پہلے اپنے گھر والوں کو کبھی نہیں دیتے ہوں۔

اکثر اوقات لڑکے کے گھر والے بھی ایک خوف میں دفاعی کوششیں کرتے ہیں کہ لڑکا اپنی بیوی کے کنٹرول میں نہ چلا جائے۔ لیکن یہ ایک بڑی سنگین غلطی ہوتی ہے یہ معاملہ کنٹرول کا نہیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا ہوتا ہے لڑکے کو اور لڑکی کو ایک دوسرے کو سمجھ کر اپنی زندگی کو خوشگوار اور دوسروں کی زندگی کو پر سکون بنانے کا۔ لیکن ہوتا اس کے برخلاف ہے نہ لڑکا اور لڑکی کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور نہ ہی گھر والوں سے تعلقات بہتر ہوتے ہیں نتیجتاً پورے گھر کا سکون برباد ہو جاتا ہے نہ لڑکا خوش نہ لڑکی خوش، نہ لڑکے کے گھر والے خوش اور لڑکی کے ماں باپ کا دن کا سکون اور رات کی نیند سب حرام ہو جاتی ہے۔

اور اس موڑ پر پہنچنے سے پہلے اگر لڑکے کا باپ ایک ایسا کردار ادا کرے جو اس کے اپنے بیٹے کو اپنی نئی زندگی میں ایڈجسٹ ہونے میں مدد دے اور اپنی بیوی کو سمجھنے اور اچھے تعلقات قائم کرنے میں مددگار ہو۔ لیکن عام طور پر لڑکے کا باپ اپنے بیٹے کو تو اپنی بیوی کے کنٹرول میں جانے سے روکنے کی پوری کوشش میں دوسروں کی مدد کرتا ہے لیکن خود اپنے آپ کو اپنی بیوی اور اپنے گھر والوں کے کنٹرول میں دے دیتا ہے اور وہ کردار ادا نہیں کرتا جو اسے باپ کے طور پہ ادا کرنا چاہیے۔

امام احمد بن حنبل نے اپنے بیٹے کو شادی کی رات دس نصیحتیں کریں تا کہ وہ گھر کا سکون حاصل ہو سکے۔ یہ 10 نصیحتیں ہر لڑکے کی خوشگوار شادی شدہ زندگی کے لیے مشعل راہ ہیں:

1: عورتیں تمہاری توجہ چاہتی ہیں اور واضح الفاظ میں ان سے محبت کا اظہار کرتے رہو تا کہ ان کو پتہ چلے کہ وہ تمہارے لیے کتنی اہم ہے اس گمان میں نہ رہو کہ وہ خود سمجھ جائیں گی رشتوں کو اظہار کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔

2: اپنے جذبات کے اظہار میں کنجوسی نہ کرنا اس سے رشتے میں دراڑ پڑ جاتی ہے اور دوسرے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

3: سخت مزاج مرد کو عورت کو پسند نہیں کرتی اور وہ نرم مزاج مرد کی نرمی کا بے جا فائدہ بھی اٹھا سکتی ہے اس لیے اعتدال سے کام لے کر توازن رکھنا

4: عورت اپنے شوہر سے ویسے ہی توقع رکھتی ہے جو شوہر اپنی بیوی سے رکھتا ہے یعنی عزت محبت طہارت اور پاکیزگی۔

5: گھر کی چار دیواری عورت کی سلطنت ہوتی ہے اس میں بیجا مداخلت نہ کرنا اور اسے آزادی دینا کہ وہ ان معاملات کو اپنے حساب سے چلائے۔

6: بیوی اپنے شوہر سے محبت کرنا چاہتی ہے لیکن اس کے ماں باپ، بہن بھائی بھی ہوتے ہیں جن سے ان کی لاتعلقی نہ ہونے دینا اور کبھی مقابلہ بھی نہ کرنا ورنہ اس کی بے چینی اسے تم سے بھی دور کر دے گی

7: اپنی بیوی کی کوئی بات بری لگے تو سختی کے بجائے نرمی سے بات کرنا سختی اسے توڑ دے گی اور تمہارے رشتے کو بھی۔ لیکن ہر غلط بات کو بھی نہیں ماننا۔ حکمت اور اعتدال سے کام لینا۔

8: عورت کی فطری ناشکری یا ناقدری سے پریشان ہو کر اس کا خیال کرنا بند نہ کرنا یہ معمولی سی بات ہے لیکن اس کے علاوہ عورت میں بے شمار خوبیاں ہیں ان پر نظر رکھنا اور اپنی ذمہ داری پوری کرتے رہنا۔

9: جسمانی کمزوری کے ایام میں اسے اللہ نے عبادت میں بھی چھوٹ دی ہے اس لیے تم بھی اس کے ساتھ مہربان رہنا کام کاج میں مدد اور سہولت پیدا کرنا۔

10: تمہاری بیوی کے ساتھ تمہارے سلوک کے بارے میں اللہ تعالیٰ تم سے سوال کرے گا اس لیے اس کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ رکھنا۔

شادی سے پہلے یہ بہت ضروری ہے کہ آپ صرف ایسی لڑکی کو ہی نہ ڈھونڈیں جو اپنی شادی شدہ زندگی کو سنوارنے اور صرف سسرال والوں کو خوش کرنے کے لیے کوششیں کرتی رہے آپ اپنے بیٹے کو بھی تیار کریں کہ وہ شادی کرنے کے بعد کی ذمہ داریوں کو سمجھے اور ان کو صحیح طور سے نبھا سکے۔

بات سمجھنے کی یہ ہے کہ بیٹوں کی شادی کے بعد گھر میں امن و امان کی صورتحال بہتر بنانے کی ذمہ داری گھر کے ہر فرد کی ہوتی ہے۔ اگر گھر کا ہر فرد اپنی ذمہ داری مثبت انداز میں پوری کرے تو سسرال کو بہو کے لئے سسرائیلی بنانے سے بہت آسانی سے روکا جا سکتا ہے اور گھر سکون کا گہوارہ بن سکتا ہے! **(عاصم متین، نیویارک)**

اسیر بڑھاپا۔ اپنے آنسو اپنے دامن

کئی مہینوں کے بعد حاضر ہوا ہوں دل تو چاہتا ہے کہ ہمیشہ آپ سے رابطے میں رہوں لیکن حالات اور وقت کی سرمستیوں کو میری چاہت سے جنم جنم کا بیر جو ٹھہرا۔ میری موجودگی میری زندگی کی علامت ہے کہ میں زندہ ہوں مگر زندگی خود بے توقیر ہے وہ اپنی بے نوری کا قلق سہہ نہیں پا رہی ہے اس کے ہونٹوں پر صدائے احتجاج ہے کہ "جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں"۔

میرا کاروانِ عمر اپنی اختتامی منزل کی طرف گامزن ہے، اس کی رفتار کہہ رہی ہے اسے منزل پر پہنچنے کی کتنی جلدی ہے۔ کارواں گزر رہا ہے۔ اور میری حدِ نگاہ تک غبار ہی غبار ہے۔ موت کی بہتات جتنی آج ہے اتنی کبھی نہیں تھی۔ اب موت پر کوئی حیرت نہیں ہوتی، حیرت تو زندہ دیکھ کر ہوتی ہے "ارے، یہ تو آج بھی زندہ ہے۔"

شاید اسی کا سائیڈ افیکٹ Side Effect ہے کہ مجھے اپنی پنشن جاری رکھنے کے لیے ہر چھ ماہ بعد اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دینا ہوتا ہے لائف سرٹیفکیٹ کی صورت میں اس کے برعکس بغیر تصدیق کیے کہ میں زندہ ہوں کہ نہیں آپ کا اعتماد اور آپ کی مہربانی مجھے ہر ماہ 'اطراف' سے نوازتی رہتی ہے۔ آپ نے اعتماد کی جو عزت بخشی ہے اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔

انتظار بھی تو زندگی ہے۔ میرے انتظار کا محور اب صرف 'اطراف' ہے کوئی اور نہیں کیونکہ میرے اچھے دنوں کی طرح میرے تمام ساتھی بھی میرا ساتھ چھوڑ گئے یا یوں کہہ لیں گیا جب موسم گل بلبل نے چمن چھوڑ دیا۔ اب میں ہوں اور میرے بیتے ہوئے پُر کیف دنوں کی کسک۔ جس کو میری تڑپتی سسکتی زندگی اپنی تمام محرومیوں کے ساتھ دونا کر جاتی ہے۔ جی ہاں وہی زندگی جو شاید انجان کی معیار پر پورا نہ اتر سکی جب ہی تو وہ تمام عمر اس کا ناقدر رہا کہ "زندگی تو بے وفا ہے ایک دن ٹھکرائے گی۔ موت محبوبہ ہے اپنے ساتھ لے کر جائے گی"، لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا میرا ماننا ہے کہ زندگی محبوبہ ہے اور موت رقیب، زندگی موت نہیں دیتی اور موت کو زندگی برداشت نہیں۔ زندگی اس وقت تک ساتھ نبھاتی ہے جب تک موت اس کا تیا پانچہ نہ کر دے، پھر وہ لمحہ بھی آتا ہے جب زندگی موت کے شکنجے میں دم توڑ دیتی ہے، لیکن موت کو موت نہیں آتی۔ وہ امر ہے۔

آہ میں اور میرا بڑھاپا ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اپنی چڑھتی عمر کا بھیانک اتار دیکھ رہے ہیں سہمے سہمے۔ نم دیدہ نم دیدہ۔ بڑھاپا تو بظاہر خاموش ہے مگر اس کے لب سرگوشی کے عالم میں ہے "جوانی کبھی مجھ پر بھی آئی تھی بڑی دھوم سے رنگ و نور کی سوغات لیے۔ لیکن جب وہ گئی تو مجھ پر قہر ڈھا کر مجھے اسیر بڑھاپا کر گئی۔ زندگی کا حسن اور رعنائیاں سمیٹ کر اس طرح گئی کہ کچھ نہ بچا کچھ نہ رہا سوائے افسردگی معذوری کسمپرسی اور پچھتاوے کے۔ خوش گوار بڑھاپا میرا ایک حسین خواب تھا۔ اسے خوشیوں کے جھرمٹ میں گزارنے کی خواہش مچل رہی تھی۔ مگر اب یہ ممکن نہیں رہا میرے خواب بکھر گئے۔ خواہش دم توڑ گئی۔ خوشیاں دامن چھڑا گئیں۔ مگر آہیں اور آنسو تو میرے ساتھ ہیں خواہش کے باوجود بڑھاپا ہنس کے گزارا نہیں پایا خیر، ہنس کے نہیں رو کے ہی سہی گزر جائے گی۔ (عبدالحکیم ثمر، اورنگی ٹاؤن کراچی)

❁❁❁

دو شُمارے ایک ساتھ معذرت

عید الفطر کی چھٹیوں کے باعث اوقات کار کم ہونے اور ڈاک ٹرانسپورٹ میں مشکلات کے باعث مئی جون کا شُمارہ مشترکہ شائع کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ قارئین اور بالخصوص مستقل خریداروں سے معذرت بھی۔ لیکن انہیں انشاء اللہ ایک ماہ مزید رسالہ بھیج کر اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

(ادارہ)

سیدار تقا احمد زیدی۔ ریٹائرڈ جائنٹ سیکرٹری وزارت تجارت ہیں۔ دردمند پاکستانی۔ کئی کتابوں کے مصنف۔ پاکستان کے استحکام اور ترقی۔ عوام کی خوشحالی کے لیے ہمیشہ متحرک اور فعال۔ 'اطراف' کے قلمی سرپرست۔ اور اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کے لیے فکرمند۔ غذائیت پر ان کی تحقیق پھلوں۔ سبزیوں۔ بیجوں کے بعد اب وٹامن پر جاری ہے۔ 'اطراف' کا یہ مستقل سلسلہ قارئین میں حد درجہ مقبول ہے۔ اب اسے کتابی شکل میں بھی پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

فولاد۔ جسم کی نشوونما میں مددگار

☆تحریر: سیدار تقا احمد زیدی

فولاد ہماری غذا کا ایک بہت اہم جز ہے۔ یہ جسم کی نشوونما اور اس کے بڑھنے کی صلاحیت برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ انسانی جسم 25 فیصد فولاد کو محفوظ کر لیتا ہے تا کہ مستقبل میں ہونے والی فولاد کی کمی کو پورا کر سکے اگر کسی وجہ سے خوراک کے ذریعے مطلوبہ فولاد کی مقدار میسر نہ آسکے۔ اور خون کی کمی واقع ہو جائے۔ ستر (70) فی صد فولاد -ہیموگلوبین اور مایوگلوبین میں موجود ہوتا ہے۔ ہیموگلوبین کا کام آکسیجن کو پھیپھڑوں سے جسم کے عضلات تک پہنچانا ہے۔ جبکہ مایوگلوبین Myglobin عضلات کے خلیوں کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔

جب ہم ایک متوازن غذا کھاتے ہیں جس میں فولاد کی وافر مقدار ہوتی ہے۔ تو ہیموگلوبین تیار ہوتی ہے۔ جو کسی حادثے یا چوٹ کی وجہ سے خون ضائع ہونے کی صورت میں کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ اگر ہیموگلوبین یہ کمی پورا کرنے میں ناکام ہو جائے۔ تو پھر جسم انیمیا (Anemia) کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر فوری طور پر خون جسم میں داخل کرنے میں دیر ہو جائے تو سنگین صورت حال پیدا ہو سکتی ہے اور موت واقع ہو سکتی ہے۔ کیونکہ خون کے سرخ خلیے جسم کو آکسیجن فراہم نہیں کر پاتے جو زندہ رہنے کے لئے ناگزیر ہے۔

انسانی جسم کو روزانہ 7. 8 ملی گرام فولاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ حاملہ خواتین میں فولاد کی ضرورت 18 ملی گرام ہوتی ہے متوازن غذا کے ذریعے جسم میں فولاد کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل غذائی اشیا میں فولاد کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔

کلیجی تین اونس ابلی ہوئی۔ 5 ملی گرام
مسور کی دال آدھی کپ ابلی ہوئی۔ 3 ملی گرام
پالک آدھی کپ ابلی ہوئی۔ 3 ملی گرام
لوبیا ابلا ہوا۔ سو گرام۔ 2.9 ملی گرام
مچھلی ابلی ہوئی تین اونس 2 - ملی گرام
چنے آدھا کپ ابلے ہوئے۔ 2 ملی گرام
ٹماٹر آدھا کپ ابلے ہوئے۔ 2 ملی گرام

انسانی جسم کو روزانہ 8.7 ملی گرام فولاد ضروری

گائے کا گوشت تین اونس 2 - ملی گرام
ایک درمیانہ سائز آلو۔ 2 ملی گرام
کا جو ایک اونس۔ 2 ملی گرام

عام طور پر فولاد کی کمی کو فوری طور پر غذا کے ذریعے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اور فولاد کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق آئرن کی گولیاں لینی یا انجکشن لگوانے چاہئیں۔ لیکن اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ بلاوجہ آئرن کی گولیاں

کلیجی۔ مسور کی دال۔ ابلا پالک۔ ابلا لوبیا۔ مچھلی۔ چنے۔ ٹماٹر میں فولاد

استعمال کرنے سے جسم میں آئرن کی مقدار بڑھنے کی کی صورت میں نقصان ہو سکتا ہے۔ لہذا ڈاکٹر کی ہدایت کے بغیر آئرن کی گولیاں کبھی استعمال نہ کریں۔

PAKISTAN CURRENCY
EXCHANGE CO. (PVT) LTD.

بیرون ملک سے بھیجی گئی رقوم پاکستان کرنسی ایکسچینج کی ملک بھر میں 100 سے زائد
برانچز سے سیکنڈز میں وصول کریں

ٹیلی گرافک ٹرانسفر
کرنسی ایکسچینج
ریمیٹنسز

ria Money Transfer
Western Union
MoneyGram money transfer

f pkcurrency
www.pakistancurrency.com
0304-6668810

غزہ کے لیے امریکی طلبہ کی جدوجہد

”عاصم متین خان نیویارک سے ماہنامہ 'اطراف' کے لیے ہمیشہ تعاون کرتے ہیں۔ان سے درخواست کی گئی کہ وہ غزہ کے واقعات کے بعد امریکی یونیورسٹیوں میں ہونے والے مظاہروں کے اسباب سے آگاہ کریں۔انکی بہت متوازن۔ اور سنجیدہ تحریر ملاحظہ کریں۔ اپنی رائے دیں۔“

اسرائیل کے خلاف امریکی یونیورسٹیوں میں مظاہرے کیوں؟

عاصم متین خان (نیویارک)

امریکہ طلباء کی جدوجہد کی تاریخ اور غزہ اسرائیل تنازع

دنیا بھر کی تمام تحریکوں کی طرح امریکہ کی بھی دو صدیوں سے زیادہ عرصے کی تاریخ کی متعدد تحریکوں میں معاشرے کے دیگر طبقوں کے ساتھ طلباء نے بھی اہم کردار ادا کیا۔امریکہ کی جنگ آزادی سے لیکر غزہ اسرائیل تنازعے میں رائے عامہ کو تبدیل کرنے میں، حکومت کی پالیسی سازی اور حکمت عملی پر طلباء نے نہ صرف کھل کر اور سرگرمی کے ساتھ اپنی رائے کا مدلل اظہار کیا اور ہمیشہ مثبت اور کلیدی کردار ادا کیا۔

پاکستان کی طرح امریکہ میں سیاسی جماعتوں کی ذیلی طلبہ تنظیمیں نہیں ہیں۔ امریکی طلباء نظریاتی طور پر یا تو ڈیموکریٹک پارٹی یا ریپبلکن پارٹی کے ساتھ ہوتے ہیں اور ایک مختصر اقلیت ان دونوں میں سے کسی بھی پارٹی کے ساتھ نہیں ہوتی اور یہ اقلیت الیکشن والے دن فیصلہ کرتی ہے کہ آیا وہ کسی امیدوار کو ووٹ ڈالیں گے یا کسی کو بھی نہیں۔

امریکہ میں زیادہ تر پرائیویٹ یونیورسٹیز اور کالجز ہیں اور ہر ریاست کی اپنی یونیورسٹیز بھی ہیں اور ان کے طلباء کے درمیان کوئی منظم باہمی سیاسی یا نظریاتی رابطہ نہیں ہے۔ جبکہ پاکستان کی طلباء تنظیموں میں ایک طویل عرصے تک مضبوط اور منظم نظریاتی رابطہ رہتا تھا اور سیاسی پارٹیوں کے لئے طلباء تنظیموں نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ پاکستان کی طلباء تنظیموں میں رابطے ابھی بھی ہیں تاہم اب ان کے مقاصد بدل گئے ہیں۔ پہلے طلباء تنظیمیں نظریاتی طور پر بہت کام کرتی تھیں۔ لیکن اب پاکستان کی سیاسی و مذہبی پارٹیوں میں نظریات کی نہیں شخصیات کی اہمیت ہوتی ہے۔

امریکی طالبعلموں کی زیادہ تر تحریکیں ہر ریاست میں مقامی مقاصد کے لیے ہوتی ہیں۔ تاہم وقت کے بدلنے کے ساتھ اور سوشل میڈیا کی ترقی نے ان تمام تعلیمی اداروں کے طلباء کو ایک دوسرے کے ساتھ بڑی حد تک ایک رابطے میں کر دیا ہے جس کی وجہ سے مشترکہ مفادات پر یا کسی ایسے نکتے پر جہاں اکثریت کی رائے ایک ہو طلباء ایک پلیٹ فارم پر آجاتے ہیں جس کا عملی مظاہرہ پچھلے چند مہینوں میں غزہ اور اسرائیل تنازع میں امریکہ بھر کی یونیورسٹی اور کالجز میں مظاہروں کی شکل میں نظر آیا۔ اور ان مظاہروں کی قیادت امریکہ کی معروف یونیورسٹیوں کولمبیا اور برکلے کے طلبہ کر رہے ہیں۔

عام طور پر امریکی یونیورسٹیوں کے طلباء اپنے شہر یا ریاست میں وقوع پذیر ہونے والے مقامی معاملات اور مسائل کے بارے میں آگاہ بھی ہوتے ہیں اور مشترکہ حکمت عملی اختیار کر کے ارباب اختیار پر دباؤ ڈال کر، مذاکرات کے ذریعے اور رائے عامہ کو ہموار کر کے جمہوری طریقے سے اور جمہوری اداروں کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔لیکن متعدد بار اس طرح سے ہوا ہے کہ قومی یا بین الاقوامی معاملات پر امریکہ بھر کی تمام یونیورسٹیز کے طلباء ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو گئے اور امریکی انتظامیہ پر دباؤ ڈالا جسکے نتیجے میں جلد یا بدیر امریکی انتظامیہ کو اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنا پڑی۔

امریکی طلباء میں سے جو سیاست میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ اپنے زمانہ طالبعلمی میں اپنے علاقے کے کانگریس مین یا سینیٹر کے دفاتر میں

امریکی ایوانوں میں بھی طلبہ جدوجہد کی بازگشت

والنٹیئر کے طور پہ کام کرتے ہیں جہاں انہیں سیاسی معاملات سے آگاہی ہوتی ہے اور انہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سیاسی معاملات کو کس طرح سے بحث مباحثے کے بعد حل کیا جاتا ہے۔تعلیم سے فارغ ہو کر وہ مقامی انتخابات میں حصہ لیتے ہیں اور پھر مقامی سیاست میں کامیابی کے بعد وہ ریاستی انتخابات میں حصہ لیتے ہیں اور پھر قومی انتخابات میں۔اس طرح ان کی سیاسی بلوغت بڑھتی ہے اور وہ مقامی اور قومی مسائل پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔

حالیہ غزہ اسرائیل معاملے پر طلباء کے امریکہ بھر میں مشترکہ ردعمل نے طلباء کو ایک بار پھر ایک پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور

امریکی رائے عامہ مسئلہ فلسطین پر ایک مثبت رائے تو رکھ ہی رہی ہے لیکن آج امریکی ایوانوں میں بھی اس کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔

تاریخ میں امریکہ کے طلباء نئے متعدد تحریکیں چلائیں جن میں پہلی مزاحمت 1766ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کی بغاوت مکھن کے نام سے طلباء نے خراب کھانے کی فراہمی پر کی۔ ایک مہینے کی ہنگامہ خیزی کے بعد ریاستی گورنر کی مداخلت پر یہ مسئلہ حل ہوا۔

پہلی جنگ عظیم کے پانچ سال کے بعد سینڈیاگو یونیورسٹی کیلیفورنیا کے طالب علموں نے اپنے نومنتخب بورڈ پر عدم اعتماد کا اظہار کیا اور اپنی تعلیم گاہ کو بند کرادیا بالآخر انتظامیہ سمیت بارہ اساتذہ کے استعفے کے بعد مسئلہ طلباء کی خواہش کے مطابق حل ہوا۔

نیویارک سٹی کے بیس ہزار طالب علموں نے 1950 میں میئر کے آفس کا گھیراؤ کر کے اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کرایا۔

1954 میں امریکی سپریم کورٹ کے اسکولوں میں نسلی تعصب کو غیر قانونی قرار دینے کے بعد 1955 میں مارٹن لوتھر کنگ کی قیادت میں مظاہروں کے بعد الابامہ میں شہری بسوں میں نسلی تعصب کو ختم کیا گیا۔ طالب علموں نے اس میں بھی بھرپور حصہ لیا۔

تاریخی طور پر امریکہ میں شہری آزادیوں یعنی Civil Rights

شہری آزادیوں کے لیے امریکی طلبہ کا مثالی کردار

کے لئے طلباء نے نہایت اہم کردار ادا کیا امریکی شہری وفاقی اور ریاستی آئین کے تحت آزادیں تحریر اور تقریر کے لئے، پریس کی آزادی، انجمن سازی، ووٹ کا حق، مذہب اور دیگر تمام حقوق کے معاملات میں جہاں حکومت کو بھی بیجا مداخلت کی آزادی نہیں، عدالتی معاملات میں انصاف کی فراہمی کی یقین دھانی وغیرہ۔ اور امریکی سپریم کورٹ ان شہری حقوق کا بڑے پیمانے پر تعین کرتی ہے۔

بنیادی شہری حقوق کی تحریک سیاہ فام اقلیت تو طویل عرصے سے چلا رہی تھی لیکن 1960 کے بعد اس میں کافی سرگرمی آئی۔ 1960 میں نارتھ کیرولائنا کی یونیورسٹی میں چار سیاہ فام طالبعلم سفید فام طلبہ کے لنچ کاؤنٹر پر جا کر بیٹھ گئے ان طلباء کی اس حرکت پر ان کے خلاف تادیبی کاروائی کی گئی جس کے بعد مظاہرے دوسری ریاستوں میں پھیل گئے سیاہ فام طالب علموں کے ساتھ متعدد سفید فام طالب علموں نے بھی نسلی امتیاز کے خلاف پرزور آواز اٹھائی۔ مختلف ریاستوں میں سیاہ فام طالب علموں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا ان پر مختلف اقدامات پر مقدمے بنائے گئے مارٹن لوتھر کنگ کو بھی گرفتار کرلیا گیا لیکن اس کے نتیجے میں امریکہ بھر میں عوامی حقوق کے لیے ایک بڑی مہم شروع ہوگئی۔ اگرچہ شہری حقوق کی طویل تحریک کے بعد امریکی شہریوں کو بنیادی شہری حقوق تو مل گئے لیکن ہر معاشرے کی طرح اکثر یہاں پر بھی ناانصافی ابھی بھی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن ایسی ناانصافی کے نوٹس ہونے پر سیاہ فام اور سفید فام مل کر آواز اٹھاتے ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں خاص طور پر پولیس کے تشدد کے خلاف طلباء نے بہت جدوجہد کی ہے۔ مارٹن لوتھر کنگ کی شہری حقوق کی تحریک کے بعد اگرچہ تمام امریکی شہریوں کو برابر حقوق دیے گئے لیکن پھر بھی اکثر وبیشتر اس میں ناانصافی ہوتی رہتی ہے۔ اور سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے چار سالہ دور کے بعد سے تو نسلی منافرت کی چنگاریاں جو ایک طویل عرصہ سے دبی ہوئی تھیں وہ دوبارہ بھڑکنے لگی ہیں۔ اور انتہا پسند سفید فارم دوبارہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگے ہیں اور ڈونلڈ ٹرمپ بھی کچھ پیچھے نہیں ہیں۔ امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت 11 ستمبر کے بعد اتنی نہیں پھیلی تھی جتنی ٹرمپ کے چار سالہ دور میں پھیلی۔ لیکن اس کا ایک منفی اثر یہ بھی ہوا کہ جہاں امریکی عوام کی اکثریت کو اسلام کے بارے میں کچھ بھی نہیں پتہ تھا وہ آج اسلام کے بارے میں شاید عام مسلمانوں سے بھی زیادہ جانتے ہیں اور اس میں امریکی خواتین کی اکثریت ہے۔ امریکہ میں تمام تر نفرت انگیزی کے باوجود عام امریکی عوام کی اکثریت آج بھی دیگر مذاہب کا اور اور ان کی عبادت

غزہ کے لیے امریکی طلبہ کی جدوجہد

گاہوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ خاص طور پر درسگاہوں میں اساتذہ اپنے مسلمان طالب علموں سے رمضان کے مہینے میں درخواست کرتے ہیں کہ مسلمان طالب علم اپنی کلاسوں میں اسلام اور رمضان پر تقریر کریں۔ اس کے علاوہ درسگاہوں میں افطار کا بھی انتظام کیا جاتا ہے بلکہ اب تو سرکاری سطح پر بھی ہر ریاست کے گورنر شہر کے میئر اور حتیٰ کہ وائٹ ہاؤس تک میں امریکی صدر کی طرف سے افطار پارٹیوں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور مسلم اکثریتی اسکولوں میں عید اور بکرا عید کی چھٹی بھی دی جاتی ہے۔

ویتنام کی جنگ کے خلاف بھی طلبہ نے بڑی تحریک چلائی۔ شہری حقوق کی تحریک کے زمانے میں ہی امریکہ ویتنام میں جنگ لڑ رہا تھا۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی برکلے کے طلبہ نے تحریر اور تقریر کی آزادی پر ایک مہم شروع کر دی انہوں نے بلا کسی خوف اور یونیورسٹی انتظامیہ کی سینسر شپ کے، طلبا کو سیاسی اظہار رائے کے لئے یونیورسٹی میں یا یونیورسٹی سے باہر سیاسی نظریات پر بحث مباحثے پر آزادی کی بات کی اور باہر سے سیاسی مقررین کو بلانے پر روک ٹوک کے خلاف آواز بھی اٹھائی۔ اب امریکی جامعات میں طلباء کھل کر ویتنام کی جنگ کی مخالفت کرنے لگے تھے۔ ماریو سیو یونامی ایک طالبعلم نے برکلے یونیورسٹی میں آزادی رائے کی تحریک کے لئے بہت کام کیا۔ یہ تحریک امریکہ کی آزادی کے بعد کی سب سے بڑی تحریک تھی۔ ماریو نے امریکی جامعات میں حق آزادی تقریر کے لئے شائد سب سے زیادہ کام کیا۔

ماریو کے ساتھ شہری حقوق کی تحریک میں ان فوجیوں نے جو ویتنام

ایسے مظاہرے مجموعی طور پر کسی اسلامی ملک میں بھی نہیں ہوئے

کی جنگ لڑ چکے تھے اور جنگ مخالف لابی کے لوگ حقوق نسواں کے علمبردار اور Peace Corps کے ورکرز نے بھی اس تحریک کا ساتھ دیا۔

اس سے قبل بھی مئی سونا یونیورسٹی کے طلباء نے امریکہ کو دوسری جنگ عظیم میں شمولیت سے روکنے کی مشترکہ کوشش کی تھی انہوں نے مردوں کی لازمی فوجی ٹریننگ کے خلاف بھی اوازاٹھائی جسے ان کے انڈر گریجویٹ پروگرام کا حصہ بنا دیا گیا تھا 1934 میں طلبہ نے کلاسوں کا بائیکاٹ شروع کر دیا تھا اور وہ ہر روز ایک گھنٹے تک کلاسوں کا بائیکاٹ کرتے تھے۔ جنگ کے خلاف یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک جاپان نے پرل ہاربر پر 1941 میں حملہ نہ کر دیا۔

30 اپریل 1970 کو امریکی صدر نکسن نے ویتنام میں جنگ کو کمبوڈیا تک پھیلانے کا فیصلہ کیا جس کے خلاف امریکہ بھر کی یونیورسٹی اور کالجز میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ دو مئی کو اوہائیو اسٹیٹ یونیورسٹی کے طلبہ نے فوجی ٹریننگ کی بلڈنگ کو آگ لگا دی۔ چار مئی کو امریکی نیشنل گارڈز نے طلبہ مظاہرین پر فائر کھول دیا جس کے نتیجے میں چار طالب علم ہلاک ہو گئے اور دس زخمی ہو گئے جس کے بعد امریکہ کی ساڑھے چار سو سے زیادہ یونیورسٹی کالجز اور سکولوں کو بند کر دیا گیا امریکہ بھر میں تقریبا 40 لاکھ طلباء نے مظاہروں میں حصہ لیا اور اب تحریک امریکہ کی اس جنگ میں شمولیت کی مخالفت سے بڑھ کر جنگ کے خاتمے کی کوششوں کی طرف چلی گئی اور اس سلسلے میں ہر مہینے کی 15 تاریخ کو عام ہڑتال کی جانے لگی۔ سات مئی کو واشنگٹن یونیورسٹی کے طلباء نے یونیورسٹی کی ایک عمارت پر حملہ کر دیا اور جب پولیس ائی تو انہوں نے نعرے لگائے کہ سور آ رہے ہیں۔ اٹھ مئی تک ملک میں ہونے والے مظاہروں میں 30 سے زیادہ فوجی ٹریننگ کے مراکز پر حملے کیے گئے اور ان کو جلا دیا گیا یا ان پر بم پھینکے گئے 26 سے زیادہ تعلیمی اداروں میں پولیس اور طلبہ کے درمیان پر تشدد تصادم ہوئے اوہائیو یونیورسٹی میں طلبہ نے موت کے خلاف کے نام سے مارچ شروع کیا۔ 1970-1969 کے دو سالوں میں پورے امریکہ میں نو ہزار سے زائد مظاہرے ہوئے جن میں طلباء پیش پیش تھے۔ 84 سے زائد بم پھینکنے اور آتش زنی کے پر تشدد واقعات ہوئے۔ ویتنام کی جنگ کی مخالفت کے خلاف ہونے والے ملک گیر مظاہروں کے بعد امریکہ کو ویتنام کی جنگ سے نکلنا پڑا۔

ویتنام کی جنگ کے خاتمے کے بعد بھی امریکی طلبہ نے مختلف موقعوں

غزہ کے لیے امریکی طلبہ کی جدوجہد

پر امریکی سیاست میں اور معاشرے میں تبدیلیوں کے لیے کلیدی کردار ادا کیا۔ پہلے سیاہ فام امریکی صدر اوباما کے صدر بننے میں امریکی طلباء وطالبات نے اہم کردار ادا کیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد امریکی طلباء وطالبات نے امریکی انتخابات میں بڑی تعداد میں اپنے ووٹ ڈالے۔ ورنہ عام طور پر انتخابات میں ووٹ ڈالنے والوں کا تناسب امریکہ میں بھی بہت کم ہوتا ہے۔ اوباما کے الیکشن کے بعد پچھلے انتخابات میں بھی برنی سینڈرز نے امریکی طلباء وطالبات کو بہت متاثر کیا۔ برنی سینڈرز کے سوشلسٹ نظریات سے متاثر ہو کر ایک بار پھر امریکی طلباء طالبات نے انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن وہ برنی سینڈرز کو امریکہ کا صدر نہ بنا سکے لیکن آج بھی امریکی ایوانوں میں برنی سینڈرز کی آواز سنی جاتی ہے۔

امریکی طلباء اور عوام بنیادی طور پر جنگ کے خلاف ہیں امریکی آئین اور قانون میں ایک طویل جدوجہد کے بعد انسانی حقوق کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ آج امریکی عوام کو جو انسانی اور شہری حقوق حاصل ہیں اس کے پیچھے دو صدیوں کی تاریخ ہے۔ انسانی حقوق کا احترام

امریکی نوجوان نسلی۔ یا مذہبی منافرت سے بالاتر۔ فلسطینیوں کے ساتھ

امریکی عوام کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے اس لیے وہ اپنے ملک میں انسانی حقوق کے علاوہ جانوروں کے حقوق تک کا خیال رکھتے ہیں۔

امریکی معاشرے کا ڈھانچہ اس طرح سے بنا ہوا ہے کہ انٹرٹینمنٹ اور اسپورٹس کی دنیا میں گم امریکی عوام کو امریکہ سے باہر کی دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن امریکی سیاست دانوں کو امریکہ سے باہر کی دنیا کا مکمل پتہ تھا کیونکہ اسی میں امریکی مفادت کا تحفظ تھا اور امریکی سیاستدان چاہتے بھی نہیں ہیں کہ عوام کو باہر کی دنیا کا پتہ چلے کیونکہ جب امریکی مفادات کا معاملہ آتا ہے تو امریکی انتظامیہ انسانی حقوق سے صرف نظر کرتی ہے جیسا کہ وہ کئی دہائیوں سے کشمیر اور فلسطین میں ہونے مظالم پر خاموش رہی ہے۔ لیکن پچھلی چند دہائیوں میں سوشل میڈیا کی ترقی نے امریکی عوام کو باہر کی دنیا سے بڑی حد تک روشناس کرایا ہے۔ اس لئے ایک طویل عرصے کی خاموشی کے بعد پچھلے سال اکتوبر سے جاری اسرائیل کی غزہ میں بربریت نے امریکی عوام اور بالخصوص امریکی طلباء کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور اس سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے میں امریکی طلباء نے ایک بار پھر کلیدی اور تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ سوشل میڈیا کے واٹس ایپ اور فیس بک کے پلیٹ فارم سے امریکی طلبہ نے امریکی عوام کو اسرائیل کی صحیح تصویر دکھا دی ہے اور ان امریکی طلباء کی معاونت امریکی مسلمان طلبہ کر رہے ہیں جو امریکہ میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک، جارج واشنگٹن یونیورسٹی اور برکلے سمیت امریکہ کے طول وعرض میں بیشتر تعلیمی اداروں میں نہ صرف تعلیمی نظام درہم برہم ہو گیا بلکہ متعدد تعلیمی اداروں کو اپنی سالانہ گریجویشن کی تقریبات کو ملتوی کرنا پڑ گیا۔ طلباء کی ایک بڑی تعداد نے اپنی تعلیم کو اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا ہے ان کے نزدیک فلسطین میں انسانی حقوق کی پامالی پر آواز اٹھانا ان کے تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ اہم ذمہ داری ہے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک دفعہ جب جنرل حمید گل امریکہ آئے تو ایک تقریب میں انہوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ امریکی آئین میں جو انسانی حقوق کی یقین دہانی کرائی گئی ہے وہ تمام وہ حقوق ہیں جن کی یقین دہانی اسلام

میں کرائی گئی ہے۔ ایک بار ڈاکٹر اسرار احمد جب امریکہ آئے تو انہوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اب اسلام کی تحریکیں امریکہ اور یورپ سے اٹھیں گی۔ شائد ان دونوں کی کہی ہوئی باتیں درست ثابت ہوئی ہیں۔

آج ہارورڈ سے جارج واشنگٹن یونیورسٹی اور برکلے تک فلسطین کی آزادی کے لئے جتنے نعرے امریکی طلباء اور عوام نے لگائے ہیں اور مظاہرے کئے ہیں اتنے نعرے اور مظاہرے مجموعی طور تمام اسلامی ممالک میں بھی شائد نہیں ہوئے تاریخ کے پچھلے تمام مظاہروں اور تحریکوں کے بعد آج امریکہ ملک گیر فلسطین کی آزادی کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیز اور کالجز نے اسرائیلی بربریت کو امریکی عوام کے سامنے بے نقاب کر کے رائے عامہ کو فلسطین کی آزادی کے لئے بڑی حد تک ہموار کر دیا ہے۔ اس تحریک میں گورے کالے اور امریکہ میں پیدا ہونے والے تارکین وطن طلباء کا بڑا اہم کردار ہے لیکن ان میں اکثریت امریکی طلباء ہی کی ہے۔ ان طلباء میں سابق امریکی صدر روزویلٹ کا پڑپوتا کوئنٹن روزویلٹ بھی پیش پیش ہے اس کے علاوہ ایڈن پاریکی، نورا فایاد، ایمیلیا فلر، فرعینڈ و بوبس، جیسی پیپس، جیمس کارلسن اور مریم اقبال بھی نمایاں ہیں۔ مسلمان طالبات نے خاص طور پر اپنی پر امن شعلہ بیانی سے امریکی طلباء اور عوام کو فلسطین کی صورتحال سے آگاہ کیا۔ سوشل میڈیا پر اسرائیلی بربریت کو امریکی عوام کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ آج امریکی عوام کی اکثریت اپنے ٹیکس کے ڈالروں سے امریکہ کی اسرائیل کے لئے اربوں ڈالر کی سالانہ امداد کیخلاف ہو گئ ہے۔ امریکہ میں ہونے والے طلبہ کے مظاہروں سے متاثر ہو کر اب یہ تحریک یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی پھیل گئی ہے۔

دنیا میں طلباء اپنی زمانہ طالبعلمی میں اپنے نظریات سے مکمل وفاداری کرتے ہیں اور آج امریکی طلباء اور عوام نسلی بنیاد پر یا مذہبی منافرت سے بالاتر ہو کر فلسطینی عوام کے شانہ باشانہ کھڑے ہو گئے ہیں لیکن افسوس کہ اسلامی ممالک سکون سے خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں! ❁

ایک فلسطینی اسسٹنٹ پروفیسر کی لافانی تحریر

فلسطین پر اسرائیلی بربریت آج کا ہولوکاسٹ ہے۔ ملت اسلامیہ کی بے حسی کا مظہر۔ سوشل میڈیا پر ایک مضمون پر نظر پڑی۔ سجی صوافطہ امریکی یونیورسٹی آف میامی میں جدید زبانوں اور ادب کے شعبے میں عربی کی اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ بہت ہی درد میں ڈوبا ہوا۔ فلسطین زمین کی طرح فلسطینی سمندر میں غلام ہے۔ اس تحریر کی ایک اک سطر میں آزادی کی خواہشیں تڑپ رہی ہیں۔ ہم نے اسے آپ کے لیے انگریزی سے اُردو میں منتقل کروایا ہے۔ سید عرفان علی یوسف نے بڑی محبت سے اسے اُردو میں منتقل کیا ہے۔

فلسطین کی زمین کی طرح اس کا سمندر بھی غلام ہے

تحریر: سجی صوافطہ

پہلی بار جب میں بحیرہ روم کے ساحل پر پہنچی تو میری عمر بیس سال تھی۔ اسکندریہ مصر میں اگست کے اوائل کا وقت تھا۔ چند روز قبل محمود درویش امریکا میں دل کی ناکام سرجری کے باعث انتقال کر گئے تھے۔ میں قاہرہ میں تھی جب مجھے ان کی موت کی خبر ملی تو اپنے اہل خانہ کے ساتھ کھانے پر بیٹھی تھی۔ بھوک میری کمزوری ہے۔ مجھے اس دن کی شدید بھوک کا احساس واضح طور پر یاد ہے۔ میں چڑچڑی ہو رہی تھی۔ مجھے کھانے کی ضرورت تھی اس سے پہلے کہ میں غصہ کھا جاؤں۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ میرا موڈ خراب ہے۔ کچھ دیر بعد جب ہم ریسٹورنٹ گئے اور کھانے کا آرڈر دیا تو میرے والد نے میری طرف دیکھا۔ چند لمحوں تک وہ مجھ پر نظریں جمائے رہے۔ وہ ایک خبر مجھ کو دینا چاہتے تھے کیونکہ ان کی اکلوتی بیٹی عربی ادب کی طالبہ تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ "محمود درویش کا آج انتقال ہو گیا ہے۔"

یہ خبر سن کر میرے ہوش و حواس گم ہو گئے میں بے حس و حرکت بیٹھی رہ گئی۔ میرے والد مجھے یہ بتاتے رہتے تھے کہ عرب دنیا کے ایک اور عظیم ادیب کا انتقال ہو گیا ہے، گویا وہ سمجھتے تھے کہ اگرچہ میں چھوٹی تھی، لیکن تمام عرب ادیبوں سے واقف ہوں گی اور فوراً سمجھ جاؤں گی۔ انہوں نے 2003 میں ایڈورڈ سعید اور فدوی طوقان کی موت کی خبر بھی مجھے دی تھی، لیکن محمود درویش کی موت نا صرف ان کے بلکہ میرے لیے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ یہ تقریباً ایسا ہی تھا جیسے ہم جانتے ہیں کہ یہ عرب دنیا میں ایک خوفناک تبدیلی تھی۔ ہم خود جانتے ہیں کہ واپسی کی خواہش کے باوجود محمود درویش اب واپس نہیں آسکتے۔ جب بھی ان کا خیال آتا ہے درد کی ایک لہر دل سے اٹھ کر پورے جسم میں پھیل جاتی ہے۔

میں بحیرہ روم کی آب و ہوا کے بارے میں جاننا چاہتی تھی کیونکہ فلسطینی

> **اسرائیلیوں نے فلسطینیوں کی رسائی بحیرہ روم تک بند کر دی تھی**

ہونے کے تعلق سے میں بحر روم کو اپنا سمندر تصور کرتی تھی حالانکہ اسرائیل نے ناکہ بندی کر کے فلسطینیوں کی اکثریت کی بحر روم تک رسائی کو مکمل طور پر بند کر دیا تھا۔ ہم قاہرہ سے ایک دن کی سیر کے لیے اسکندریہ روانہ ہوئے جو بحر روم کے ساحل پر بڑی بندرگاہ ہے تو ماحول ہلکا پھلکا، اور زیادہ پرسکون محسوس ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اپنے خاندان کے ساتھ ساحل سمندر پر ننگے پاؤں چل رہی تھی تو مجھے بے پایاں خوشی محسوس ہوئی۔ مغربی کنارے کی شناختی کارڈ کی حامل ایک فلسطینی کے طور پر، میرے وطن میں اس سادہ عمل کا تجربہ کرنے کی میری صلاحیت کے خلاف کئی عوامل کام کر رہے تھے۔ پہلا یہ تھا کہ میں پہلی انتفادہ کے دوران پیدا ہوئی تھی اور اوسلو معاہدے اور دوسرے انتفادہ کے نتیجے میں اس وقت پلی بڑھی جب نسل پرستی ناقابل بیان درجہ تک پہنچ گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں فوجی اجازت کے بغیر مغربی کنارے سے باہر جانے کے قابل نہیں تھی۔ یہ اجازت نامہ حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا اور یہ اجازت غیر معمولی صورتوں میں عارضی طور پر دی جاتی تھی۔ نام نہاد مغربی کنارے کی حدود میں واپسی رات ہونے سے پہلے ضروری تھی۔ اسرائیلی سمجھتے تھے کہ غلاموں کو ایک حد میں رکھنے کے لیے یہ سلوک ضروری ہے۔

جب میں بحیرہ روم کے مصری ساحلوں پر پہنچی تو فلسطین کے جزولاینفک

یعنی بحیرہ روم کے دورے کے اس لمحے کو میری جینیاتی یادداشت نے اور زیادہ اہم بنا دیا۔ میں جیسے ہی میں پانی کے کنارے پہنچی، میرے اعضا سن ہو کر رہ گئے۔ میں اتنی سخت جذباتی کیفیت میں تھی کہ اپنے جسم کو اس سمندر میں بھگونے سے قاصر تھی جس کا ایک کنارہ مقبوضہ فلسطین تھا اور دوسرے کنارے پر میں کھڑی تھی۔ وفورِ جذبات میں میں نے پھر محمود درویش کے بارے میں سوچا جنہوں نے فلسطین کے پس منظر میں بے شمار کہانیاں لکھی تھیں۔ میں بحیرہ روم کو اپنے وطن کا سمندر تصور کرتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ دن کبھی آئے گا یا نہیں اور میں جانتی تھی کہ شاید وہ دن جلدی نہیں آئے گا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ مجھے بہت انتظار کرنا ہے اور خاص طور پر یافاJaffa کا انتظار کرنا ہے جو بحیرہ روم کے ساحل پر قدیم فلسطینی بندرگاہ تھی لیکن اب شمالی اسرائیل میں ہے۔

ایک سال بعد میں نے اپنے آپ کو بارسلونا میں پایا، میں ڈبلیو ہوٹل کے قریب ساحل سمندر پر ایک دوست کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی جس کا خاندان ناصرہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اسکندریہ میں جو تڑپ اور تکلیف میں نے محسوس کی تھی وہی احساس ایک بار پھر مجھ پر غالب آ گیا۔ اسرائیل کی ایک فلسطینی شہری کے طور پر 1948 کی فلسطینی، میری دوست کئی

مغربی کنارے سے باہر جانے کے لیے اجازت نامہ لینا پڑتا ہے

بار حیفہ اور یافا گئی تھی۔ فلسطین کے بارے میں اس کی بصیرت اور تجربہ مجھ سے بہت مختلف تھا۔ میں نے اپنی لغت میں فلسطین پر اسرائیل کے قبضے کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ فلسطین یا اسرائیل، 1948 یا 1967، اور مغربی کنارہ ان سب کا مطلب ایک ہی تھا یعنی ہمارا گھر۔

میں نے ساحل سے کئی فٹ دور سمندر پر ایک نظر ڈالی اور اپنی دوست کو اپنے اعضا سن ہونے کے بارے میں بتایا۔ سمندر دیکھ کر میرے اعضا کا سن ہونا ایک جسمانی ردعمل تھا جس کا سبب فلسطین کے سمندر سے محبت تھی۔ کیونکہ فلسطین کی زمین کی طرح اس کا سمندر بھی غلام تھا۔ میں نے اپنی دوست سے کہا کہ میں پانی میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ میں مقبوضہ فلسطین کی طرح اس سمندر کو بھی مقبوضہ سمجھتی تھی۔ اس کی آزادی کا مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔ میری دوست نے الجھ کر میری طرف دیکھا۔ وہ میرے جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اپنے آپ کو اس تجربے سے محروم رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے غلامی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ میرا ردعمل غلامی سے انحراف کا تھا۔ میں نے اپنی دوست کو دیکھا کہ جب وہ اپنی ٹانگوں سے ریت جھاڑ رہی تھی اور پانی کی طرف دوڑتے ہوئے یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اسے حالات کی کوئی پروا نہیں۔ میں نے اسے سمندر میں تیرتے ہوئے دیکھا۔ وہ سطح کے اوپر منٹوں تک آزادانہ طور پر تیرتی رہی۔ میں اسے کیسے سمجھاتی کہ نوآبادیاتی تشدد نے مجھ میں یہ انحراف پیدا کیا تھا۔ میں کیسے سمجھاتی کہ میرے غم نے تیرا کی سیکھنا میرے لیے ناممکن بنا دیا، حالانکہ میں نے دو بار کوشش کی تھی۔ میرا سمندر سے خوف علاقائی بیگانگی اور جبری ہجرت سے منسلک تھا۔

میں دیر تک ریت ہی پر پڑی رہی جب میں نے ساحل پر لہروں کی

محمود درویش کے انتقال کی خبر نے میرے حواس گم کر دیے

طرف دیکھا تو مجھے ایک بار پھر محمود درویش یاد آیا کہ اس نے Memory for Forget fulness میں کیا لکھا تھا؟

''جو سمندر کو دیکھتا ہے وہ سمندر کو نہیں جانتا۔ جو ساحل پر بیٹھتا ہے وہ سمندر کو نہیں جانتا۔ اور جو صرف دیکھنے کے لیے آتا ہے وہ تو سمندر کو بالکل ہی نہیں جانتا۔ سمندر کو صرف غوطہ لگانے والا ہی جانتا ہے۔''

لیکن میں غوطہ نہیں لگا سکی۔ میں اپنی انگلیوں کو بھی نہیں ڈبو سکی۔ میں صرف ایک ہی امکان کے بارے میں سوچ سکتی تھی، مجھے انتظار کرنا تھا، امتحانہ انتظار، اگر وہم نہیں، تو اس امید کے ساتھ کہ ایک دن میں اور بافا شہر گلے ملیں گے۔

نکبہ کے آغاز کے بعد سے ایک چیز جس کے فلسطینی عادی ہو چکے ہیں وہ ہے انتظار کا عمل۔ انتظار کرنے کی صلاحیت، اور یہ یقین کہ ہمارا وقت گزرنے کا احساس، اگرچہ سفاکانہ اور ناقابل معافی ہے، لیکن آخر کار آزادی کی طرف ایک ضروری اور زبردست پیش رفت کا باعث بنے گا۔ اس بارے میں میرے تصور اور زندگی کے تجربات کی ابھی تک ان دو صورتوں میں تصدیق ہوئی ہے جب مجھے مغربی کنارے سے باہر جانے کے لیے تصریح، یا اجازت نامہ دیا گیا۔ مقبوضہ بیت المقدس کا دورہ کرنا بعض اوقات آسان ہوتا ہے، خاص طور پر رمضان کے دوران، جب اسرائیلی فوج لڑکیوں، عورتوں، چھوٹے بچوں اور بوڑھوں کو جمعہ کے دن مسجد اقصیٰ کے احاطے میں جانے کی اجازت دیتی ہے۔ ورنہ اکثر فلسطینیوں پر پابندیاں ہی رہتی ہیں لیکن یافا اور حیفہ کے ساحلی شہر میرے لیے زیادہ تر ناممکن رسائی کے دائرے میں رہے ہیں۔

2010 میں، بارسلونا میں موسم گرما کا ایک سال اور اسکندریہ میں اگست کے دو سال گزرے۔ اس کے بعد میں رام اللہ میں اپنے دفتر میں کرسی پر اپنی سانسیں روکے ہوئے بیٹھی تھی۔ میں انتظار کرتی

پرانا قبرستان۔ جہاں فلسطینی لاشیں۔ فلسطینی ڈھانچوں میں تبدیل ہوئیں

رہی، اور انتظار کرتے کرتے میں منجمد ہو گئی۔ پھر میری دور کی ایک کزن کے شوہر نے ایک اسرائیلی افسر کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ اجازت نامے کے لیے میری درخواست کو دیکھیں، میرے اچھے کردار کی ضمانت دیں، اور یہ یقین دہانی حاصل کی کہ اگر اجازت مل گئی تو اسرائیل میں داخل ہونے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے فون بند کر دیا اور مجھے بتایا کہ ''اچھی خبر یہ ہے کہ اجازت نامہ منظور ہو گیا ہے۔ بری خبر یہ ہے کہ آپ کے پاس صرف بارہ گھنٹے ہیں اور آپ کو رات گیارہ بجے سے پہلے واپس آنا ہوگا۔

"یافا کا سمندر بس یہی کرتا ہے، وہ چیزیں واپس پھینک دیتا ہے، "ایک مقامی رہائشی نے مجھے بتایا۔ "یہ ہر چیز انہیں واپس دیتا ہے۔"

اگلے دن، میں اور میرا خاندان صبح 5 بجے بیدار ہوا اور ہم مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے کے لیے مقبوضہ بیت المقدس روانہ ہوئے۔ رش میں، ہم نے مقدس شہر میں نمازیں پڑھتے ہوئے کچھ وقت گزارا لیکن ہم مکمل طور پر اس سے لطف اندوز ہونے کے قابل نہیں تھے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت، ہم حیفہ پہنچ گئے اور سمندر کی نیلگوں چادر میں ڈوبے ہوئے ایک ریستوران کی چھت پر بیٹھ گئے۔ ہمارے چاروں طرف سمندر کے رنگ کے لیے نیلے، ہرے پتھر اور ہر ستون کو لپیٹے ہوئے اداسی کا احساس لیے محراب پھیلے ہوئے تھے۔

برسوں بعد، پی ایچ ڈی کی طالبہ کے طور پر آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک لیکچر ہال میں بیٹھے ہوئے، میں نے ایلان پاپے کو اپریل 1948 میں حیفہ کی فلسطینی آبادی پر تشدد کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے سنا۔

میں نے پتھروں کے ٹکڑے اکٹھے کیے ان میں سے ہر پتھر میرے لیے فلسطین تھا

تقریباً پچاس ہزار فلسطینیوں کو یافا سے جبری طور پر بے دخل کر دیا گیا تھا۔ صیہونی نیم فوجی ملیشیا نے ان کو گھروں سے نکال دیا تھا۔ پھر ان کے گھروں کو مسمار کر دیا گیا تھا۔ میں نے اُس دن دوپہر کے کھانے میں محسوس ہونے والی صیہونی خباثت کو کچھ سمجھا۔ حیفہ میں کسی بھی دن دوپہر کا کھانا کھائیں۔ ایک ایک لقمے میں اس کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس ان چند ہزار فلسطینی حیفائیوں کو بھی ہوتا ہوگا جو شہر کے ایک یا دو تنہا محلوں میں باقی رہ گئے جو یہودی بستیوں سے گھرے ہوئے تھے اور نئی یہودی ریاست کی حقیقت کے مکمل عکاس تھے۔

دوپہر کے کھانے اور حیفہ کے بہائی گارڈنز کی سیر کے بعد، ہمارے ڈرائیور نے ہمیں بتایا کہ اگر ہم اپنا باقی وقت یافا میں گزارنا چاہتے ہیں، تو ہمیں واپس جا کر پھر واپس آنا ہوگا۔ ہمیں غروب آفتاب سے چند گھنٹے پہلے معلوم ہوا اور ہمیں اس لمحے کی مکمل جذباتی کشش سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ مجھے ایک بار پھر محمود درویش کا خیال آیا۔ انہوں نے لکھا تھا:

''غوطہ لگانے والا ہی سمندر کو جانتا ہے۔ وہ ڈوبنے کا خطرہ مول لیتا ہے۔ وہ سمندر میں سمندر کو بھول جاتا ہے۔ وہ نامعلوم میں گم ہو جاتا ہے، جیسا کہ عشق میں ہوتا ہے۔ گیلے پن کو پانی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔''

اب اپنے سن اعضا میں خون دوڑانے کی کوئی دوسری صورت نہیں تھی۔ میں نے سمندر کی طرف دیکھا جس سے مجھے بے پناہ محبت تھی۔ میں

سمندر میں بے حجابانہ اتر گئی۔ میں نے نمکین پانی میں اپنے لباس کو بھگونا شروع کر دیا اور آگے بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ پانی میرے سینے تک پہنچ گیا۔ میں پانی میں کھڑی رہی اور لہریں مجھے آگے پیچھے ہلانے لگیں کہ میرے قدم اکھڑ جائیں۔ پھر میں نے سمندری خول، سیپیاں، کٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے جو پانی میں اتنے لمبے عرصے سے تھے کہ ان کے کنارے نرم ہو گئے تھے، اور ٹوٹے ہوئے ٹائل اور پتھروں کے ٹکڑے اکٹھے کیے۔ ان میں سے ہر پتھر میرے لیے فلسطین تھا۔ میں کبھی بھی ایسے ساحل پر نہیں گئی تھی جس پر اس قسم کے خزانے موجود ہوں۔ میرے پاس ایسے الفاظ نہیں جو میرے ان جذبات کو بیان کر سکیں جو میں نے اس دن محسوس کیے۔

کچھ عرصے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ جب صیہونی ملیشیا نے 1948 کے موسم بہار میں اس علاقے کو فلسطینیوں سے نسلی طور پر صاف کرنے کے فوراً بعد دسیوں ہزاروں یہودیوں کو یافا میں آباد کیا، تو فلسطینیوں کے ہزاروں گھروں کا ملبہ اور باقیات سمندر میں پھینک دیں۔ لیکن بحیرہ روم نے بھی جوابی تشدد کا مظاہرہ کیا اور سمندر نے انہیں دھو کر واپس ساحل پر پہنچا دیا۔ دنیا کے عجائب گھروں میں ان کو باعزت مقام ملنا چاہیے تھا۔ ان کی قدردانی دنیا نے نہیں سمندر نے کی۔ فلسطینی

غزہ۔ فلسطینی زمین کا
آخری باقی ماندہ ٹکڑا

اکثر یافا کے سمندر کی اس خوفناک لیکن شاندار خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ شہر، اس کی زمین اور اس کا پانی، سب اپنی وہ کہانی سناتے ہیں کہ وہاں کیا ہوا؟ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ایسی ہی ایک کہانی یافا کے ایک رہائشی نے مجھ کو سنائی، جو فلسطینیوں میں گردش کر رہی ہے۔ وہاں ایک پرانا فلسطینی قبرستان تھا جو 1948 سے پہلے کا تھا۔ اسے ریاست کی طرف سے معمول کے مطابق نظر انداز کیا جاتا تھا۔ نا صرف یہ کہ اس کی یاد منائی جاتی تھی بلکہ اس میں دفن لاشوں کی وجہ سے بھی اس کی یاد آتی تھی۔ اس کی زمین میں فلسطینی لاشیں تھیں جو وقت کے ساتھ ساتھ فلسطینی ڈھانچوں میں تبدیل ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ اونچی سمندری لہروں سے قبریں مزید خراب ہونے لگیں۔ مرنے والوں کی اولادوں کو خدشہ تھا کہ ان کے پیارے سمندر میں بہہ جائیں گے۔ صیہونی ریاست کو خدشہ تھا کہ وہی باقیات بحیرہ روم کے پانیوں میں دھل کر ساحل پر واپس آئیں گی۔ دن کی روشنی میں ریت پر دھوپ تاپنے والے سیاح بھاگنا شروع ہو جائیں گے۔ سمندر بھی آزادی کی جنگ لڑنے والے فلسطینیوں پر تشدد کی وحشیانہ حرکتوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ یافا کا سمندر بس یہی کرتا ہے، وہ چیزیں واپس کر دیتا ہے۔

میں نے بارہ سال بعد، 2022 کے موسم گرما میں صرف ایک بار ایسا ہی ایک دن کا تجربہ کیا۔ مجھے یافا جانے کے لیے دوسرا پراسرار اجازت نامہ دیا گیا۔ یہ اس بار تین دن کے لیے، لیکن کرفیو کے ساتھ تھا۔ رات کو قیام کی اجازت نہیں تھی؛ مجھے مغربی کنارے پر واپس جانا پڑتا اور ہر رات وہاں سونا پڑتا۔ پھر میں واپس آتی۔

مجھے امید تھی کہ دوسرا سفر پہلے جیسا ہوگا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں اب مختلف تھی، تیس سال کی درمیانی عمر کی ایک خاتون جس نے کبھی بھی بحیرہ روم کے زیادہ سے زیادہ ممالک کا دورہ کرنے کا موقع نہیں گنوایا،

جنوبی اسرائیل میں تباہ ہونے والے
گھروں کی چابیاں ان کے پاس ہیں

تاکہ میں علاقائی سست روی کی لذت کا تجربہ کر سکوں۔ میں لبنان، مصر، اسپین، اٹلی، تیونس اور مراکش میں بھی اس تجربے سے گزری۔ کافی موازنہ کرنے کے باوجود، میں نے کبھی بھی ایسا محسوس نہیں کیا جیسا کہ یافا میں محسوس ہوا۔ میں اس شہر میں اس طرح محسوس کرتی تھی کہ جیسے مسلسل دعا کی حالت میں ہوں۔ مجھے افسوس ہوا کہ مجھے اپنے پردادا کا تجربہ نہیں تھا، جو نکبہ کے وقت ترپن سال کے تھے اور اس سرزمین کو شمال سے جنوب تک، دریائے اردن کے مغربی کنارے سے لے کر بحیرہ روم کے ساحل تک اچھی طرح جانتے تھے۔ بحیرہ روم کے اس ساحلی شہر کو میں کبھی اس طرح نہیں جانتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مقامی لوگ کھانے کے لیے کہاں جاتے ہیں؟ کیوں کہ میں اپنی کافی ایسے باورچی خانے میں نہیں بنا سکتی تھی جس کی کھڑکی سے سمندر نظر آتا تھا اور زیادہ قیمت والی کافی 'لٹی' پورٹ سائیڈ کیفے پر بارہ سال میں ایک بار خریدنی پڑتی تھی۔ سب سے بڑھ کر مجھے یہ صدمہ ہوا کہ میرے اردگرد کسی نے بھی فلسطینی ہونے کے ناطے میرا اس دکھ کو محسوس کرنے کا حق تسلیم نہیں کیا۔ مجھے اور میرے خاندان کے افراد کا اس سرزمین پر نقل و حرکت کا وہ حق سلب کر لیا گیا تھا جو اگر ہزار سال نہیں تو کم از کم آٹھ یا نو صدیاں پہلے سے ہمیں حاصل تھا۔ ستم ظریفی اس حقیقت سے اور زیادہ مضحکہ خیز بنا دی گئی کہ میرے پاس دیگر زمینوں کے آباؤ اجداد کا کوئی ریکارڈ نہیں حالانکہ وہ سب فلسطینی تھے، بھی فلسطین سے تھے۔

فلسطینی سفید فاسفورس کی آگ کو بھڑکانے کے لیے ریت کا استعمال کرتے ہیں، جسے پانی سے بجھایا نہیں جا سکتا۔

آج، جب میں یافا کے بارے میں سوچتی ہوں، تو میرے ذہن میں صرف ایک چیز آتی ہے کہ اس شہر کے وہ باشندے جو قبرص اور لبنان کی طرف عارضی کشتیوں پر یا موت کے راستے مشرق کی طرف کوچ نہیں کرتے تھے وہ یا تو سمندر میں ڈوب گئے یا انہیں مجبوراً جنوب کی طرف غزہ شہر میں پناہ لینے پر مجبور کیا گیا جو بعد میں غزہ کی پٹی کی دیواروں والے انکلیو کا حصہ بن گیا۔ تقریباً ہر فلسطینی جس سے میں غزہ میں ملی ہوں وہ اصل میں یافا یا المجد عسقلان شہر کا پناہ گزین رہ چکا ہے۔ 1948 میں اسرائیل کے قیام کے بعد یافا (Jaffa) کا نام عسقلان رکھا گیا۔ غزہ کی مادی حقیقت اپنی جگہ ہے۔ غزہ کے بہت سے لوگ یافوی اور مجدلاوی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس اب بھی ان گھروں کی چابیاں ہیں جو جنوبی اسرائیل میں تباہ ہو گئے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس وقت محاصرے میں ہیں اور بھوک سے مر رہے ہیں۔ جو اپنی زندگی میں دوسری، تیسری یا چوتھی بار زبردستی بے گھر ہوئے ہیں۔ میں اپنے اندر یہ غم لے کر جاتی ہوں کہ میں یافا میں نہیں رہ سکتی اور یہ جرم کہ میں اس شہر کا دورہ کرنے میں بالکل بھی کامیاب ہو گئی جبکہ یافا کے بہت سے اصل باشندوں نے کبھی غزہ نہیں چھوڑا اور اب وہ بے جا اور اندھا دھند جارحیت کا سامنا کر رہے ہیں اور کبھی یافا نہیں جا سکتے۔

7 اکتوبر کے بعد میں نے اکثر غزہ کی چند رحمتوں کے بارے میں سوچا۔ یہ فلسطینی زمین کا آخری باقی ماندہ ٹکڑا ہے اور اسرائیلی ناکہ بندی کے باوجود یہ آخری فلسطینی علاقہ ہے جو بحیرہ روم سے ملتا ہے۔ اس میں غزہ کے فلسطینی میری طرح اور جنین اور نابلس کے قریب کے علاقوں کے فلسطینیوں کی طرح نہیں ہیں۔ ان کے لیے سمندر فلسطین کا پرانا دوست ہے۔ وہ اس کے نمک، اس کی خوشبو سے جڑے ہوئے ہیں، اور وہ اس کے جوار بھاٹے سے نہیں ڈرتے۔ وہ سفید فاسفورس کی آگ کو بھڑکانے کے لیے ریت کا استعمال کرتے ہیں، جسے پانی سے بجھایا نہیں جا سکتا۔ خوراک، پلمبنگ اور بجلی کی عدم موجودگی میں، وہ سمندر کو نہانے اور مچھلی کے کھانے تیار کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مغربی کنارے میں، فلسطینیوں کو تقریباً تازہ مچھلی تک رسائی حاصل نہیں

میں بحیرہ روم کو اسرائیل سے آزاد
کرانے کی خواہش ترک نہیں کر سکتی

ہوتی۔ ہم ٹینڈ سارڈینز اور ڈبہ بند ٹیونا کو عیاشی کے طور پر دیکھتے ہیں۔

میں ان استعاراتی اور مادی طریقوں کے بارے میں سوچتی ہوں جن سے سمندر ہمارے شعور تک پہنچتا ہے۔ جب تک نسل پرستی ہے، ہمیشہ دو ساحل رہیں گے۔ شمالی غزہ کے ساحل جہاں اسرائیلی فوجی رقص اور تیراکی کر رہے ہیں، اور جنوبی غزہ کے ساحل جہاں فلسطینی پناہ گزین نہاتے اور مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ یافا کا ساحل جہاں اسرائیلی سورج میں غسل کر رہے ہیں اور اپنے بچوں کو سرفنگ کرنا سکھا رہے ہیں، اور جہاں فلسطینی پہلی بار سمندر میں قدم رکھتے ہیں۔ فلسطین کے بحیرہ روم کا ساحل، اور دیگر تمام بحیرہ روم، یورپی بحیرہ روم، اور عرب بحیرہ روم؛ ڈولس ویٹا بحیرہ روم، اور غدار، ہجرت کرنے والا بحیرہ روم، ایک پرتعیش اور خوش مزاج بحیرہ روم، اور ایک ظالم، سنگدل بحیرہ روم ایک ایسا سمندر ہے جس کے متعدد ساحل ہیں۔ یہ ایک سمندر ہے، جیسا کہ محمود درویش نے لکھا، ''اور وہاں آپ ایک ایسی دنیا میں ہوتے ہیں جہاں کوئی آزادی نہیں ہے، جہاں الفاظ زنجیروں میں جکڑ دیے گئے ہیں۔ جہاں سمندر کی گہرائیوں کو نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی چھوا جا سکتا ہے۔ سمندر سمندر ہے،'' اور میں بحیرہ روم کو اسرائیل سے آزاد کرانے کی خواہش کو کبھی ترک نہیں کر سکتی۔

(مصنفہ: سجی صوافطہ، Suja Sawafta یونیورسٹی آف میامی میں ڈیپارٹمنٹ آف ماڈرن لینگویجز اینڈ لٹریچر میں عربی کی اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔) ۞

بھارت سے غزہ پر نظم

علیزے نجف بھارت سے 'اطراف' کی دلدادہ ہیں۔اس سے پہلے ہم ان کا فیض صاحب کی صاحبزادی منیزہ سے انٹرویو نذر قارئین کر چکے ہیں۔اب ہماری فرمائش پر انہوں نے غزہ میں ایک نظم عنایت کی ہے۔پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کریں۔

فلسطین۔جہاں پہ ہر سو ہے موت رقصاں

خدایا۔ہم پر تو رحم کر دے

زمیں کے سارے خدا ستم کی ہر ایک حد پار کر چکے ہیں

تحریر:علیزے نجف

سنا ہوا تھا کہ اس صدی کی
روایتیں سب سے محترم ہیں
یہاں ہے حاصل امان سب کو
یہاں پہ سب کے حقوق یکساں
یہاں کے مجرم ہیں سب کے مجرم
یہاں ہے اک عالمی عدالت
یہاں ہے قانون کی حکومت
کئی ادارے بھی اس صدی میں ہیں پاسدارانِ حق وانصاف
کہ جو نگہبانِ امن بھی ہیں
اگر یہ سچ ہے
تو کس جگہ آ کھڑی ہوں میں پھر!!!
غزہ ہے یہ کس جہاں کا حصہ؟
کہ یہ فلسطیں کہاں ہے واقع
جہاں پہ ہر سو ہے موت رقصاں
جہاں پہ انسانیت شکستہ
کہ جس پہ حیواں کو شرم آئے
جہاں پہ بھوک اور پیاس ہر سو
جہاں پہ ماؤں کے خشک لب پر
نمی اگر ہے تو آنسوؤں کی
جہاں پہ اک باپ اپنے بچے کی
بھوک اور پیاس کو مٹانے
برستے بارود کے ستم سے
ہزار ہا گولیوں سے بچ کر
کہیں سے لے آئے چند بسکٹ
مگر وہ لوٹے تو سارا منظر بدل چکا ہو
وہ ننھی معصوم روح
جنت کو چل پڑی ہو

یہ منظر اک موت کی طرح سے
شکستہ دل باپ کو بھی نڈھال کر دے
یہ کیسی دنیا ہے
جس میں انسانیت کا کوئی وجود
باقی نہیں بچا ہے
یہ کیسی دنیا.....!!!!
جہاں پہ ظالم
دہائی دے دے کے ظلم کی خود
ستم کی ہر حد سے بڑھ گیا ہے
تمام ہی ظلم کے مقدمے
جو ظلم جھیلیں انھیں کے سر ہیں
سوال یہ ہے کہاں ہیں آخر
جو بن رہے تھے جہاں کے آقا
وہ جن کے دستور میں
حقوق انسان کی جو شق ہے
ہر ایک شق سے وہ محترم ہے
وہ عالمی طاقتیں کہاں ہیں؟
کہ روبرو خونی بھیڑیوں کے
وہ کاغذی شیر بن گئی کیوں؟
یہ کیسے آقا۔۔۔کہاں کے آقا
غلام یہ تو مفاد کے ہیں
انھیں ہوس اقتدار کی ہے
ہے صرف جامہ سفید ان کا
مگر تعفن زدہ ہیں روحیں
ضمیر سے خون رس رہا ہے
ہے نشہ اقتدار طاری
زباں پہ ہمدردی، دل میں کینہ

یہی ہے واحد شناخت ان کی
غزہ! تجھے میں بچاؤں کیسے
ترے یہ آنسو میں کیسے پونچھوں
کہوں میں کیسے!!!!!
کہ بس میں میرے نہیں ہے کچھ بھی
ہیں میرے دونوں ہی ہاتھ خالی
یہ خالی ہاتھ اب
اٹھا لئے ہیں دعا کی صورت
وہیں سے ہی اب نجات ہوگی
وہیں سے ہی اب ملے گی راحت
خدایا ہم پہ تو رحم کر دے
زمیں کے سارے خدا
ستم کی ہر ایک حد پار کر چکے ہیں
تری مقدس زمیں کو ہم پہ
یہ ہر گھڑی تنگ کر رہے ہیں
کہ غزوہ بدر کا سا نقشہ
کھنچا ہوا ہے جہاں بھی دیکھو
ہیں منتظر ہم تری مدد کے
مرے خدا ہم کو فتح دے دے
وہ فتح جس کا کیا ہے وعدہ۔
غلط ہے اکیسویں صدی کی
روایتیں ساری محترم ہیں
تھے ظلم پہلے، ہیں ظلم اب بھی
فقط خدا ہی ہے سچا منصف
رحیم ہے وہ کریم ہے وہ
اسی پہ کامل یقیں ہے اپنا

❀❀❀

چین اور روس کے درمیان قریبی تعلقات

سید علی نواز گیلانی 'اطراف' کی ابتدا سے ہی اس کی قلمی سرپرستی کر رہے ہیں۔ پاکستان چین دوستی کے علمبردار ہیں۔ چین آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہماری درخواست پر وہ آج کل کے بحرانی عالمی دَور میں روس اور چین میں بڑھتے تعلقات کے حوالے سے علاقائی سیاست کا جائزہ لے رہے ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

مغرب۔چین اور روس میں بڑھتی قربتوں پر پریشان

تحریر: علی نواز گیلانی

روس کے وزیر خارجہ سرگئی لاوروف کے حالیہ دورہ بیجنگ نے نہ صرف روس اور چین کے درمیان۔فارتی تعلقات کو مستحکم کیا ہے بلکہ اِس دورے اُور رابطوں سے عالمی اتحادوں کی ممکنہ تشکیل نو کا عندیہ بھی ملا ہے۔لاوروف اوران کے چینی ہم منصبوں کے درمیان ہونے والی بات چیت میں جغرافیائی سیاسی تناؤ سے لے کر اقتصادی تعاون تک متعدد عالمی مسائل کا احاطہ کیا گیا۔جس سے واضح ہو گیا کہ ماسکو اور بیجنگ اہم عالمی امور میں اپنے موقف کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر رہے ہیں۔ دونوں ممالک کے درمیان بڑھتی ہوئی یہ ہم آہنگی' خاص طور پر مغربی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر' بین الاقوامی تعلقات میں بدلتے ہوئے منظر نامے کی نشاندہی کر رہی ہے۔روس اور چین کے درمیان تعلقات مضبوط قائم ہونے کے بعد عالمی طاقت کے توازن میں تبدیلی دیکھنے کو ملے گی جو مغربی اثر و رسوخ کے روایتی غلبے کو چیلنج کرے گی اُور اِس سے مستقبل میں نئے اتحادوں کی راہیں بھی کھلیں گی۔

بین الاقوامی امور بشمول جمہوریتوں اور نیٹو کے ارکان کے ساتھ تنازعات پر روس اور چین کے درمیان رائے اُس وقت سے واضح ہوئی' جب بیجنگ میں سفارتی بات چیت ہوئی تو یوکرین کی صورتحال پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔امریکہ نے چینی کمپنیوں کے یوکرین پر حملے میں مبینہ طور پر روس کی حمایت کرنے پر تشویش کا اظہار کیا تاہم چین کا موقف ہے کہ یوکرین کے معاملے پر اِس کا موقف معروضی اور منصفانہ ہے اُور اِس نے روس کو اسلحہ یا فوجی امداد فراہم کرنے میں ملوث ہونے سے انکار کیا ہے۔

سال دو ہزار بائیس میں چین اُور روس درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے بعد سے روس اور چین نے اقتصادی اور دیگر شعبوں میں تعاون پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے مضبوط دوطرفہ تعلقات قائم کئے ہیں۔ خاص طور پر چین روس کو اپنا قابل بھروسہ تجارتی شراکت دار سمجھتا ہے۔ یوکرین پر حملے کے بعد سے روس کو متعدد پابندیوں کا سامنا کرنے کے باوجود' روس نے چین کے ساتھ اپنے معاشی تعلقات برقرار رکھے ہے' جو مغربی دنیا سے تنہائی کے دوران 'لائف لائن' کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

لاوروف کے حالیہ دورہ چین کے دوران دوطرفہ تعلقات سے آگے بڑھ کر ایشیا بحرالکاہل کے خطے میں علاقائی تعاون پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ دونوں ممالک نے خطے میں سلامتی' استحکام اُور ترقی کو برقرار رکھنے کے لئے ہم آہنگی کی اہمیت پر زور دیا۔ چین کے نائب وزیر خارجہ سن وی ڈونگ نے موجودہ دور کو چین اور روس کے تعلقات کے لئے تاریخ کا بہترین دور قرار دیتے ہوئے کہا کہ "صدر شی جن پنگ کی رہنمائی میں چین اور روس کے درمیان تعلقات کو فروغ مل رہا ہے (اُن کے کہنے کا مطلب یہی ہے کہ چین اُور روس کی دوستی کے سلسلے دراز ہونے میں چین کی قیادت یکساں گرمجوشی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔)" تاہم مغربی ممالک میں چین اُور روس کے درمیان ہر دن گہری ہوتی دوستی اُور شراکت داری کے حوالے سے (بے بنیاد) شکوک وشبہات کا اظہار کر رہے ہیں۔ خاص طور پر تجارتی اور دفاعی تعاون کے حوالے سے اُن کے تحفظات کا حقیقت سے دور دور کا تعلق نہیں۔ اس ارتقائی اتحاد نے مغربی طاقتوں کو ایک طرح کی تشویش میں بھی مبتلا کر رکھا ہے' بہرحال' چین اور روس دونوں علاقائی تعاون کو بڑھانے کے اپنے عزم میں غیر متزلزل ہیں۔ وہ شنگھائی تعاون تنظیم

پاکستان کو دونوں ملکوں سے تعلقات کو مستحکم کرنا چاہئے

(ایس سی او) جیسی تنظیموں کو قریبی تعلقات کو فروغ دینے اور خطے میں استحکام کو فروغ دینے کے لئے اہم پلیٹ فارم کے طور پر اہمیت دیتے ہیں۔

قابل ذکر ہے کہ شنگھائی تعاون تنظیم (ایس سی او) علاقائی بین الحکومتی تنظیم ہے جس کی بنیاد سال دو ہزار ایک میں رکھی گئی تھی۔ اس تنظیم کے رکن ممالک میں چین' روس' بھارت' پاکستان' قازقستان' کرغیرستان' تاجکستان اور ازبکستان شامل ہیں۔ شنگھائی تعاون تنظیم کا مقصد اپنے ارکان کے درمیان سیاست' معاشیات' سلامتی اور ثقافت سمیت مختلف شعبوں میں تعاون بڑھانا ہے۔ شنگھائی تعاون تنظیم کے بنیادی اہداف میں سے دہشت گردی' علیحدگی پسندی اور انتہا پسندی جیسے مشترکہ سلامتی کے خطرات سے نمٹنا ہے اور ان خطرات سے نمٹنے کے ذریعے علاقائی استحکام اور سلامتی کو فروغ دینا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ تنظیم کے رکن ممالک مشترکہ فوجی مشقیں کرتے ہیں اور ان چیلنجوں کا موثر طریقے سے مقابلہ کرنے کے لئے خفیہ معلومات (انٹیلی جنس) کا تبادلہ بھی کیا جاتا ہے۔ مزید برآں شنگھائی تعاون تنظیم اپنے ارکان کے درمیان تجارت کے فروغ' سرمایہ کاری میں سہولت اور بنیادی ڈھانچے کی ترقی کے منصوبوں جیسے اقدامات کے ذریعے اقتصادی تعاون کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ شنگھائی تعاون تنظیم اپنے رکن ممالک کے درمیان ثقافتی تبادلوں اور عوام کے درمیان قریبی روابط کے ذریعے اتحاد اور تعاون کو فروغ دینے کے لئے اہم گٹھ جوڑ کے طور پر بھی کام کرتی ہے۔ خطے میں امن و استحکام اور معاشی ترقی و خوشحالی کو فروغ دینے کے اپنے مشن میں شنگھائی تعاون تنظیم تعاون اور باہمی افہام و تفہیم کا گڑھ ہے۔ مزید برآں' یہ متنوع آوازوں کو یکجا کرنے کے لئے بھی ایک اہم پلیٹ فارم فراہم ہے' جس سے اس کے ارکان کے درمیان نتیجہ خیز تعاون اور مکالمے کو فروغ ملتا ہے اور جس سے زیادہ خوشحال اور ہم آہنگ مستقبل کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

چین اور روس کے درمیان حالیہ سفارتی رابطوں کے اثرات بھی دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ حالیہ چند روز میں چین کی کرنسی (یوآن) کو امریکی ڈالر کے مقابلے میں دباؤ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے' جو سنجیدہ تر اقتصادی حرکیات کی عکاسی کرتا ہے۔ پیپلز بینک آف چائنا کی

ہماری اقتصادی ترقی اور علاقائی استحکام چین اور روس سے وابستہ

جانب سے یوآن کو مستحکم کرنے کی کوششوں کے باوجود' شرح سود میں اضافے اور دو بڑی معیشتوں کے درمیان پالیسی اختلافات نے چینی کرنسی پر بوجھ ڈالا ہے جبکہ سرمایہ کار چین اور امریکہ دونوں سے اہم اقتصادی اعداد و شمار کے اجرا کا انتظار کر رہے ہیں' جن سے مستقبل کی مالیاتی پالیسیوں سے متعلق صورتحال اور بصیرت میں اضافہ ہوگا۔ ایک ایسے وقت میں جب سفارتی روابط جاری ہیں اور

یوکرین میں سیاسی تصفیے کی کوششیں بھی الگ سے ہو رہی ہیں تو چین کے خصوصی نمائندہ برائے یورشین امور روس سمیت متعدد ممالک کا دورہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں' جو خطے میں سفارتی حل کے لیے چین کے عزم کو ظاہر کرتے ہیں۔

لب لباب یہ ہے کہ ممالک کے درمیان اتحاد ہی طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ جغرافیائی سیاسی غیر یقینی صورتحال اور عالمی حالات میں تیزی سے آنے والی تبدیلیوں کے دور میں' چین اور روس کے مابین تعلقات و تعاون میں پائیدار شراکت داری اور استحکام دکھائی دے رہا ہے اور یہ صرف زبانی جمع خرچ اور محض سفارت کاری سے آگے کی بات ہے۔ دونوں ممالک چاہتے ہیں کہ مل کر مستقبل میں درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرنے اور ان چیلنجوں پر مل کر قابو پانے کے پختہ عزم کی عکاسی کر رہا ہے۔ سفارتی رکاوٹوں اور بیرونی دباؤ کا سامنا کرتے ہوئے' دونوں ممالک اپنے تعلقات کو گہرا کرنے کے پُرعزم ہیں' جس سے ان کے اتحاد کی گہرائی اور جامعیت کی عکاسی کر رہی ہے۔

جب ہم بین الاقوامی تعلقات کی پیچیدگیوں کی بات کرتے ہیں' تو اقتصادی اور تزویراتی تعاون کے لئے مشترکہ کاوشیں بارآور دکھائی دیتی ہیں اور یہ دوطرفہ تعلقات کو مضبوط بھی بنا رہی ہیں بلکہ عالمی معاملات کے مستقبل کے راستے کو تشکیل دینے میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ باہمی خوشحالی کو فروغ دینے کے باہمی مقاصد کا تعین اور مشترکہ کوششوں کے ذریعے چین اور روس نے مسلسل بدلتے ہوئے عالمی نظام کے درمیان تعمیری روابط قائم کر کے عمدہ مثال قائم کی ہے جو اُمید اور استحکام کی کہکشاں میں اُمید کی کرن پیش کر رہی ہے۔

پاکستان اپنے تزویراتی محل وقوع کی وجہ سے چین اور روس کے ساتھ تاریخی تعلقات رکھتا ہے اور یہ خطے یا عالمی سطح پر بننے والے مشترکہ ویژنز کو تقویت دینے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پاک چین اقتصادی راہداری (سی پیک) اور ون بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو (بی آر آئی) کے ذریعے چین کے دیرینہ اتحادی کی حیثیت سے بھی پاکستان اہم ہے جو علاقائی روابط بڑھانے اور اقتصادی ترقی کو فروغ دینے کی چین کی کوششوں میں 'اہم کڑی' کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ مزید برآں' روس کے ساتھ پاکستان کی اسٹریٹجک شراکت داری' خاص طور پر دفاع اور توانائی کے شعبوں میں تعاون' سہ فریقی تعلقات کو مزید مستحکم کرنے کا باعث بن رہا ہے۔ چین اور روس کے درمیان گہرے تعاون سے پاکستان کو نمایاں طور پر فائدہ ہوگا۔ تینوں ممالک کے درمیان اقتصادی اور شراکت و تعاون میں اضافے سے پاکستان میں تجارت' سرمایہ کاری اور بنیادی ڈھانچے کی ترقی کے نئے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں جس سے پاکستان کی اقتصادی ترقی اور علاقائی استحکام میں مدد مل سکتی ہے۔ چین اور روس کے ساتھ پاکستان کی اسٹریٹجک صف بندی عالمی امور کے مستقبل کی تشکیل میں سہ فریقی تعاون کی اہمیت کو اجاگر کر رہی ہے۔ اپنی منفرد حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور دونوں ممالک کے ساتھ تعلقات کو مضبوط بنا کر پاکستان اس شراکت داری سے پیدا ہونے والے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے معاشی و دیگر مفادات کو آگے بڑھا سکتا ہے جبکہ خطے اور عالمی سطح پر امن اور خوشحالی میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔

(پشاور سے تعلق رکھنے والے مصنف خارجہ امور کے مبصر اور میڈیا ایڈوائزر ہونے کے ساتھ پاکستان چائنا فرینڈشپ ایسوسی ایشن' خیبر پختونخوا شاخ کے سیکرٹری جنرل ہیں۔

ان سے بذریعہ ای میل

syeed.gilani@gmail.com

رابطہ کیا جا سکتا ہے۔)

❀❀❀

اُردو کی ممتاز ناول نگار۔ جہاندیدہ صحافی "تین عورتیں تین کہانیاں" کی خالق سعیدہ افضل کی خود نوشت ان دنوں 'اطراف' کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا سلسلہ ہے۔ یہ ایک خاتون کی نہیں۔ پاکستان کی ہر خاتون کی کہانی ہے۔ بلکہ پاکستان کی داستان ہے۔ قیام پاکستان کے وقت اس عظیم وطن میں زندگی کتنی پُر عزم تھی۔ ایک نیا ملک کیسے اپنا مقام بنا رہا تھا۔ اس کے رہنے والے کیا خواب دیکھتے تھے۔ اسکولوں میں کتنی محنت ہوتی تھی۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

میرے ماموں کی دُعا۔ میرا پہلا اسکول

قسط نمبر 9

تحریر: سعیدہ افضل

ان دنوں ہم اپنے والد کے ساتھ ترکی، عراق، شام، مصر اور یمن وغیرہ میں گھوم کر آئے تھے، وہ میری والدہ کو تاریخی مقامات دکھانے لے گئے تھے۔ امی برقع اوڑھتی تھیں، میں اور عزیزہ کم سن تھیں ہم کو وہاں کے تاریخی مقامات کی اہمیت کا احساس نہیں تھا۔ بس خوبصورت یادیں ساتھ تھیں ہم اپنے والدین کی ٹھنڈی چھاؤں میں سیر و تفریح کر رہے تھے اور سیر کا لطف لے رہے تھے۔

اب جب کبھی ان ملکوں کے تاریخی مقامات کی تصویریں دیکھتی ہوں تو وہ حسین یادیں پھر سے تازہ ہو جاتی ہیں۔ اب نہ والد صاحب حیات ہیں اور نہ والدہ رہی ہیں کہ ان تصاویر کو دکھا کر ان سے پوچھوں کہ ہم یہ کس جگہ پر کھڑے ہیں، یہ کونسا مقام اور یہ مزارات کونسی ہستیوں کے ہیں۔ ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔

دریائے فرات کے کنارے ہوٹل میں قیام یاد ہے۔ اس دوران دریا میں موٹر لانچ کی سیر کو آج تک نہیں بھولی۔ بغداد کے بازاروں میں بڑے بڑے شوروم اور ان میں رکھے نوادرات اب بھی وہ مناظر آنکھوں میں پھرتے ہیں۔ عراق کی تباہی کے بعد تو یقیناً وہ نوادرات بھی داؤ پر لگی ہوں گی۔

میں پانچ سال کی ہو چکی تھی، یہ وہ دَور تھا جب قیام پاکستان کے بعد نئے وطن کی تعمیر میں ہر فرد اپنے اپنے انداز سے کام کر رہا تھا۔ انہی دنوں میرے ماموں دانش صاحب نے میرے والد کے 'امپورٹ ایکسپورٹ' والے کاروبار سے علیحدگی اختیار کر لی۔ وہ لکھنے لکھانے والے آدمی تھے، ان کا حلقۂ احباب ادیبوں اور صحافیوں پر مشتمل تھا۔ ان کے دوستوں میں حیدر آباد دکن سے آئے سہام مرزا جو ایک ہفت روزہ نکال رہے تھے، دہلی کے خواجہ بقاءاللہ جو "کردار" نکالتے تھے اور خورشید اعجاز ہفت روزہ "جھنکار" والے۔ بے روزگاری کے سبب ماموں نے ان سبھی سے مشورہ کرنے کے بعد اپنا ایک پبلشنگ ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ روزنامہ "امروز" کراچی بند ہونے کی وجہ سے حسین

میں اور میری کزن شمیم "جدید مدرسۃ البنات" میں داخل کروادی گئیں

اعظمی ان دنوں بے روزگار ہو گئے۔ ماموں نے ان کے ساتھ ملکر پبلشنگ کا کام کرنے کا ارادہ کر لیا اور اپنے اشاعتی ادارے کا نام انہی دوستوں کی تجویز پر "کتاب سوسائٹی" رکھا۔

مجھے یاد ہے تب اعظمی صاحب تقریباً ہر روز ہی ہمارے گھر پر ماموں سے ملنے آیا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب الٰہ آباد کے عباس حسینی کا 'نکہت پبلی کیشن' جاسوسی اور رومانوی کہانیوں کی سیریز کی وجہ سے بہت کامیاب جا رہا تھا، لہٰذا میرے ماموں اور

ترکی۔ عراق۔ شام۔ مصر۔ یمن میں والدین کے ساتھ سفر

حسین اعظمی صاحب نے اپنی جمع پونجی داؤ پر لگا کر ادبی کتب کی اشاعت کا انتخاب کیا سب سے پہلے ابراہیم جلیس کی "ذرا ایک منٹ" اور اس کے بعد ممتاز مزاح نگاروں کی منتخب تحریروں کا مجموعہ تلخ و شیریں شائع کیا، یہ کتابیں اشاعت کے بعد میں نے ماموں کے کمرے میں بند۔ بنڈلوں، کی صورت میں رکھی دیکھی تھیں۔

مجھے کتابوں سے دلچسپی تھی۔ پڑھنا نہیں آتا تھا۔ پھر بھی ماموں کی

فاروق لغاری کے فرزند جمال لغاری کے ہمراہ۔ ڈیرہ غازی خان

کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی تھی..... میرے اس شوق کو دیکھتے ہوئے بابا نے گھر پر بچوں کے وہ تمام رسالے لگوا دیے تھے جو اس وقت نکلتے تھے اور امی مجھے اس میں سے کہانیاں پڑھ کر سناتی تھیں۔ وہ مجھے روزانہ اُردو قاعدہ، گنتی اور پہاڑے پڑھاتی تھیں۔ انہوں نے ہی مجھے قرآن پاک کے پہلے تین سپارے پڑھائے تھے۔

میں ابھی اسکول نہیں جاتی تھی۔ اب اماں کو میرے اسکول جانے کی فکر لاحق ہوگئی۔ چونکہ ہمارے فلیٹ کے پچھلے پورشن میں اب بھی پھوپھی دلشاد اور دانش ماموں رہتے تھے میں ان کی بیٹی شمیم کے ساتھ کھیلنے کو ہر وقت انہی کے کمرے میں گھسی رہتی تھی جو میری ہم عمر اور زندگی کی پہلی ہم جولی و سہیلی تھی۔

پھوپھی بھی شمیم کو اسکول داخل کرانا چاہتی تھیں، انہوں نے ایک روز میرے والد سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ والد صاحب مجھے کانونٹ اسکول میں پڑھانا چاہتے تھے مگر پھوپھی جن کو میں بوا دلشاد کہتی تھی، نے منع کر دیا۔ میرے والد سے کہا۔

افضل بھائی..... ابھی ہماری بچیاں چھوٹی ہیں کسی دُور کے اسکول نہیں بھیج سکتے۔ ہمیں ان کو یہاں ہی گھر کے نزدیک کسی اسکول میں داخل کرانا چاہئے۔ اگر میں اپنی پھوپھیوں کی آنکھ کا تارا تھی تو میری تینوں پھوپھیاں میرے والد کی آنکھ کا تارا تھیں۔ خاص طور پر بڑی پھوپھی کی بات وہ نہیں ٹالتے تھے۔

انہوں نے دانش ماموں سے صلاح لی، وہ کہنے لگے۔ میری بیگم ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں اپنے نئے کام ''کتاب سوسائٹی'' کے قیام کی طرف دھیان دوں گا۔ اور تم بیشتر بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے رہتے ہو۔ ہم کو اپنی بچیاں کراچی کے کسی نزدیکی اسکول میں داخل کرنا چاہئیں۔ شیخ طفیل کا اسکول نزدیک ہے ان کو وہاں داخل کرا دیتے ہیں۔

شیخ طفیل میرے والد کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ وہ ماموں کے بھی دوست تھے۔ ان ہی کی معاونت سے ماموں کو اپنے اشاعتی ادارے ''کتاب سوسائٹی'' کا دفتر میکلوڈ روڈ پر موجودہ جنگ بلڈنگ کے پاس ایک عمارت میں کرائے پر ملا تھا۔

طفیل صاحب بندر روڈ پر ایک کمپاؤنڈ کے اندر بنے ہوئے کونے کے گھر میں رہتے تھے اور ان کی بڑی بہن اقبال بیگم انہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ وہ طفیل صاحب کا اسکول جدید مدرسۃ اللبنات بھی چلاتی تھی، یہ اسکول برنس روڈ پر ایک بڑی سی بلڈنگ میں واقع تھا اسی جانب نزدیک رتن تلاؤ تھا اور سڑک پار بندر روڈ۔

میں اور میری کزن شمیم مدرسۃ اللبنات میں داخل کرا دی گئیں، یہاں کی اسکول ٹیچرز ہم دونوں کا خصوصی خیال رکھتی تھیں۔ روز شام کو اسی اسکول کی ایک ٹیچر مجھ کو گھر آ کر ٹیوشن بھی پڑھاتی تھیں۔

ایک روز میری کلاس ٹیچر نے مجھے ایک ترانہ لکھ کر دیا۔ اور کہا کہ تم نے اس کو اچھی طرح یاد کرنا ہے، انہوں نے مجھے اسکول میں

لوگوں کو ایس ایم کالج کے چوک میں انگریز لارڈ کا مجسمہ گراتے دیکھا

بھی یاد کرایا۔ گھر پر ٹیوشن والی ٹیچر نے بھی اور یہ ازبر ہوگیا۔ سورہ اخلاص اور اس کا ترجمہ بھی مجھ کو فر فر یاد کرایا گیا تھا۔

ہفتہ بعد ایک دن صبح ہماری ٹیچر اسکول کی بچیوں کو آرام باغ گراؤنڈ میں لے گئیں، جہاں ایک پختہ چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس کے اوپر اسٹیج بنا دیا گیا تھا اور سامنے شامیانہ لگا ہوا تھا۔

میری دانست میں یہ چبوترہ یا اسٹیج کہہ لیں قیام پاکستان سے قبل

بیٹی نادیہ اعجاز قریشی اور داماد واصف قریشی اپنی شادی کے موقع پر۔ چاہ قیصر والی، ڈیرہ غازی خان

بنا ہوگا اور اس رام باغ یا پھر آرام باغ میں تقریبات یا پھر جلسے ہوتے ہوں گے۔ یا پھر کوئی مجسمہ نصب ہوگا جو بعد میں ہٹا دیا گیا ہو۔ یہ تو کراچی کی تاریخ لکھنے والے ہی جانتے ہوں گے۔ لیکن بچپن میں جب ہم برنس گارڈن جاتے تھے، میں نے انگریز آفیسرز کے بڑے بڑے مجسمے چوکوں پر نصب دیکھے تھے۔ ایک مجسمہ ایس ایم کالج کے سامنے والے چوک پر تھا کسی انگریز لارڈ کا جس کو پاکستان بن جانے کے بعد لوگوں نے گرا کر توڑ پھوڑ دیا تھا ایک روز جب لوگ یہ مجسمہ گرا کر توڑ رہے تھے تو بزنس گارڈن جاتے ہوئے یہ منظر میں نے دیکھا تھا۔ بہرحال بات سے بات نکلتی ہے۔ اور یاد کے دریچے کھلنے لگتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی آرام باغ گراؤنڈ کی جہاں اسٹیج پر صوفے رکھے گئے تھے اور میز پر گلدستے ..... وہاں کونے پر سامنے ہمارے وطن پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ ہم بچیوں اور دیگر طالبات کو ان کرسیوں پر بٹھا دیا گیا جو شامیانے کے اندر قطاروں میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکیاں، اور خواتین بھی آئی ہوئی تھیں جو اقبال لیڈیز انڈسٹریل ہوم بزم اقبال سے مدعو کی گئی تھیں۔ یہ ادارہ بھی طفیل صاحب اور ان کی ہمشیرہ کی زیر نگرانی کام کر رہا تھا۔ غرض کہ کئی اسکول آئے ہوئے تھے اور شامیانے کے اندر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہماری اسکول کی ہیڈ مسٹریس کے ہمراہ ایک اُجلی اُجلی صورت والی دبلی پتلی خاتون تشریف لے آئیں جنہوں نے سر پر دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا، یہ خواتین اسٹیج پر رکھے صوفوں پر بیٹھ گئیں۔ ان کا استقبال تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر پُرجوش تالیوں سے کیا تھا۔

کچھ بچیوں کے ساتھ میں بالکل پہلی رو میں بٹھائی گئی تھی۔ یہ میری زندگی کا پہلا فنکشن تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا اسکول کا فنکشن کیا ہوتا ہے کس لیے اور کیسے ہوتا ہے۔ اور ہم سب لوگ یہاں کیوں آئے ہیں۔

مائیک کے سامنے کھڑی خاتون نے چند استقبالیہ یا ابتدائی جملے کہے اور پھر میرا نام پکارا گیا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، تبھی ٹیچر مجھے اسٹیج پر لے گئیں اور روسٹر کے پیچھے رکھی چوکی پر کھڑا کر دیا اب میرا قد اونچا ہو گیا تھا۔ اور چہرہ حاضرین کو نظر آ سکتا تھا پھر بھی میرے لیے مائیک کو نیچے کیا گیا اب میرا منہ بالکل مائیک کے سامنے تھا۔ میری آواز شامیانہ میں پچھلی رو میں بیٹھے لوگوں کو بھی سنائی دے سکتی تھی۔

کلاس ٹیچر میرے ساتھ تھی۔ انہوں نے آہستہ سے میرے کان میں سرگوشی کی بسم اللہ پڑھو۔ سورۃ اخلاص پڑھو جس طرح تم کو اسکول میں سکھایا گیا تھا۔

میں نے اسی طرح تلاوت کی جیسے انہوں نے اسکول میں ریہرسل کرائی تھی۔ ادب کے ساتھ اور پھر مکمل سورہ اخلاص کا ترجمہ سنایا۔ اب ترانہ پڑھو۔ میں نے اسی طرح جیسے انہوں نے ایکشن کے ساتھ سکھایا تھا۔ اپنے ہاتھ سے چاند تارا بنا کر اپنے وطن کے پرچم کی طرف اشارہ کرتی اور لہک لہک کر کہتی۔

چاند روشن چمکتا ستارہ رہے

سب سے اونچا یہ جھنڈا ہمارا رہے

مہمانِ خصوصی اور اقبال بیگم کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، انہوں نے مجھے پاس بلایا دبلی پتلی تقریب کی خاص مہمان نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ پیار کیا اور چھوٹی سی ایک سنہری ڈبیا دی جیسے اقبال بیگم نے میز سے اٹھا کر ان کو دیا تھا۔

سعیدہ افضل جانتی ہو یہ کون ہیں۔ یہ ہمارے قائد محمد علی جناح کی بہن محترمہ فاطمہ جناح ہیں۔ ہماری ہیڈ مسٹریس بولیں۔ میں کچھ نہ سمجھی اور سنہری ڈبیا کو ہاتھ میں لے کر چلنے کو ہوئی۔

ان کو شکریہ کہو۔ اقبال بیگم نے یاد دلایا۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ ٹیچر نے آگے بڑھ کر مجھے اسٹیج سے اتارا اور شامیانے میں اسی جگہ بٹھا دیا جہاں میں پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ شمیم میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے اشتیاق سے ڈبیا کو دیکھا تھا جس پر ریپر چڑھا ہوا تھا وہ اسے کھول نہیں سکی۔

تقریب اختتام پذیر ہوئی تو طفیل صاحب کے ساتھ دانش ماموں آ گئے۔ شاید وہ پچھلی رو میں بیٹھے تھے۔ ہم دانش ماموں کے ساتھ گھر آئے میں نے ڈبیا ان کو دی۔ ماموں یہ مجھے انعام ملا ہے۔

انہوں نے ڈبیا کھولی۔

واہ کیا تحفہ تھا، اسکول کی طرف سے۔ زندگی میں جو پہلا انعام مجھے ملا وہ قائداعظم کی ہمشیرہ کے ہاتھوں سے ملا اور وہ بھی علم کے خزانے کی کنجی۔ قلم۔ جس نے عمر بھر ایک روشن دیے کی طرح میرا ساتھ دینا تھا۔ جس نے میری زندگی بنا دی۔

میں کتنی خوش قسمت تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ایک بڑی عنایت تھی۔ جس ذات پاک نے مجھ کو لکھنے کے لیے صلاحیت عطا کی تھی۔ مجھ کو منتخب کیا۔ میرے ہاتھ میں قلم دیا کہ اس کے ذریعے میں نیکی کے لیے جہاد کروں، اچھی باتیں لکھوں۔ شاید کسی کو یقین نہ آئے اتنی چھوٹی سی عمر میں بھی کبھی میرے ہاتھ سے قلم گر جاتا تو اس کو چومتی اور آنکھوں سے لگا لیتی تھی۔ معلوم نہ تھا کہ مستقبل میں اپنے پیارے وطن کی ماؤں بہنوں۔ بیٹیوں کے لیے قلم سے جہاد کروں گی۔ ان کی زندگی کی کہانیاں لکھوں گی۔ ان کے دُکھ سکھ اور مسئلے مسائل معاشرے کے سامنے لاؤں گی اور اس طرح پاکستان کی عورت کی پہچان سالہ تاریخ رقم ہو جائے گی آج وہ جب اپنے دُکھ سکھ مجھ سے زبانی بیان کرتی ہیں تو ان کو ایک

آرام باغ میں میری زندگی کا پہلا فنکشن۔ محترمہ فاطمہ جناح کے ہاتھ سے انعام

امانت سمجھ کر دل کی جھولی میں بھر لیتی ہیں اور پھر ان کے دکھوں سے کہانیاں تخلیق کر کے انہیں اپنے خونِ جگر سے لکھتی ہوں۔ تب میں بھی اسی درد سے گزرتی ہوں، جس درد سے وہ گزرتی ہیں، کہانیوں کے اختتام پر، فرضی نام .....م۔ ل۔ ب۔ پ وغیرہ لکھنا پڑتے ہیں۔ کیونکہ ہر عورت کے ایک سے دکھ ایک سی فریاد ہوتی ہے اور یہ بے نام کہانیاں سچی ہوتی ہیں۔ میں ان میں سچائی تلاش کرنے کے بعد ہی لکھتی ہوں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ میرے والد صاحب جب کبھی کسی ملک سے لوٹتے وہ میرے لیے تحفے میں قلم ضرور لاتے۔ میرے پاس ملکوں ملکوں کے بہت سے خوبصورت قلم جمع ہو گئے۔ اپنی شادی ہونے تک ان کو سنبھال کر رکھا۔ جب بیاہ کر کراچی سے ڈیرہ غازی خان گئی وہاں مشترکہ فیملی سسٹم تھا بلکہ برادری فیملی سسٹم کہنا چاہئے۔ ایک گھر میں پانچ چھ فیملیاں اکٹھی رہتی تھیں کمرے علیحدہ علیحدہ اور صحن ایک ہوتا۔ اس دیہاتی سسٹم میں ہر گھرانے کے کئی کئی بچے تھے۔ مجھے لگتا تھا یہ گھر نہیں ہے میں کسی اسکول میں رہتی ہوں، میری قیمتی اشیاء ان بچوں کو لبھاتی تھیں۔ جن میں گھڑیاں، اور قلم بھی تھے کچھ بچوں میں سے ایک دو نے یہ غائب بھی کر دیے۔ انہی میں وہ قلم بھی چلا گیا جو محترمہ فاطمہ جناح کے ہاتھوں سے ملا تھا، اور عزیز از جان تھا۔ مجھ کو آج تک اس کے کھوئے جانے کا قلق ہے۔ کہ وہ میری زندگی کا پہلا اور بہت قیمتی انعام تھا۔ جس کو گھر آتے ہی میں نے سب سے پہلے اپنے قلمکار ماموں دانش کو دکھایا تھا اور انہوں نے خوش ہو کر یہ دعا دی تھی۔ ''اللہ رب العزت تم کو اس قلم کے وسیلے سے عزت دے اور تم نیک نام پیدا کرو۔''

یہ میرے وہی صحافی ماموں تھے جن کے پاس ادبی کتب کا ایک ذخیرہ تھا۔ ان کتابوں سے میں نے مستقبل میں فیض پایا۔ یہ میرے وہی ماموں تھے جن کی وفات پر سہام مرزا صاحب نے ماہنامہ دوشیزہ مارچ۔ 2001 کے شمارے جلد نمبر 20 کے ابتدائی صفحے پر لکھا۔

''دانش ڈیروی جس کا نام تھا۔ میرا دوست تھا۔ غم گسار تھا، ہم سفر تھا، نصف صدی کا ساتھی تھا۔ اپنی نصف صدی کو قبر میں اتار کر سوچ رہا ہوں۔ زندگی سے بھرپور جیتا جاگتا۔ چلتا پھرتا۔ ہنستا مسکراتا دانش قبر میں نہیں اترا۔ میرے دل میں اتر گیا ہے۔ یہی اس کا مزار ہے۔''

میرے دانش ماموں نے مجھے دل سے دعا دی تھی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے باک نہیں کہ قلم کے وسیلے سے عمر بھر کی مشقت کے بعد اپنی دانست میں جو تھوڑا بہت نام کمایا ہے یہ ان کی دعا کے طفیل ہے۔

میں نے بچپن سے شرمیلی طبیعت پائی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ نصابی کتابوں کو بہت کم وقت دیتی تھی پھر بھی فرسٹ آ جاتی تھی۔ جو تھوڑا بہت پڑھتی سمجھ کر، کبھی رٹا نہیں لگایا۔ اپنے دوسرے ماموں کے ساتھ جب راولپنڈی گئی تو وہاں سے امی کو کراچی خط لکھتی تھی جس جگہ ماموں کو رہائش ملی ہوئی تھی وہ ان کے یونٹ سے دور نہیں تھی، یہ ایک خوبصورت علاقہ تھا سبز، پھولوں کی مہکاروں سے بھرا ہوا۔ پُر فضا۔ یہاں ہر طرف بڑی بڑی پرانے طرز کی کوٹھیاں تھیں۔

جب امی کو خط لکھتی تو وہاں کی منظر کشی افسانوی انداز میں کرتی جیسا کہ سوچتی دیکھتی اور محسوس کرتی، اسی طرح چیزوں کو الفاظ میں۔ تصویر کی صورت تحریر کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

امی خط پڑھ کر حیران ہوتیں۔ ان کو یقین نہ آتا کہ ایک دوسری کلاس کی بچی نے یہ خط اپنی ماں کو خود لکھے ہوں گے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ یہ خط مجھے میری منجھلی پھوپھی سردار بیگم نے لکھ کر دیے ہوں گے جو کہ اس وقت رفیق ماموں کی نئی نویلی دلہن تھیں اور مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ (جاری ہے) ❁

ہماری گل افشاں چلی گئی

بہت غمزدہ کر گئی۔ گل افشاں رانا۔ وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے پاکستان میں 100 وہیل چیئر نشینوں کے انٹرویو لیے جن میں انجینئر بھی تھے۔ ڈاکٹر بھی۔ ہمت اور حوصلے کا نشان۔ فیصل آباد سے 'اطراف' کی قلمی سرپرست۔ معذوری کو کبھی عذر نہیں بنایا۔ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی۔ شاعری میں اپنا اسلوب۔ تقریر بھی باکمال۔ اپنے بابا کی لاڈلی۔ میں ان سے نومبر میں ملا بھی۔ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ دنیا چھوڑ کر جانے والی ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن عائشہ رشید نے ہماری درخواست پر مختصر سا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ہچکی لیتا سورج۔ اور روشن ستارے کی گل افشاں رانا۔ میری ماں بھی دوست بھی

تحریر: عائشہ رشید

ہچکی لیتا سورج اور روشن ستارے کی مصنفہ ''گل افشاں رانا'' پانچ اپریل کو اپنے پیاروں کو روتے ہوئے ہچکیوں میں چھوڑ کر اس جہاں فانی سے کوچ کر گئی۔ گل افشاں رانا ایک اچھی اور نیک انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت اچھی لکھاری بھی

قلمی سفر کا آغاز۔ 16 سال کی عمر میں کیا

تھی، انھوں نے اپنے قلمی سفر کا آغازِ 16 سال کی عمر میں پہلی بار سعودیہ میں جدہ میگزین میں بچوں کی نظم لکھ کر کیا۔ اور یوں ان کے قلم کی روانی بڑھتی گئی اور پھر انھوں نے باقاعدہ طور پر اس پروفیشنل میں اپنے جھنڈے گاڑے۔

گل افشاں رانا ایک بہت باہمت اور نفیس طبیعت کی لڑکی تھی۔ جوان اور زندہ دل ہونے کے باوجود ان کے وجود سے درویشانہ انداز جھلکتا تھا۔ سادگی اختیار کرنے کے باوجود انہیں خاندان کی سب سے خوبصورت اور بڑی آنکھوں والی لڑکی کے القابات سے نوازا جاتا تھا

گل افشاں رانا جو نہ صرف اپنے بابا کی لاڈلی تھی وہی وہ اپنے بہن بھائیوں کو بھی جان سے بڑھ کر عزیز تھی۔ والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کا اس انداز میں خیال رکھ کر یہ بات سچ ثابت کر دی کہ بڑی بہن واقعی ماں کے برابر ہوتی ہے۔

میں گیارہ سال کی بچی تھی جب میری والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا، ان کے جانے کے بعد گل باجی نے ماں بن کر میری تربیت کی اور میرا خیال رکھا۔ وہ بہن ہونے کے ساتھ ساتھ میری ماں بھی تھی اور دوست بھی۔ سینکڑوں دوستوں کے ہونے کے باوجود میں اپنے

اپنے بابا کی لاڈلی۔ بہن بھائیوں کی جان

دل کی ہر بات اپنی باجی سے شئیر کرتی تھی، کیونکہ میں جانتی تھی کہ میری ماں جیسی بہن سے مجھے ہمیشہ مخلصانہ مشورہ ہی ملے گا۔

میری ہر کامیابی کے پیچھے فنانشل سپورٹ (مالی تعاون) میرے ڈیڈی کی، اور مورل سپورٹ (اخلاقی حوصلہ) میری باجی کی ہوا کرتی تھی۔ میں آج جس مقام پر ہوں اپنی بہن کی بھرپور سپورٹ اور دعاؤں کی وجہ سے ہوں۔ ہم بہنیں گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتی تھیں اور زندگی کے ہر پہلو کو ڈسکس کرتی تھیں۔ ہنستی مسکراتی ہوئی بہنوں کا ساتھ اتنا مختصر ہوگا کبھی سوچا نہ تھا۔ ان کو گئے ہوئے آج بیس دن ہوئے لیکن ابھی تک میں خود کو یہی یقین دلانے سے قاصر ہوں کہ میری بہن اب ہم میں نہیں رہی۔ مجھے اب احساس ہوا کہ اصل ماں سے تو میں اب بچھڑی ہوں۔

پیاری باجی آپ کی جدائی تا عمر سب غموں پر بھاری رہے گی

پیاری باجی آپکی جدائی تا عمر سب غموں پر باری رہے گی۔

تمام رنگ تھے جیون کے اس کی آنکھوں میں
خیال وخواب کی حیرت سرا تھی وہ لڑکی

❀❀❀

مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا؟

سیدارتقااحمدزیدی وزارت تجارت کے جائنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ماہنامہ 'اطراف' ان کا شکر گزار ہے کہ وہ غذائیت پر تحقیق سے بھی قارئین کو آگاہ کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی ملازمت کے دوران کے اہم واقعات بھی قلمبند کر رہے ہیں۔ 1971 کے سیاہ ترین دنوں اور سقوط مشرقی پاکستان کے اسباب اور حقائق سے آگاہی کے لیے انہوں نے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا۔ کا انتہائی اہم انکشافات سے بھرپور سلسلہ شروع کیا ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

کھلنا میں عمائدین سے مشاورت کی بجائے دھمکیوں میں گفتگو

قسط نمبر 7

☆تحریر: سیدارتقااحمدزیدی

ایک افسوسناک اور بہت ہی عبرتناک واقعہ میرے زرعی کالج ٹنڈو جام کے کلاس فیلو میجر احتشام نے سنایا جو کھلنا میں تعینات تھے۔ انہوں نے کہا کہ جب اکتوبر 1971 میں مشرقی پاکستان میں حالات سنگین ہو گئے اور مکتی باہنی کا زور بڑھ گیا تھا تو انہوں نے کھلنا کے ڈپٹی کمشنر کو مشورہ دیا کہ وہ شہر کے عمائدین کو اپنے بنگلہ پر مدعو کریں اور ان سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں کہ وہ مکتی باہنی کا ساتھ نہ دیں بلکہ افواج پاکستان اور ضلعی انتظامیہ کا ساتھ دیں تاکہ شہر میں امن وامان کی صورت حال خراب نہ ہو۔ ان ڈپٹی کمشنر صاحب سے احتشام کی کافی دوستی تھی اور وہ اتفاق سے ان کے شہر سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے میجر احتشام کی بات مان لی اور دو دن بعد عمائدین کے ساتھ میٹنگ طے پا گئی۔ وقت مقررہ پر جب میجر احتشام ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پہنچے تو ڈرائنگ روم کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ کمرے میں دو کرسیاں موجود تھیں۔ ایک کرسی پر ڈپٹی کمشنر بیٹھے تھے اور دوسری کرسی ان کے لئے خالی رکھی ہوئی تھی۔ ڈپٹی کمشنر نے میجر احتشام کو خوش آمدید کہا اور میٹنگ کا آغاز اسطرح کیا جیسے کوئی استاد شرارتی بچوں کی سرزنش کر رہا ہو۔ انہوں نے عمائدین سے دوستانہ انداز میں گفتگو کرنے کی بجائے انہیں تنبیہ کی کہ اگر انہوں نے مکتی باہنی سے تعاون کیا تو بہت سنگین نتائج نکلیں گے۔ مکتی باہنی ایک دہشت گرد تنظیم ہے اور جو بھی اس کا ساتھ دے گا وہ بھی دہشت گرد سمجھا جائے گا۔ میجر احتشام نے آہستہ سے ڈپٹی کمشنر کو اپنا لہجہ درست کرنے اور عمائدین سے دوستانہ طریقہ سے بات کرنے کے لئے کہا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اسی طرح انہیں دھمکاتے رہے اور سخت وارننگ دے کر میٹنگ ختم کر دی۔ اور میجر احتشام سے کہا کہ ''چلو اب چائے پیتے ہیں'' میجر احتشام نے جواب دیا کہ انہوں نے کوئی چائے وائے نہیں پینی۔ کیونکہ جو حرکت ڈپٹی کمشنر نے کی ہے اس کے بڑے خطرناک نتائج نکلیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ عمائدین سے کوئی میٹنگ نہ کرتے انہیں دھمکیاں دینے کی بجائے پیار محبت اور احترام سے بات کرنی چاہئے تھی اور ان کو زمین پر بٹھانے کی بجائے، کرسیوں پر بٹھانا چاہئے تھا۔ ان کو رخصت کرتے وقت بھی ان سے ہاتھ ملانا چاہئے تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے جواب دیا کہ وہ بہتر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کسی سے کیا بات کرنی ہے اور کیسے کرنی ہے۔ یہ

ڈپٹی کمشنر نے بنگالی معززین کو زمین پر بٹھایا

انتظامی امور ہیں اور انہیں ان کا وسیع تجربہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ان بنگالیوں کو زمین پر نہ بٹھاتے تو کہاں بٹھاتے؟ کیا اپنے ساتھ کرسی پر بٹھاتے؟۔ انہوں نے بڑی نخوت سے کہا کہ ان میں سے تو مچھلی کی بو آتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے ان سے ہاتھ نہیں ملایا۔ میجر احتشام سے یہ باتیں برداشت نہ ہوئیں اور وہ ناراض ہو کر بغیر چائے پئے چلے گئے۔

12 دسمبر کا دن بڑا خونریز دن تھا۔ مکتی باہنی نے چن چن کر مغربی پاکستانیوں اور غیر بنگالیوں کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ میجر احتشام کو ڈپٹی

کمشنر کا خیال آیا کہ ان کی خیریت معلوم کریں۔ جب وہ ان کے بنگلے پر پہنچے تو دیکھا کہ بنگلے کو آگ لگا کر تباہ کر دیا گیا ہے۔ انہیں بڑی تشویش ہوئی کہ ڈپٹی کمشنر کا کیا حشر ہوا ہوگا انہوں نے ان کے

12 دسمبر۔ مکتی باہنی نے مغربی پاکستانیوں اور غیر بنگالیوں کا قتل عام شروع کر دیا

پڑوسیوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پاکستانی فوجی سے بات کرتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ میجر احتشام نے واپس اپنے یونٹ پہنچ کر اپنے جوانوں کو ساری تفصیل بتائی اور کہا کہ ڈپٹی کمشنر کو ہر صورت تلاش کرنا ہے۔ چند جوانوں سے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ڈپٹی کمشنر کی تلاش شروع کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ پڑوسیوں کو ضرور کچھ نہ کچھ معلوم ہوگا وہ پاکستانی فوجیوں کو بتانے سے گریز کر رہے ہیں۔ چنانچہ ڈپٹی کمشنر کے ماتحت کام کرنے والے ایک بنگالی کا پتہ تلاش کیا گیا اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ ایک بنگالی کے گھر میں ڈپٹی کمشنر کو چھپایا گیا ہے تاکہ مکتی باہنی والے مار نہ دیں فوجیوں نے میجر احتشام کو یہ معلومات فراہم کیں تو وہ خود اس بنگالی کے گھر پہنچے اور ڈپٹی کمشنر کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتا دیا کہ وہ اس کے گھر میں پناہ لئے ہوئے ہیں اور میجر احتشام کو لیکر اپنے گھر کے صحن میں گیا۔ وہاں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنی ہوئی تھی

فوجی اور مغربی پاکستانی ڈھاکا روانگی کے حکم کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے

جس میں اس بنگالی نے مرغیاں پالی ہوئی تھی۔ اس نے کوٹھی کا دروازہ کھول کر آواز دے کر ڈپٹی کمشنر کو بتایا کہ میجر احتشام آئے ہیں آپ بے خوف ہو کر باہر آ جائیں۔ ڈپٹی کمشنر نے میجر احتشام کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور کہا کہ وہ سخت کرب میں مبتلا تھے کہ ان کا کیا حشر ہوگا اگر اس بنگالی نے ان کو مکتی باہنی کے حوالے کر دیا یا مکتی باہنی نے خود گھر کی تلاشی لیکر انہیں باہر نکال لیا تو موت یقینی تھی۔

میجر احتشام نے ڈپٹی کمشنر سے پوچھا کہ انہیں وہ جملہ یاد ہے جو انہوں نے بنگالیوں کے بارے میں کہا تھا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ

نہیں بٹھا سکتے اور ہاتھ بھی نہیں ملا سکتے کیونکہ ان سے مچھلی کی بو آتی ہے۔ آج وہ مرغیوں کے ساتھ کوٹھری میں چھپے ہوئے ہیں تو کیا انہیں مرغیوں کی بو نہیں آ رہی؟ ڈپٹی کمشنر نے شرمندگی سے نظریں جھکا کر کہا کہ وہ غلطی پر تھے اللہ انہیں معاف فرمائے۔ میجر احتشام نے ان کو اپنی یونٹ میں لے جا کر کہا کہ وہ جلدی نہا دھو کر اور کھانا وغیرہ کھا کر تیار ہو جائیں کیونکہ کسی وقت بھی ان کی یونٹ کو اچانک ڈھاکہ روانگی کے احکامات مل سکتے ہیں۔ اس وقت ان کی یونٹ میں مختلف محکموں میں کام کرنے والے مغربی پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور سب کے سب بے چینی سے ڈھاکہ روانگی کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ (جاری ہے) ❁

میں ''شاپنگ'' کہاں۔ کیسے اور کیوں کرتی ہوں؟... دلچسپ آپ بیتیاں

اُردو کی پرانی۔ نئی بستیوں میں یہ تو اعتراف کیا جا رہا ہے کہ ماہنامہ 'اطراف' نے اُردو میگزینی صحافت میں نئے نئے موضوعات پر لکھنے والوں سے گزارش کرکے ایسے ایسے قلم پارے قارئین کو پیش کیے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی میرے دل میں تھا۔ پاکستان کے ساتھ بیرون ملک اور خاص طور پر بھارت سے بھی ہمیں بڑی خرد افروز تحریریں ملتی ہیں۔ اس طرح 'اطراف' اپنے تہذیب و تمدن کی بقا۔ اپنی اقدار کی پاسداری میں ایک تواتر سے مصروف ہے۔ 'شہر کی معیشت' پر جب بات ہونا ہے تو ہم نے 'اطراف' کی قلمی معاون خواتین سے درخواست کی کہ وہ بتائیں شاپنگ کہاں کیسے کیوں کرتی ہیں۔ قیمت کتنی کم کرواتی ہیں۔ بہت خلوص سے مزے مزے کی تحریریں۔ سب نے اپنی شاپنگ کی مہارت اور رولز بھی بتائے ہیں۔ ان میں ممتاز شاعرات بھی ہیں۔ افسانہ نگار۔ ناول نویس۔ صحافی۔ نقاد۔ اور طالب علم بھی۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

لاہور کے بازار۔ روایت۔ تہذیب۔ اور ہُنر کی میراث۔ ساڑھیاں۔ ہاتھ کی بنی ہوئی جیولری شاہ عالم مارکیٹ سے

اطراف کی قلمی سرپرست مریم ارشد کی تحریر

محمود شام صاحب نے اطراف کے لیے ملکی معاشی بدحالی اور خرید و فروخت کے حوالے سے مضمون تحریر کرنے کو کہا۔ اس حساس موضوع پر لکھنے کے لیے جب سوچنے بیٹھے تو معلوم ہوا کہ پاکستان کی معیشت بُری طرح سے کریش ہو چکی ہے۔ نجانے کب سے ہم دیوالیہ ہوئے پھرتے ہیں۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ جو ملک اخلاقیات میں تباہ ہو چکا ہو وہاں کی معیشت اگر بہترین ہو بھی تو زوال تو آ کر ہی رہے گا۔ شاپنگ سے پہلے تو پیٹ کا دوزخ بھرنے کی طرف توجہ کرنی ہوگی۔ مفلسوں کے بچے اپنی پانچویں سالگرہ منانے سے پہلے ہی اس دُنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ باقی زندگی جن کو سنبھال لیتی ہے وہ بھی بس رُل کھُل کے پل ہی جاتے ہیں۔ لاہور پاکستان کا دوسرا بڑا کاروباری مرکز ہے۔ کوٹ لکھپت اور سُندر انڈسٹریل ایسٹیٹ میں بہت سی نئی فیکٹریاں لگائی گئی ہیں۔ لاہور سوفٹ ویئر کی پروڈکشن میں پاکستان کا بڑا مرکز ہے۔ ہاتھ کھڈی پر بنائے گئے قالینوں کا بھی بڑا مرکز اسی شہر میں ہے۔ قالین بافی کے کاری گر مختلف قسم کے نمونے جیسے امبیاں، جیومٹریکل یعنی چوکور، مثلث، مستطیل وغیرہ کے ساتھ ساتھ پھُول بوٹے بھی کاڑھتے ہیں۔ مگر اب یہ صنعت و حرفت بھی کافی حد تک زوال کا شکار ہو چکی ہے۔ لاہور میں بہت سے جدید شاپنگ مال بھی بن چکے ہیں جہاں متوسط طبقہ تو بس تفریح کے لیے ایک آدھی چیز تو خرید سکتا ہے مگر اس کی جیب عیاشی کی اجازت نہیں دیتی۔ پر کیا کیا جائے تمناؤں اور خواہشات کا جو بن بلائے مہمانوں کی طرح دل میں وارد ہوتی ہیں نا

صرف یہ بلکہ وہاں سے نکلنے کا نام بھی نہیں لیتیں۔ ایسے میں لوگوں کو انار کلی بازار، اچھرہ بازار، شاہ عالمی مارکیٹ، گُمٹی بازار، کشمیری بازار، اعظم مارکیٹ اور کئی ایسے نام یاد آتے ہیں۔ آج بھی عورتیں وہاں شاپنگ کرتے ہوئے بھاؤ تاؤ کا لُطف اُٹھاتی ہیں۔ چلیے! تھوڑا سا ان بازاروں کے بارے میں جان کاری حاصل کرتے ہیں۔

انارکلی بازار: یہ ایشیا کا وہ تاریخی بازار ہے جو 200 سال پُرانا ہے۔ مشہور ہے کہ مغل بادشاہ اکبر کے دربار کی ایک کنیز (طوائف) اپنے حُسن کی وجہ سے انارکلی کہلائی۔ اکبر کے بیٹے شہزادے سلیم کو اس سے محبت ہو گئی جو ازاں بعد جہانگیر بادشاہ بنا۔ اکبر نے انارکلی کو زندہ دیوار میں چُنوا دیا۔ اس کا مزار اس بازار کے قرب میں ہونے کی بنا پر یہ انار کلی بازار مشہور ہے۔ اس کے اندر چھوٹی چھوٹی دُکانوں پر مشتمل گلیاں بانو بازار، دھنی رام روڈ، جان محمد روڈ، پیسہ اخبار، اکبری روڈ، اُردو بازار اور پان گلی وغیرہ شاپنگ کے لیے مشہور ہیں۔ مملوک سلطنت کے سلطان قطب الدین ایبک کا مزار بھی دھنی رام روڈ پر واقع ہے۔

شاہ عالمی مارکیٹ: اورنگ زیب کے بیٹے مغل بادشاہ شاہ عالم کے نام پر شاہ عالم گیٹ اور بازار کا نام رکھا گیا۔ یہ لاہور کی تھوک کی سب سے بڑی مارکیٹ ہے۔ اس سے جُڑے 25 بازار ہیں جن میں رنگ محل، پاپڑ منڈی، صرافہ بازار، کیسرا بازار، موتی بازار، کناری بازار اور بے شمار نام۔ اندر ہی اندر ہر بازار ایک موڑ مڑتا ہے اور نئی دُکانیں سجی ہوئی خریداروں کی منتظر نظر آتی ہیں۔ وہیں دُکان دار ہانک لگاتے ہیں: "آیئے باجی! دیکھ لیں کیا چاہیے؟ ساڑھیاں، لہنگے، بیل باٹم جدید ڈیزائن کے ساتھ دستیاب ہیں"۔ شاہ عالمی میں شلوار قمیضوں کی روایتی بوتیک اور ساڑھیوں کی شاندار دکانیں مناسب داموں پر مل جاتی ہیں۔ ہاتھ کی بنی ہوئی جیولری لڑکیاں شوق سے یہاں سے خریدتی ہیں۔ غرض یہ کہ شاہ عالمی مارکیٹ ورثے کی وہ عملی تہذیب ہے جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ بس دقت تو یہ کہ اب لاہور کی سڑکوں اور بازاروں میں خوفناک حد تک ہجوم بڑھ جانے کی وجہ سے ان سب جگہوں پر جانا خاصا دشوار ہو گیا ہے۔ اسی واسطے بہت سی خواتین اچھرہ بازار جاتی ہیں جہاں تک رسائی قدرے آسان ہے۔

میں ''شاپنگ'' کہاں۔ کیسے اور کیوں کرتی ہوں؟

یوں تو میں شاپنگ کی دلدادہ نہیں ہوں۔ بس یوں کہہ لیں کہ عید، تہوار یا شادی بیاہ کے مواقع پر شاپنگ ضرور کر لیتی ہوں۔ میری چند مخصوص دُکانیں ہیں جیسے شادیوں کے موقع پر مَیں مال روڈ پر واقع برکت علی ساڑھی والے کے پاس ضرور جاتی ہوں۔ روٹین کی شاپنگ مَیں گلبرگ میں بلیووارڈ لاہور سینٹر میں دو تین دُکانوں پر جاتی ہوں لیکن اب شاپنگ کرنا مانو تو جیسے دودھ کی نہر کھودنے کے مترادف ہے۔ مہنگائی ہے کہ پَر لگائے ہوئے ہے جو چیز پچھلے برس ہزار روپے کی تھی اب دو ہزار میں مل رہی ہے۔ دس سے بارہ ہزار آنے لگا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں جھوٹ، سچ، روشنی یا اندھیرا کہاں دکھائی دے گا۔ بس بلک بلک کر سب رَبّ سے اپنی دُنیا سنوارنے کی دُعائیں مانگیں گے۔ لاہور میں مشہور ڈیپارٹمنٹل سٹورز پر اتنا زیادہ جنرل سیلز ٹیکس لیا جاتا ہے کہ اگر کبھی غلطی سے وہاں سے شاپنگ کر لوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے خواہ مخواہ ڈبل ڈبل ٹیکس بھرا۔ چوں کہ ہمارا کاروبار اُردو بازار میں ہے لہٰذا میرے میاں بیشتر مصالحہ جات اور دالیں اکبری منڈی سے خریدتے ہیں جو گلبرگ کے بڑے سٹورز سے کہیں زیادہ بہتر اور قدرے کم قیمت پر ملتے ہیں۔ افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ آخر کو بڑے دُکان دار کیوں اتنا منافع بنانا چاہتے ہیں۔ کب سے یہ خبریں زبانِ زدِ عام ہے کہ پاکستان دیوالیہ ہونے والا ہے۔۔۔ دیوالیہ ہو چکا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سچ ہے کہ ہم دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ وہ اس طرح کہ

کسی بھی سوسائٹی میں جب اخلاقیات کا زوال ہوگا تو آپ زندگی کے ہر شعبے میں دیوالیہ ہی ہوں گے۔ ایمان داری اور محنت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ معاشروں میں جب دونوں چیزوں کا فقدان ہوگا تو ترقی خاک ہوگی۔ بات نکلتے نکلتے اپنے موضوع سے ہٹ جاتی ہے۔ یعنی ہم ریڑھی بان سے پھل یا سبزی خریدتے ہوئے تو خوب بھاؤ تاؤ کرتے ہوئے اُسے کھری کھری سُنا بھی دیتے ہیں مگر بڑے اور جدید سٹورز پر ہم چُپ سادھے رہتے ہیں۔ عوام کی قوتِ خرید کم ہو چکی ہے۔ جتنی رقم میں پچھلے سال دو یا تین چیزیں آتی تھیں اب ایک ملتی ہے۔ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں اکثریت غریب لوگوں کی ہے۔ اس سلسلے میں مَیں نے اپنی کام کرنے والیوں سے پوچھا تو کہنے لگیں "باجی آپ تو اخبار میں لکھتی ہیں۔ آپ کو تو پہنچ ہوگی مریم نواز تک ہمیں ذرا پوچھ کر بتا دیں کہ پانچ سو روپے والا لان کا سُوٹ کیا اچھرے سے مل جاتا ہے۔" اب میں اس بات کا ان غریبنیوں کو کیا جواب دوں۔ آن لائن شاپنگ ایک انوکھا تجربہ ہے۔ ہم نے اس کو بھی تختۂ مشق بنایا۔ مگر اس میں دھوکہ زیادہ ہے۔ لہٰذا صرف وہی برانڈ منگوانے چاہئیں جو اپنی ایک ساکھ رکھتے ہوں۔ اس موضوع پر تو بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر اختتام اس بات پر کرتی ہوں کہ شاپنگ جو کسی زمانے میں ایک عیاشی ہوا کرتی تھی اب جوئے شیر لانے کے مترادف ہو چکی ہے۔ خدا کرے میرے وطن کا ہر شہر اور اس کی گلیاں اور بازار بارونق اور قائم و دائم رہیں۔ آمین۔

پرانے بازاروں میں جانا اچھا لگتا ہے۔ ہر مہینے ایمپریس مارکیٹ ضرور جانا ہوتا ہے کسی مال سے شاپنگ کا شوق نہیں

سینئر صحافی مصنفہ شہناز احد کے قلم سے

شاپنگ کا اپنا ایک جادو ہوتا ہے جو عمر کے ہر حصے میں ایک الگ انداز سے سر چڑھ کے بولتا ہے۔ جب بچے ہوتے تھے تو امی کے ساتھ سال کے سال جوتے پہننے صدر آتے تھے اور میں تو کیونکہ گیارہ بارہ سال کی عمر ہی میں جتنی لمبی آج ہوں اتنی قد آور ہو چکی تھی اور میری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت میرے ناپ کا جوتا ہوتا تھا۔ جو بہت مشکل سے اس وقت کی ایلفیسٹن اسٹریٹ کی دکانوں سے ملتا تھا۔ اس کے لئے جو خواری ہوتی تھی اور امی کی جو ڈانٹ ہر دکان سے نکلنے کے بعد سننے کو ملتی تھی۔ وہ جوتا پہننے کا سارا مزا کرکرا کر دیتی تھی۔

ایک عمر تک بازار جانا مجھے بہت ناپسندیدہ عمل لگتا تھا۔

پھر یونیورسٹی آ گئی تو دوستوں کے ساتھ بازار جانا چھوٹی چھوٹی خریداری کرنا اچھا لگنے لگا۔

ایک وقت یہ بھی تھا کہ کسی دوست کو اگر اینکر دھاگے کی ایک لچھی لینی ہوتی تھی تو ہمارا پورا گینگ بوہری بازار آتا تھا۔ گھنٹوں اس کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے، چاٹ کھاتے، دھاگے کی لچھی خریدتے اور گھروں کو لوٹ جاتے۔

میرے خیال میں یہ ہر عمر کا ایک فسوں ہوتا ہے۔

عملی زندگی میں قدم رکھا تو سب اِدھر اُدھر بکھر گئی اور بوہری بازار کی گلیوں سے وحشت ہونے لگی۔

زندگی سرپٹ دوڑنے لگی۔ بازار ایک ضرورت بن گیا۔ اس ضرورت کی تکمیل مختلف علاقوں کے مختلف بازاروں سے ہونے لگی۔ جیسے ماہ میں ایک بار جمعہ بازار یا اتوار بازار جانا۔ بہت مزا آتا تھا۔ اکثر و بیشتر امی کو بھی وہیل چیئر پر لے جاتی اور وہ بہت خوش ہوتیں۔ وہاں سے روزانہ استعمال کی بہت چیزیں اچھی قیمت پر مل جاتی تھیں۔ اور پانچ دس ملنے جلنے والے بھی مل جاتے تھے۔ ایک طرح کی تفریح ہوتی تھی کیونکہ ڈرائیور، گھر میں کام کرنے والی لڑکیوں، عورتوں سمیت سب جاتے، خرید و فروخت کرتے پھر سب مل کے کچھ نہ کچھ کھاتے۔

پتہ نہیں اچھا ہے یا برا لیکن میں نے ہر قسم کی خرید و فروخت کی ہے۔ گاڑی سے لے کر، کپڑا ہر قسم کا، فرنیچر ہر نوعیت کا، برتن بھانڈے، زیور گہنا، جوتا چپل، گوشت مرغی، سبزی، دال چاول، پھل پھلواری۔۔۔ دوا دارو، زندگی کی ہر ضرورت کی خریداری کی ہے اور الحمدللہ اب بھی کرتی ہوں۔

اب کے بازاروں اور شاپنگ کے مقامات میں بے تحاشہ اضافہ

میں ''شاپنگ'' کہاں۔ کیسے اور کیوں کرتی ہوں؟

ہو چکا ہے۔ مجھے ابھی بھی پرانے بازاروں میں جانا اچھا لگتا ہے۔ میں ابھی بھی ایک ماہ میں ایک سے دو دفعہ ایمپریس مارکیٹ جاتی ہوں۔ شہر میں کھلنے والے تمام اسٹورز کو آزمانے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جتنی اچھی دالیں اور چاول وہاں ملتے ہیں۔ وہ کسی اسٹور پر دستیاب نہیں۔ سبزی بھی جتنی تازہ اور اقسام کی وہاں ملتی ہے اس کا کوئی متبادل نہیں۔ ایک وقت سبزی پھل دہلی کا لونی کے بازار سے بھی لیتی تھی لیکن وہاں منافع کا حساب کسی شمار میں نہیں آتا۔ البتہ گوشت ہر قسم کا ابھی بھی وہیں سے آتا ہے۔ بہت پرانا سلسلہ ہے۔ اب تو صرف فون پر بتا دیتی ہوں ایک گھنٹے بعد ڈرائیور لے آتا ہے۔

مال سے شاپنگ کرنے کا شوق بالکل نہیں ہے۔ سال دو سال میں چکر لگا لیتی ہوں۔ ایک ایک دکان کے لئے اتنا چلنا پڑتا ہے۔ پھر وہ ہی سب کچھ انفرادی دکانوں میں مل جاتا ہے تو میں کیوں اپنی کمر کا خاتمہ کروں۔ بہت سارے برانڈ ہیں جن کے آؤٹ لیٹ عام بازار میں ہوتے ہیں۔

جب مال فیشن نیا نیا آیا تھا تو بہت جانا ہوتا تھا۔

شاپنگ میں قیمت کم کروانے کا وقت اب ختم ہو چکا ہے۔ ہر شے پر اس کی قیمت لگی ہوتی ہے۔ رہ گئی بے چارے چھوٹے ونڈر زتو ان سے کیا کم کروانا۔ وہ تو اپنی بقا کے لئے کام کر رہے ہوتے ہیں ان سے چند روپے کے لئے بحث کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

ایک وقت تھا اس بات میں بہت مزا آتا تھا۔ چار سو کی چیز کو جب تنک ڈیڑھ سو تک نہ لاتی خریدتی نہیں تھی۔ اصل میں شاپنگ کی ساری سائنس ہی بدل گئی ہے۔

آن لائن بھی کر لیتی ہوں لیکن صرف ان اشیاء کی جن کی ادائیگی وصولی کے وقت کرنی ہوتی ہے۔ ابھی چند دن پہلے میں نے دیسی گھی، مرچوں کی چٹنی، کشن کور، اور ایسی روز مرہ ضروریات کی کئی اشیاء خریدی ہیں۔

اصل میں ہماری امی کا ذوق اور چیز کی پہچان بہت اعلیٰ تھی۔ ہم نے ان سے بہت سیکھا ہے۔ کہاں کیا اچھا ملتا ہے کتنی قیمت درست ہوگی یہ سب ان کا سکھایا ہوا ہے۔

پاکستانی کپڑا دنیا میں بہترین معیاری۔ پہلے عید بقرعید۔ اب تو ہر روز نیا لباس۔ نئے جوتے۔ میچنگ کے پرس

افسانہ نگار رہا بیگ کا اظہاریہ

خواتین کے بس زندگی میں کچھ ہی شوق ہیں جن میں شاپنگ سرفہرست ہے۔ رنگ برنگ اشیا سے سجی دکانیں اور شاپنگ مال۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نا کچھ بلکہ کافی کچھ خرید لیا جاتا ہے اس کے بعد ان کے چہرے کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ پاکستان کا بنا ہوا کپڑا دنیا میں بہترین کوالٹی کا ہوتا ہے حتیٰ کہ ڈینم کی جینز اور گرم کپڑے بھی زیادہ تر فیصل آباد اور لاہور میں بنتے ہیں پھر باہر جا کر ان پر مہر وہاں کی لگتی ہے۔ گرمیوں کی بہار لان اس جیسا کپڑا کہیں نہیں بنتا۔ اسی طرح جوتے اور کھیلوں کا سامان۔ پھر کیوں نہ دل للچائے۔ ڈیزائنرز ان کی خوبصورتی میں مزید چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ہمارا وقت زیادہ پرانا ہے جب صرف عید اور بقرعید پر نئے کپڑے اور جوتے بنتے تھے اب تو روز نیا لباس جوتے اور میچنگ کے پرس۔ زیور بھی تو شوکیس سے پکارتا ہے ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ میرے دیس کی ہر چیز لاجواب ہے اللہ تعالیٰ نے بے حساب ہمیں نوازا ہے۔ ایسے ایسے قیمتی جواہرات جو کسی جگہ نہیں ملتے۔ مزے کی ایک اور بات اصلی کے ساتھ نقلی بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ہر طبقے کی خواتین اپنا شوق پورا کر لیتی ہیں اور بارگیننگ کا بھی اپنا مزا ہے۔ دکاندار خریدار کو دیکھ کر قیمت بتاتے ہیں کہ یہ کسٹمر کتنی بحث کر سکتا ہے۔

میرے ساتھ دوسرا مسئلہ ہے میں ان سب چیزوں سے بہت دور ہوں۔ چادر دیکھ کر پاؤں سکیڑ لیتی ہوں کام چونکہ لڑکیوں کو سلائی سکھانے کا ہے اس لیے سامان تو لینا ہوتا ہے۔ پشاور جیسی جگہ جہاں کپڑے کی بے تحاشہ ورائٹی ہے اور بہت سستا ہے وہاں بھی میں پہلی دکان پر کھڑی ہو کر تھان اٹھالیتی ہوں اور کراچی میں بھی میری پسندیدہ جگہ بچت بازار ہیں ہفتہ بازار اتوار بازار جمعہ بازار یقین کیجئے بہترین سامان مناسب قیمت پر مل جاتا ہے۔ پھر آن لائن زندہ باد۔ گھر بیٹھے جو چاہئے وہ حاضر پھر دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے۔

ایک بار پہن کر خواتین اپنے کپڑے ماسیوں کو دے دیتی ہیں اور وہ کپڑے بازار میں بکنے کے لیے آجاتے ہیں۔ دس ہزار کا سوٹ چار سو میں کیا برا ہے۔ ویسے بھی بوتیک پر لٹکے ہوئے ہینگروں پر کپڑے کس کس نے ٹرائی نہیں کیے ہونگے۔

معیشت کا پہیہ نہیں رکنا چاہئے باہر کے سامان پر جب سے پابندی لگی ہے۔ سامان تو مل جاتا ہے جن میں کاسمیٹکس اور دوائیں سرفہرست ہیں جبکہ آپ کی چیزیں بھی مزید نئی اور رنگ برنگ ہوتی جا رہی ہیں۔ ماڈلز اور اپنی سہیلیوں کو دیکھ دیکھ کر دل للچاتا ہے یہ بھی لے لو اور وہ بھی۔ اور اگر لے لیا تو گھر کا بجٹ آؤٹ اور نا لیا تو موڈ خراب غصہ بچوں اور شوہروں پر۔ کیوں نا پہلے ضروریات کی فہرست بنالی جائے۔ یعنی ضروریات زندگی کھانا پینا پھر اپنے لیے کچھ نا کچھ پس انداز کر لیں۔ اور تھوڑی سی تبدیلی کر کے پرانے کپڑوں کو نیا کیا جا سکتا ہے۔ خواتین اچھے سے اچھا ڈیزائن بنا سکتی ہیں۔ کانٹ چھانٹ کر کے۔ مالز میں جانا کس کو پسند نہیں۔ پیسے میں بھی کم نہیں کرواتی ہاں اگر بل 420 ہو تو 20 روپے پر جھگڑا ضرور ہوتا ہے۔ باقی سب چلتا ہے بس اپنی نظر اور پیر زمین پر ہونے چاہئیں۔

گھر سے نکلنے سے پہلے فہرست بنالیں۔ مشترکہ خریداری میں بچت ممکن۔ آن لائن خریداری بہت احتیاط اور غور کے بعد

اُردو کی ممتاز نقاد قرۃ العین طارق سیالکوٹ سے

خواتین کے پسندیدہ مشاغل میں سے ایک اہم ترین مشغلہ شاپنگ یا خریداری قرار دی جاتی ہے۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر خاتون خانہ کا مزاج اچھا کرنا ہو تو انھیں خریداری کرنے بھیج دیا جائے۔ جب وہ خریداری کر کے آتی ہیں تو نہ صرف پہلے سے زیادہ پرسکون محسوس ہوتی ہیں بلکہ زیادہ مستعدی سے گھر کے کاموں کو سرانجام دیتی ہیں۔

آخر شاپنگ یا خریداری میں ایسا کیا راز چھپا ہوتا ہے۔ ماہرین کے خیال میں خریداری کرنے کا عمل سیر و سیاحت کی طرح دلچسپ اور تفریح سے بھرپور ہوتا ہے۔ یہ گھر کے روزمرہ معمول اور یکسانیت سے نکال کر ماحول کو تبدیل کرنے، ذہنی دباؤ کو کم کرنے اور مزاج کو خوشگوار بنانے میں مدد دیتی ہے۔ اکثر خواتین غول کی شکل میں، اپنی سہیلی یا کزن کے ساتھ جاتی ہیں تاکہ ان کو ہمراہی کے ساتھ مفید مشورے بھی مل سکیں۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ ایک آرٹ یا ہنر بھی ہے جو ہر عورت میں نہیں ہوتا۔ اس کے اسرار و رموز سیکھنے اور استعمال کے لیے باقاعدگی اور پریکٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔

خریداری کرنے کے زریں اصول:

- گھر سے نکلنے سے پہلے تمام اشیاء کی فہرست بنالیں تاکہ اسی کے مطابق خریداری کی جاسکے اور فضول خرچی نہ ہو۔
- ان بازاروں کا انتخاب کریں جہاں دکانوں کی کثیر تعداد کے ساتھ مناسب قیمت میں چیزیں فروخت کی جاتی ہوں تاکہ بھاؤ تاؤ کرنے میں آسانی ہو سکے۔
- ان اوقات میں خریداری کے لیے جائیں جب رش کم ہوتا کہ کسی ناخوشگوار واقعے کا شکار نہ ہو سکیں۔
- کپڑے، جوتے، کچن کی ضروری اشیاء، جیولری اور بچوں کے ملبوسات کی خریداری کرتے ہوئے بتائی گئی قیمت سے آدھی قیمت لگائیں۔ پہلے تو دکاندار آپ کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھے گا لیکن آپ اصرار کرتے رہیں تو اس کی خفگی کے ساتھ قیمت بھی آہستہ آہستہ نیچے آتی جائے گی۔
- اپنی مقرر کردہ قیمت پر قائم رہیے ورنہ آپ دکاندار کی لاچاری دیکھ کر اس کی بتائی ہوئی قیمت ادا کر سکتے ہیں۔
- اکثر خواتین، غیر مطمئن ہو کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ یہ عمل دکاندار کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ ان کی مطلوبہ قیمت پر راضی ہو جاتا ہے۔ یہی خریداری کا اہم گر ہے۔ اگر آپ اس میں ماہر ہو گئے تو گویا آپ اس کے اسرار و رموز اچھی طرح سمجھ گئے۔
- غریب و نادار دکاندار جو عموماً چھوٹے اسٹال یا پیدل اشیاء فروخت کرنے والوں سے دام کم نہ کروائیں۔ اس عمل سے ان کی مدد بھی ہوگی اور آپ کے جذبہ ایثار کو بھی تقویت ملے گی۔
- خریداری کرتے ہوئے چیزوں کا موازنہ ضرور کریں۔ آپ کی مطلوبہ چیز ایک جگہ مہنگی مل رہی ہے تو دوسری دکانوں کا بھی سروے کریں تاکہ مناسب قیمت میں چیز خریدی جاسکے۔ اس طرح آپ

زیادہ قیمت دینے سے بچیں گے اور بچت بھی ہوگی جس کا فائدہ دیرپا ہوگا۔

- خریداری کے لیے اشیاء کی جانچ کرنے کے طریقوں سے آگاہی نہایت ضروری ہے کیونکہ بعض دفعہ غیر معیاری اور ناقص میٹریل بھی فروخت کیا جاتا ہے جس کی پہچان ہونا بہت اہم ہے۔ بعض اوقات سیل کے نام پر بھی غیر معیاری اشیاء فروخت کر دی جاتی ہیں۔ اگر کسی چیز کی قیمت، پہلی قیمت سے ۶۰ سے ۷۰ فیصد کم ہے تو یقیناً اس چیز کی ڈیمانڈ نہیں ہے یا اس میں کوئی نقص ہے۔ اسی صورت میں جلد بازی نہ کریں اور محتاط رہیں۔
- ادھار یا قسطوں پر خریداری کرنے سے گریز کریں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح بچت ہوگی لیکن ایسا نہیں ہے۔ قسطوں پر بیچی جانے والی اشیاء کی 30 سے 40 فیصد قیمت زیادہ رکھی جاتی ہے۔ بظاہر ہر ماہ ایک مخصوص رقم ادا کرنی ہوتی ہے جو آخر میں جا کر اصل قیمت سے زیادہ ہی پڑ جاتی ہے اور قسط کی ادائیگی کی تلوار بھی لٹکتی رہتی ہے۔ ایسی صورت میں بہتر یہی ہوتا ہے کہ انتہائی ضرورت کے تحت کسی قریبی دوست یا رشتہ دار سے ادھار لے کر پوری قیمت ادا کر دی جائے۔
- مشترکہ خریداری، جس میں رقم اکٹھی کر کے ہول سیل نرخوں پر مطلوبہ اشیاء کی خریداری کی جاسکتی ہے۔ ان میں اشیائے خورد و نوش، بچوں کی چیزیں (کپڑے، اسکول میں استعمال کی اشیاء)، گھر کی آرائش کا سامان وغیرہ شامل ہیں۔ مشترکہ خریداری کی صورت میں خواتین بچت بھی کر سکتی ہیں اور رعایت بھی حاصل کر لیتی ہیں۔

آن لائن خریداری کے اصول:

آن لائن خریداری، جدید دور میں فروغ پانے والا طریقہ اور انٹرنیٹ کے استعمال سے مربوط عمل ہے۔ کچھ دہائیوں قبل آن لائن شاپنگ ایک انوکھی بات سمجھی جاتی تھی ایک زمانے میں لوگ ایسی اشیاء آن لائن خریدتے تھے جو مشکل سے دستیاب ہوتی یا آپ کے علاقے اور

میں ''شاپنگ'' کہاں۔ کیسے اور کیوں کرتی ہوں؟

ملک میں موجود نہیں ہوتیں۔ پہلے پہل اسے بزرگ اور معذور افراد کی سہولت کے لیے ایک سماجی خدمت کے طور پر سرانجام دیا جاتا تھا۔ جدید ٹیکنالوجی کے تحت ایمیزوں جیسی کمپنیوں کے قیام نے آن لائن خریداری میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا اور نئی سہولیات کو متعارف بھی کرایا۔ اگرچہ امریکہ، برطانیہ، چین جیسے ترقی یافتہ ممالک میں یہ کئی عشروں سے رائج العمل ہیں لیکن کورنا کے ادوار میں اس کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ عہد حاضر میں یہ ہماری زندگیوں کا لازمی جز بن گئی ہے۔ آن لائن خریداری کے لیے ضروری عوامل اور طریقہ کار کو اختیار کرنا نہایت اہم ہے۔

آن لائن خریداری کے لیے انٹرنیٹ پر مطلوبہ اشیاء کے بارے میں معلومات اکٹھی کی جاتی۔ مختلف برانڈز اور کمپنیوں کی جانچ کے ساتھ قیمت کے فرق کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ تاہم اگر ویب سائٹ پر کمپنی نئی اور غیر معروف ہے تو چھان بین کے بعد ہی مطلوبہ چیز خریدیں۔ اگر کمپنی یا برانڈ نیا ہے تو بہتر یہی ہے کہ ان کی ویب سائٹ پر لکھے نمبرز، ای میل ایڈریس اور خرید و واپسی کے متعلق دی گئی معلومات کا بغور مطالعہ کریں اور دیئے گئے نمبرز پر بھی رابطہ کر کے معلوم کر لیں تا کہ کسی نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔

آن لائن خریداری کرنے سے پہلے متعلقہ کمپنی یا اسٹور کی ساکھ کی معلومات کے لیے دوسرے خریداروں کی رائے اور تبصرے پڑھے جائیں۔ ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ متعلقہ کمپنی کے ساتھ خریداری کا تجربہ کیسا رہا ہے۔ ویب سائٹ پر رائے یا تبصرے کا نہ ہونا کسی کمپنی کے ناقابل اعتبار ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اگر کسی کمپنی کے متعلق صرف مثبت رائے ہی دستیاب ہوں تو بھی ہوشیار ہو جائیں۔ اس طرح آپ کسی متوقع نقصان سے محفوظ رہیں گے۔

اگر کسی کمپنی یا برانڈ نے ناقابل یقین حد تک قیمتوں میں کمی دکھائی ہے تو ہوشیار رہیں کیونکہ مارکیٹ سے کم قیمت میں فروخت کرنے کا دعوی فراڈ بھی ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اشیاء ناقص اور غیر معیاری بھی ہو سکتی ہیں۔

آن لائن خریداری میں اپنی مطلوبہ چیز کا آرڈر دیتے ہوئے صرف ضروری معلومات کا ہی اندراج کریں جس میں آپ کا نام، مکمل پتہ، فون نمبر اور ای میل ایڈریس شامل ہیں۔ اگر کوئی کمپنی آپ کا بینک اکاؤنٹ یا دیگر ذاتی معلومات کا مطالبہ کرے تو ہرگز نہ دیں اور محتاط رہیں۔ کوشش کریں کہ ڈلیوری کے وقت ہی رقم کی ادائیگی کریں تا کہ چیز آپ کے پاس پہنچ جائے اور ادائیگی کر کے اس کے انتظار کی کوفت یا پریشانی سے بچ جائیں۔

خریداری یا شاپنگ ایک دلچسپ اور تفریح سے بھرپور عمل ہوتا ہے جو آپ کی شخصی خوبیوں اور ذہنی صلاحیتوں کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ خود اعتمادی اور فیصلے کی صلاحیت پیدا کر کے طرز زندگی کو بہتر بنانا۔ گفتگو اور معاملات کی جانچ کرنے میں مدد دینا۔ معاونت اور ایک دوسرے سے روابط میں فروغ کے ساتھ معاملہ فہمی اور دانش مندی بیدار کرتا ہے۔

انجم عثمان۔ کراچی

شاپنگ مال کو ترجیح دیتی ہوں۔ آن لائن شاپنگ کے خطرات ہیں۔

سینئر شاعرہ انجم عثمان کا اختصاریہ

میں عموماً شاپنگ مال سے شاپنگ کو ترجیح دیتی ہوں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ایک ہی جگہ پر مختلف اقسام کی اشیاء دستیاب ہوتی ہیں جن کے لئے اگر مختلف دکانوں کا رُخ کروں تو بہت وقت درکار ہوگا اور تھکن بھی زیادہ ہوگی۔ مجھے برانڈز وغیرہ کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ اس لئے میرا مال جانے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہاں بڑے بڑے برانڈز کے outlets ہوتے ہیں۔ کوئی بھی اچھی چیز جو مناسب قیمت پر مل رہی ہو وہ میں خرید لیتی ہوں۔ جہاں تک قیمت کم کرانے کا معاملہ ہے تو میرا خیال ہے کہ یہ رجحان تو خواتین میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ میری بھی کوشش ہوتی ہے کہ دکاندار قیمت کم کر دے۔ البتہ جہاں قیمتوں کے ٹیگز لگے ہوئے ہوں اور صرف مقررہ قیمت پر ہی اشیاء دستیاب ہوں وہاں یہ پریکٹس نہیں چل سکتی۔ جہاں تک آن لائن شاپنگ کا تعلق ہے تو آج کل اس طرح کی خریداری کا رجحان بہت زیادہ ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس رجحان میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ سہولت ہے کہ گھر بیٹھے ہی آپ کو آپ کی مطلوبہ اشیاء آسانی سے مل جاتی ہیں۔ دوسری وجہ وقت کی اور بازاروں میں پھرنے کی زحمت سے بچت ہے۔ لیکن اس میں risk factor بہرحال موجود ہے۔ کبھی کبھی جو چیز آپ کو جیسی دکھائی یا بتائی گئی ہے، وہ ویسی نہیں ہوتی اور مطلوبہ یا بتائے گئے معیار سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کہنے کو تو refund & exchange policy بھی ہوتی ہے لیکن وہ اس قدر پیچیدہ ہوتی ہے کہ اکثر تنگ آ کر خریدار دھوکہ ہونے کی صورت میں عموماً رو پیٹ کر بالآخر صبر ہی کر لیتے ہیں۔

غزالہ خالد۔ کراچی

صوفی جی کی دکان میں سب کچھ مل جاتا تھا۔ ہر شہر کے بازار دیکھنے کا شوق۔ کراچی کے بازار بھی طبقاتی تفریق کا شکار

'اَن کہی' کی مصنفہ غزالہ خالد کی شگفتہ نگاری

ہائے رے بچپن.. وہ بھی کیا دن تھے کہ ہاتھ میں چار پیسے یا یوں کہہ لیں کہ چار آنے آتے ہی ہم اپنے محلے کی قریب ترین دکان "صوفی جی کی دکان" پر دوڑتے ہوئے جاتے تھے. اس چار فٹ بائی تین فٹ کی دکان میں ہمارے خوابوں کی ہر تعبیر "میٹھی ٹافیوں، رنگ برنگے چڑیا کے انڈے، چینی کے بسکٹ، انڈے والے بسکٹ، گائے والی ٹافی، چینی چپکی ہوئی نرم نرم جیلی کی قسم کی چوکور ٹافیاں جسے سب "اندرا گاندھی کی بوٹی" کہہ کر چبایا کرتے تھے سب کچھ موجود ہوتا تھا اپنے محدود پیسوں سے جو خرید سکتے تھے

میں ”شاپنگ“ کہاں۔ کیسے اور کیوں کرتی ہوں؟

خریدتے اور باقی چیزوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے واپس آجاتے تھے کہ اگلی بار جب زیادہ پیسے پاس ہونگے تو خرید لیں گے۔

زندگی آگے بڑھتی رہی اور اللہ کے فضل وکرم سے قوت خرید بھی بڑھتی رہی لیکن آج تک جو اہمیت صوفی جی کی دکان کی ہے وہ ”بڑے سے بڑے سپر اسٹور“ کی بھی نہیں ہے کیونکہ اللہ کی مہربانی سے ااسٹور کی تقریباً ہر چیز دسترس میں ہوتے ہوئے بھی اب وہاں کے بسکٹ ٹافیوں سے بھرے ہوئے شیلف بھی اس طرح اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے جو صوفی جی کی دکان کا ایک ہاتھ لمبا شوکیس کیا کرتا تھا اس سے ثابت ہوا کہ ہر عمر کی اپنی خواہشات اور ترجیحات ہوتی ہیں۔

صوفی جی کی دکان اور سپر اسٹور کے موازنے کا مقصد یہی تھا کہ زندگی کے پل پل بدلتے رنگوں میں خریداری بھی وقت، عمر اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

بچپن تو بچپن ہوتا ہے نا سمجھی اور بھولپن کا زمانہ تیزی سے گذر بھی جاتا ہے۔ سمجھداری کی عمر میں ہماری نظر میں کامیاب وہی ہے جو اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے اور پھر مطمئن بھی رہے۔

ہمارا آبائی شہر حیدرآباد تھا جہاں کی ”ریشم گلی“ نامی بازار سے خواتین خریداری کیا کرتی تھیں اور آج بھی کرتی ہیں لیکن پچیس تیس سال پہلے والی بات اب نہیں رہی۔ تیس پینتیس سال پہلے تو ہمارے خواب کی ہر تعبیر ریشم گلی میں مل جاتی تھی اور خواتین بڑے ذوق وشوق سے ریشم گلی جایا کرتی تھیں پھر لطیف آباد آٹھ نمبر کی مارکیٹ بھی تعمیر ہو کر مشہور ہوتی گئی اور لطیف آباد میں رہنے والی خواتین نے وہیں سے خریداری شروع کردی، حیدرآباد کے متمول افراد خریداری کے لئے ”چاندنی“ جایا کرتے جو کینٹ کے علاقے میں نسبتاً مہنگی اشیاء والی دکانوں پر مشتمل بازار تھا۔ شادی کے بعد جب ہم کراچی آباد ہو گئے تب بھی حیدرآباد جاتے ہی وہاں کے بازار کا چکر ضرور لگا کرتا اور اجرک، چپنری کے سوٹ، سندھی کڑھائی والے سوٹ، شیشے لگے سندھی گلے، ہالا کی کاشی کاری والے گلدان اور ڈیکوریشن پیس ہم حیدرآباد سے ہی خریدتے۔ کھانے کی چیزوں میں ربڑی اور بمبئی بیکری کے کیک ضرور لائے جاتے۔

بازار تو ویسے بھی خواتین کی پسندیدہ جگہ ہیں اور ہمیں تو شہر شہر کے بازار دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے جب بھی کسی شہر میں جاتے ہیں وہاں کے بازار ضرور دیکھتے ہیں۔ بازار دیکھنے سے اس جگہ کے رہنے والوں کی ثقافت، رہن سہن، شوق اور کھانے پینے کی پسندیدہ اشیاء کا پتہ چلتا ہے۔ ہمیں آج تک یاد ہے جب کئی برس پہلے ہم پشاور کی باڑہ مارکیٹ گئے تھے جو کارخانے کہلاتی تھی۔ اس زمانے میں امپورٹڈ اشیاء عام بازاروں میں نہیں ملتی تھیں اسی لئے ہمیں وہ باڑہ مارکیٹ بہت پسند آئی تھی یہاں چیتی کپڑے، برتن، کمبل اور کلٹری نہایت سستے داموں مل رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ سب کچھ خرید کر کراچی لے جائیں۔ اس وقت کراچی میں سہراب گوٹھ پر باڑہ مارکیٹ ہوتی تھی لیکن اس کا پشاور اور نوشہرہ کی باڑہ مارکیٹ سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ ہم نوشہرہ کی باڑہ مارکیٹ بھی گئے لیکن پشاور کے ”کارخانے“ مارکیٹ سب سے اچھی باڑہ مارکیٹ تھی جہاں سے خصوصاً امپورٹڈ جارجٹ اور سلک کے سوٹ ڈیڑھ دو سو روپے فی سوٹ کے حساب سے ہم ڈھیروں خرید کر لایا کرتے تھے رشتے داروں کو تحفتاً بھی دیتے اور خود بھی پورا سال سلوا سلوا کر پہنتے اور لوگوں کی تعریفیں سمیٹتے کہ ”واہ واہ کتنا اچھا کپڑا ہے“۔

کارخانہ مارکیٹ میں ہم نے سرخ وسفید چہرے اور رنگین پگڑیوں والے پٹھان سکھ دکاندار بھی دیکھے تھے جو پشتو بول رہے تھے اور کارخانے مارکیٹ میں ہی پہلی بار ہم نے کابلی پلاؤ، دنبے کی بوٹیوں کی سیخیں اور چپلی کباب آدھے آدھے گز کی گرما گرم تندوری روٹیوں کے ساتھ کھائے تھے۔

اٹک سٹی کے بازار بھی دیکھے وہاں بھی اس وقت پشاور قریب ہونے کے سبب امپورٹڈ کپڑا اسستا اور بہت اچھا ملتا تھا۔

مری کے مال روڈ سے تو سب ہی واقف ہیں جو مری جاتا ہے وہاں سے کچھ نہ کچھ خرید ہی لیتا ہے۔ ہم نے نتھیا گلی کے بازار سے بھی خوبصورت شالیں نہایت مناسب قیمت میں خریدیں۔

لاہور کا بازار انارکلی ہمیں کراچی کے لالوکھیت کے بازار سے ملتا جلتا لگتا بلکہ قیمت بھی تقریباً وہی ہوتی۔ لاہور کے دہلی دروازہ والے بازار بھی جانا ہوا جو حیدرآباد کے شاہی بازار جیسا تھا جہاں سستی اشیاء تو دستیاب تھیں لیکن ان اشیاء کی کوالٹی کچھ ہلکی ہی تھی۔

پنڈی کا راجہ بازار بھی کئی سال پہلے دیکھا تھا اور ان ہی بازاروں سے ملتا جلتا لگا تھا وہاں ہماری دلچسپی چائنا مارکیٹ میں تھی جہاں اس وقت چائنا کی چیزیں ملا کرتی تھیں۔

آج سے بیس پچیس سال پہلے گوٹے کے کام اور ہاتھ کی کڑھائیوں کے حوالے سے بہاولپور اور ملتان کے بازاروں کی بھی بڑی قدر وقیمت تھی۔ وہاں کے بازار بھی ہماری یادوں کے خزانے میں محفوظ ہیں خصوصاً ملتان کے بازار بوہڑ گیٹ اور حسین آگاہی تو ہمیں بہت پسند تھے جہاں سے بریزا اور چکن کے سوٹ کے کٹ پیس انتہائی سستے داموں مل جائے تھے اس کے علاوہ کھیس، بگل نکس کی چادریں، کھسے، شیشے کی نگڑیوں سے سجے گلدان اور ڈیکوریشن پیس، اونٹ کی کھال کے بنے لیمپ، مکیش کے کپڑے، شیڈ ورک کڑھائی کے قمیض دوپٹے اور شیشہ ورک کے سوٹ بھی ہم شوق سے لایا کرتے اور ہمارے رشتے دار بھی ہم سے اپنی پسند کے کپڑے وہاں سے منگوایا کرتے تھے۔ چاندی کے خوبصورت مخصوص زیورات بھی ملتان اور بہاولپور سے بہت عمدہ ملا کرتے تھے ہمیں وہاں سے خریداری میں بہت مزہ آتا پچھلے دنوں بھی ملتان جانا ہوا لیکن اب وہ بات نہیں لگی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔

کراچی تو جتنا بڑا ہے اس کے بازار بھی اتنے ہی ہیں پہلے ہر بازار کی اپنی الگ پہچان ہوا کرتی تھی شادی بیاہ کی شاپنگ عموماً صدر، جامع کلاتھ اور طارق روڈ سے ہوتی تھی۔ کپڑوں پر کام جو بلی، حیدری اور پاپوش سے ہی بنوایا جاتا۔ بناری کپڑے اور ساڑھیوں کے لئے بنارس ٹاؤن اور نگی کی راہ لی جاتی۔ اس زمانے میں سب سے زیادہ مزہ بارگیننگ میں آتا تھا خصوصاً شادی بیاہ کے کپڑوں کی خریداری کے وقت صدر اور جامع کلاتھ کے دکاندار پچیس ہزار سے قیمت شروع کر کے دو ہزار میں جوڑا دے دیا کرتے تھے۔ پانچ ہزار کی ساڑھی کی بولی کا اختتام ڈھائی سو ہوتا تھا آج بھی یاد کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے یہ بس اس زمانے کا انداز تھا دکانداروں کو بھی پتہ ہوتا تھا کہ اس قیمت میں سوٹ کبھی نہیں بکے گا اور گاہک بھی جانتے تھے کہ انہیں کتنا کم کروانا ہے۔

اب تو یہاں کے بازار بھی طبقاتی تفریق کا شکار ہو چکے ہیں، لالوکھیت والے الگ، طارق روڈ والے الگ اور زمزمہ والے الگ۔

اب کسی دوسرے شہر جا کر بھی اس کے بازاروں میں جانے کا دل ہی نہیں چاہتا، وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ دنیا سمٹ چکی ہے جو ”سکھے“ پہلے صرف ملتان میں ملا کرتے تھے اب وہ کراچی میں بھی تقریباً اسی قیمت میں دستیاب ہیں، کڑھائی کے سوٹوں کا اب وہ فیشن نہیں رہا، ریشمی جوڑے بھی اب صرف شادی بیاہ میں پہنے جاتے ہیں اور اصل بات یہ ہے کہ اب تو ”برانڈز“ کا زمانہ ہے اور برانڈز کے بخار نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

پاکستان کے کسی بھی شہر میں چلے جائیں چاہے وہ شہر کراچی اور لاہور ہو یا سکھر اور سوات ہر جگہ شاپنگ مالز موجود ہیں جہاں چمکتی دمکتی برانڈز کی دکانیں گاہکوں کو ایسا متاثر کرتی ہیں کہ کہیں اور دیکھنے ہی نہیں دیتیں۔ قیمت بھی ہر شہر میں ایک ہی ہے اس لئے اب بازاروں کا وہ مزہ ختم ہو گیا جو آج سے کچھ سال پہلے تک شہر شہر کے بازار دیکھنے میں آتا تھا لیکن بازاروں میں چنتارش اب ہوتا ہے پہلے نہیں ہوتا تھا کراچی میں تو لوگ گھر میں بور ہو جاتے ہیں تو بازار چلے جاتے ہیں بقول شاعر

ہمارا دل ذرا کہتا کیا تھا گھر میں رہ رہ کر
خریداری نہیں کرنا یونہی بازار آئے ہیں

اس میں ملک کے حالات بھی قصوروار ہیں کہ طبقاتی فرق اتنا بڑھتا جا رہا ہے کہ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو مضبوط کرے اور اس کے باشندوں کو شاد وآباد رکھ کر ہمارے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے بازار کی رونقیں قائم رکھے۔

میں ''شاپنگ'' کہاں۔ کیسے اور کیوں کرتی ہوں؟

حیدرآباد دکن میں جدید شاپنگ مالز موجود ہیں۔ مجھے آن لائن شاپنگ پسند ہے۔

حیدرآباد دکن (انڈیا) سے افروز رئیس اختر کی میٹھی باتیں

شاپنگ ایک ایسا عمل ہے جس میں ہم سب اپنے لیے یا اپنوں کے لیے اپنی ضروریات یا خواہشات کو پورا کرنے کے لیے سامان خریدتے ہیں۔ یہ ایک تفریحی اور فائدہ مند سرگرمی ہوتی ہے سبھی کے لیے۔

شاپنگ ہم اپنی پسند کے مطابق کر سکتے ہیں ایک تو فزیکل اسٹورز (شاپنگ مالز مقامی مارکٹس) اور دوسرا آن لائن شاپنگ۔ دونوں کے فوائد بھی ہیں نقصان بھی لیکن ہمیں شاپنگ کرنے سے پہلے اپنی سہولت سے انتخاب کردہ چیزیں کہاں پر آسانی سے دستیاب ہوتی ہیں ہمیں کونسا طریقہ شاپنگ کے لیے پسند ہے اسے اختیار کر کے سکون سے شاپنگ کرنی چاہیے۔

شاپنگ کرنے سے پہلے اپ کو طے کر لینا چاہیے کہ آپ کو خریدنا کیا ہے کہاں سے خریدنا ہے اپ کا بجٹ کیا ہے۔

لوکل مقامی مارکیٹ میں مختلف دکانوں پر مختلف قیمتیں رہتی ہیں اور سیلز کا بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اسکے لیے نقد پیسے لے جانا چاہیے مقامی مارکٹس میں کم قیمت والی اشیاء جو برانڈیڈ نہیں ہوتیں اس پر سمجھوتہ کیا جاسکتا ہے خریداری کے دوران اپنی گفت وشنید کی مہارت کو بروے کار لا کر قیمتوں میں 30%/30% یا اس بھی زیادہ کی کروا سکتے ہیں مہذب طریقے سے ایئر کنڈیشنڈ شاپنگ مالز۔ آج ہر جگہ موجود ہیں جہاں ہمیں ایک ہی جگہ کئی اسٹورز ملتے ہیں اور فوڈ کورٹس سینما گھر مختلف قسم کی تفریح کے ساتھ ساتھ آرام دہ طریقے سے خریداری کر سکتے ہیں یہاں اعلیٰ درجہ کے قومی اور بین الاقوامی برانڈز سے لے کر مقامی برانڈز کی مختلف مصنوعات وسیع رینج میں دستیاب ہوتی ہیں مالز میں اسانی سے پرائس ٹیگ چیک کر کے مطلوبہ چیز خرید سکتے ہیں

یہاں روایتی لباس سے لے کر زیورات ہینڈی کرافٹس بھی ملتے ہیں۔ جب ہم شاپنگ مال میں شاپنگ کرتے ہیں تو وہاں

بارگیننگ نہیں کر سکتے فکسڈ ریٹ رہتا ہے لیکن کچھ ڈسکاؤنٹ ملتا ہے ۔مطلوبہ چیزیں خریدنے کے بعد کریڈٹ کارڈ/ڈیبٹ کارڈ یا موبائیل سے ادائیگی کر سکتے ہیں۔

حیدرآباد دکن میں کئی جدید شاپنگ مالز ہیں جیسے Inorbit Mall، GVK One Mall,Hyderabad Central,Abids Market

یہ مالز اعلیٰ درجے کے قومی بین الاقوامی برانڈز کے لیے مشہور ہیں۔ حالیہ برسوں سے آن لائن شاپنگ میں زبردست اضافہ ہوا ہے آن لائن شاپنگ اپنی سہولت اور مصنوعات کے وسیع انتخاب کی وجہ سے ساری دنیا میں مقبول ہو چکی ہے۔ آن لائن شاپنگ ایک بہت ہی آسان اچھا اور مختلف تجربہ ہے جس سے ہم اپنے ہی گھر سے 24/7 خریداری کر سکتے ہیں تاہم آن لائن شاپنگ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ ایک قابل اعتماد معروف پلیٹ فارم ہو اسکے بارے میں ریویوز پڑھیں اچھی طرح تصدیق کر لیں کہ اسکے پاس سیکیورٹی سرٹیفکیٹ ہے شاپنگ کی قیمتیں چیک کریں بڑے بڑے ای کامرس پلیٹ فارم کیش آن ڈیلیوری کی بھی سہولت دیتے اور نقص نکلنے پر واپسی کرنے کے بھی اختیارات دیتے ہیں۔

آن لائین شاپنگ میں بارگیننگ تول مول قیمت میں کمی کچھ نہیں کر سکتے ہاں صرف ڈسکاؤنٹ اور سیلز کی آفر لائیو آتی رہتی ہے اسے چیک کرتے رہنا ہوتا ہے

قابل اعتماد ویب سائیٹس پر یا Apps پر ہی ان لائن شاپنگ کریں اور ویب سائیٹ Encrypted..ssL ہو۔

آن لائن خریداری کرتے وقت سب سے ضروری اپنی پرسنل مالی انفارمیشن اور اپنے کریڈٹ کارڈ کی معلومات کو محفوظ اور حفاظتی ادائیگی کے وقت حفاظت کو ترجیح دینا بہت ضروری ہے تاکہ مالی نقصان سے محفوظ رہیں

مشہور آن لائن ویب سائیٹس

جیسے ایمزون۔ فلپ کارٹ۔ میشو۔ پے ٹی ایم، اسنیپ ڈیل جیسے قابل اعتماد ای کامرس پلیٹ فارمس پر خریداری کر سکتے ہیں جہاں مصنوعات کی ایک وسیع رینج ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔

مجھے تو آن لائن شاپنگ کرنا پسند ہے

آرام سے اپنی من پسند چیزوں کی خریداری اپنے لیے یا اپنوں کے لیے کسی بھی وقت سہولت سے پسند سے بنا گاڑی چلائے ٹریفک میں پھنسنے کے عذاب سے بچ کر آرام سے گھر بیٹھے سکون سے ہو جاتی ہے

کبھی بھی شاپنگ ہماری ضروریات پر منحصر ہونی چاہیے اور فضول خرچی سے بچنا چاہئے

میری اپنی ذاتی رائے ہے شاپنگ کرنا ٹھیک ہے لیکن شاپنگ مینیا نہیں ہونا چاہیے ہم میں۔

قریبی شاپنگ مالز کو ترجیح مقصد مردوں کی جیب خالی کروانا

ڈیفنس کراچی سے ریحانہ اعجاز کا اعترافیہ

ریحانہ اعجاز۔ڈیفنس کراچی

شاپنگ اک ایسا جنون جس کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے اور مجھ سمیت دینا کی ہر عورت کا من پسند مشغلہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خاتونِ خانہ کتنی بھی تھکی ہاری کیوں نہ ہو لیکن وہ شاپنگ کے لیے ہمیشہ تروتازہ رہتی ہے۔ میرا بھی یہی حال ہے۔سفر کی تھکان ہو یا گھر کے کام کاج کی تھکاوٹ،شاپنگ کا نام سنتے ہی ساری تھکان اتر جاتی ہے۔
شاپنگ کے لیے میں عموماً قریبی شاپنگ مالز کو ترجیح دیتی ہوں۔
ڈیفنس میں عام مارکیٹ یا دکانیں نہ ہونے کی بنا پر اور کچھ بچوں کی پسند اور معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے شاپنگ مالز کا رخ کرنا پڑتا ہے۔
ڈیفنس میں ان گنت بڑے بڑے شاپنگ مالز ہیں جہاں ہر قسم کے کپڑے، جوتے، جیولری، میک اپ، بچوں کے لیے کھلونے اور دیگر ضروریات زندگی کی ان گنت مصنوعات دستیاب ہیں۔
زیادہ تر شاپنگ زمزمہ، اوشین مال، ڈولمن مال، ملینیئم، لکی ون یا ہائپر اسٹار سے کرتی ہوں جہاں قیمت کم کروانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
ان شاپنگ مالز کی بدولت بارگیننگ نظام بری طرح متاثر ہوا ہے۔
یہاں ہر شے ایک دام پر دستیاب ہے۔
سیل کے نام پر یہاں وہ چیز بھی دھڑا دھڑ بک جاتی ہے جو عام دکان سے انسان معمولی قیمت پر بھی لیتے ہوئے دس بار دکان دار سے بحث

کرتا ہے۔
یقین جانیے بسا اوقات گھر میں ایک جوڑے کی صحیح قیمت بتانے کی ہمت نہیں ہوتی اصل قیمت سے دو، تین ہزار کم کر کے ہی بتایا جاتا ہے ورنہ صاحب فرماتے ہیں۔
آپ لوگوں کو لوٹ لیا، آپ لوگوں کو بیوقوف بنادیا، یا آپ لوگوں کو بس پیسے پھینکنے کا شوق ہے"
سمجھ نہیں آتی انہیں کیسے سمجھائیں کہ صاحب یہ" برانڈ کا زمانہ ہے برانڈ کا"
شکر ہے کراچی میں "گلاس ٹاور" مارکیٹ موجود ہے جہاں سے میں اکثر و بیشتر گھر کے لیے پردے، فٹ میٹ، بیڈ شیٹس، کشن کور وغیرہ کی شاپنگ کرتی ہوں یہاں یہ سب چیزیں بہت مناسب قیمتوں پر دستیاب ہیں خوشی کی بات یہ ہے کہ یہاں تھوڑی بہت بارگینگ کا موقع بھی مل جاتا ہے۔
کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ شاپنگ پر جانے کا وقت نہیں ملتا اور خریداری بھی ضروری ہوتی ہے۔(ایسا عموماً گھر میں کسی کی سالگرہ یا اینی ورسری کے وقت ہوتا ہے) تب آن لائن شاپنگ کے موجد کو دعائیں دینے کا دل کرتا ہے۔
گھر بیٹھے آرڈر کرو اور مطلوبہ چیز آپ کے در پر حاضر۔
ویسے بھی شاپنگ تو شاپنگ ہوتی ہے وہ چاہے گھر بیٹھ کر کی جائے یا شاپنگ مالز کی خاک چھانتے ہوئے۔
مقصد تو ایک ہی ہوتا ہے مردوں کی جیب خالی کروانا سو اس کے لیے کسی بھی طرح کی شاپنگ ہو "ہیں تیار ہم"۔

کم قیمت میں اچھا لباس خریدنا ایک فن۔رنچھوڑ لائن پسندیدہ۔تہواروں سے پہلے خریداری کر لینے میں فائدہ

لباس سے زیادہ تعلیم پر توجہ دینے والی شیما صدیقی

شیما صدیقی، کراچی

لباس کی خریدی کی بات کریں تو آج کم قیمت میں اچھا لباس خریدنا ایک فن بن گیا ہے۔ہم درمیانی درجہ سے تعلق رکھنے والے ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا بچپن سے ہی لباس سے زیادہ تعلیم پر توجہ مرکوز رہی، لباس ضرورت کے مطابق ہی بنتا تھا۔شادی بیاہ کے مواقع پر بڑوں کے لباس چھوٹوں کو مل جاتے جو بڑی خوشی سے پہنے جاتے۔ والدین کی اولین کوشش ہوتی کہ لباس سادہ اور صاف ستھرا ہو۔ ہمارے ایک عرصے تک کٹ پیس سے لباس تیار کیے جاتے۔ یہ ہی طریقہ ہم آج بھی اپنی نئی پود کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ ایک طرف کفایت شعاری بھی اور درست بھی۔ آج کل منگل بازار سے لے کر اتوار بازار تک سب کی خاک کم ہوگئی ہے۔لیکن کٹ پیس کے لئے رنچھوڑ لائن آج بھی پسندیدہ بازار ہے۔ جہاں کم سے کم اور مہنگی سے مہنگی قیمت کا اچھا کپڑا مل جاتا ہے۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ جب کم قیمت میں اچھا لباس بن سکتا ہے تو کیوں نا ایسا آرام دہ لباس تیار کیا جائے۔ ہم بہنوں کی عادت ہے کہ مارکیٹ سے براہ راست خریداری کرنا ہو یا آن لائن شاپنگ، ترجیح "سیل" ہی ہوتی ہے۔ آن لائن اور مستند برانڈ نے ہماری کافی مشکل آسان کی ہے۔ چیز گھر پر آجاتی ہے۔ سستی اور معیاری کپڑے کی خریداری کے لئے ضروری ہے کہ عین وقت پر یا تقریبات اور تہواروں پر خریداری نا کریں بلکہ وقت سے پہلے یہ کام کرلیں آسانی بھی ہوگی اور جھنجٹ سے بھی بچیں گے۔

میں ''شاپنگ'' کہاں۔ کیسے اور کیوں کرتی ہوں؟

آن لائن دکانداروں کی ریڑھی۔ پسندیدہ جگہ لبرٹی پھر انارکلی۔ شاپنگ میں مدنظر سہولت اور قیمت

جھنگ کی ڈاکٹر ملائکہ محسن کی لاہور سے بے تکلفانہ باتیں

ملائکہ محسن۔ جھنگ، لاہور

دنیا میں مختلف قسم کے فن اور فنکاروں کی تعداد موجود ہے، اور ان میں سے سب سے اہم اور مشکل فن کو سیکھنے کا اتفاق ہمیں بھی ہوا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس زمین کا جتنا حصہ پانی ہے، اتنا ہی حصہ شاپنگ مالز اور بازاروں پر مبنی ہے جن میں ایک ہی چیز مختلف داموں پر بکتی ہے۔ اور اب تو چونکہ جدید دور ہے تو ایک ریڑھی ہمارے آن لائن دکان والوں نے بھی لگا رکھی ہے، جس کی مشہوری موبائل فون کھولتے ہی اتنی دفعہ آنکھوں کے سامنے سے گزرتی ہے کہ خالی جیب ہونے کے باوجود دل میں اس شے کی طلب پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے شیطان انسان کو برائی کی طرف لپکاتا ہے، یہ آن لائن ایڈز آپ کو کچھ یوں خریدنے پر مجبور کرتے ہیں کہ انسان سوچتا ہے پیسے نہ بھی ہوں تو کچھ دن ڈبل روٹی کے ساتھ ایک سوٹ لگا کر گزارا کیا جا سکتا ہے۔ مذاق اپنی جگہ، آنلائن شاپنگ ایک بہت بڑی سہولت بھی ہے، چونکہ آپ کو گھر بیٹھے بغیر کسی خواری کے سب کچھ مل جاتا ہے۔ مگر وہ زندگی ہی کیا جس میں خواری نہ ہو۔ خواری سے یاد آیا، بازار کا منظر۔ ایک عورت جس نے اپنی بچی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہے مگر ذہنی طور پر فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ لیس کا رنگ کون سا لینا ہے، دائیں بائیں سے گڑیا اور باجی کی آوازیں آتی ہوئیں، گول گپے کی ریڑھی پہ کھڑی بانک پہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک عورت جس نے شاپنگ میں سے کھانے کے پیسے رکھے تھے اور کیا کیا مناظر بیان کیے جائیں۔ اگر مختصر کر کے بولوں تو کسی چیز کی اہمیت کا اندازہ تبھی ہوتا ہے جب دھکے کھا کر اسے حاصل کیا جائے۔ اب جہاں بازار میں اتنا رش، ورائٹی اور چوائس ہو تو یہ فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر جایا کہاں جائے۔ ہر جگہ سے گڑیا کی آواز سنتے ہی ایک پل کو یوں تو محسوس ہوتا ہی ہے جیسے آپ سے خاص کوئی نہیں، مگر پھر خود کو جگا کر اپنے فنکار ہونے کا احساس دلانا پڑتا ہے۔ اکثر لوگ اس بات پر بحث ضرور چھیڑتے ہیں کہ ایک غریب آدمی سے دام کیوں ہی کم کروانا، مگر یہ نہیں جانتے کہ ان سے بہتر ہماری نفسیات کوئی نہیں جانتا۔ جیسے ہی انہیں یہ معلوم پڑتا ہے کہ ایک چیز گاہک کو پسند آ چکی ہے وہ فوراً اس کا دام یوں بدلتے ہیں کہ اتنی جلدی تو شاید انسان بھی نہ رنگ بدلتے ہوں۔ خیر دکان میں جا کر آپ کو کچھ یوں ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ گویا آپ کو کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں اور آپ کے بٹوے میں دنیا کے آخری سو روپے رہ گئے ہیں۔ انسانوں پر بھروسہ تو آج کل ویسے ہی بہت خطرناک ہے، مگر دکانداروں پر بھروسہ اس سے بھی کئی گنا خطرناک ہے۔ اگر کوئی دکاندار آپ کو کسی شے کی قیمت 300 بتائے تو سمجھ لیں وہ چیز 100 کی ہے، بس وہ آپ کے پیسے کم کرانے کے بہانے بات چیت کرنا چاہتا ہے، کیونکہ آخر دکان پر بیٹھے 100 کی چیز 100 میں بیچنے کا کیا ہی مزہ۔ تین سال سے لاہور میں آمد کے بعد، میری شاپنگ کرنے کی سب سے پسندیدہ جگہ لبرٹی مارکٹ اور پھر اس کے بعد انارکلی رہی ہے۔ انارکلی میں چونکہ میری مادر علمی گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور واقع ہے، تو ہمیشہ گھر کی مرغی دال برابر محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ لوگ کافی دور دور سے یہاں شاپنگ کرنے آتے ہیں اور یہاں ملنے والی ورائٹی بھی بہت عمدہ ہے۔ لبرٹی کے کھسے مجھے انتہائی پسند ہیں، وہاں کے فوڈ پوائنٹ اس سے بھی اچھے ہیں، کپڑے سستے داموں پر بھی مل جاتے ہیں بس اچھے کپڑے کی پہچان کرنا آتی ہو تو اس سے بہتر جگہ کوئی نہیں۔ لبرٹی کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں آپ کو برانڈ سے لے کر عام سلنے والے کپڑے بھی ملیں گے۔ کبھی اگر صرف برانڈ کی شاپنگ کرنی ہو میری پسندیدہ جگہ لاہور کا المشہور امپوریم مال ہے۔ آخر دوبارہ یہ بات بہت اہم ہے کہ، جہاں بھی جایا جائے ہمیشہ دو چیزیں مدنظر رکھنا ضروری ہیں، سہولت اور قیمت۔ یا تو آپ سہولت حاصل کر سکتے ہیں زیادہ قیمت میں یا کم قیمت میں تھوڑی سی محنت کر کے اچھی چیز لے سکتے ہیں۔ مگر انسان تو کبھی ایک سا رہتا نہیں۔ ❁

کینیڈا میں پہلی بار یوم مئی

پاکستان کے ممتاز ٹریڈ یونین لیڈر منظور رضی کا کینیڈا میں یوم مئی سے خطاب

پی پی پی البرٹا آئندہ بھی ایسے پروگرام منعقد کرے گی

اطراف رپورٹ

مزدوروں کے عالمی دن یوم مئی کے موقع پر PPP البرٹا کے اراکین نے نہایت شاندار پروگرام کا اہتمام یکم مئی کو مقامی بینکوئیٹ ہال میں کیا جس میں سو سے زائد افراد نے شرکت کی۔ تقریب کے روح رواں سید کاشف حسین بخاری تھے جنہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر پہلی بار کیلگری میں یوم مئی منایا۔ مقررین نے سید کاشف حسین بخاری کے اس اقدام کی بھرپور ستائید کی اور مستقبل میں اس طرح کے پروگرامز کیلئے اپنے تعاون کا یقین دلایا تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان سے تشریف لائے محنت کشوں اور خاص طور پر ریلوے مزدوروں کے رہنما کامریڈ منظور رضی نے یوم مئی منانے پر منتظمین کا دلی شکریہ ادا کیا۔ اپنے خطاب میں کامریڈ منظور رضی نے کہا کہ شکاگو کے مزدوروں کی قربانیوں کی بدولت دنیا میں مزدوروں کے کام کے اوقات طے ہوئے اور ان کی مراعات میں اضافہ ہوا تقریب میں ایم ایل اے پرمیت سنگھ البرٹا کے ملٹی کلچرل ازم اور امیگریشن کے وزیر محمد یسین نے شرکت کی اور کامریڈ منظور رضی کو البرٹا آمد پر خصوصی سرٹیفکیٹ تفویض کیا۔ کامریڈ منظور رضی کی جانب سے سید کاشف حسین بخاری، مشہود قاضی اور محمد آصف صدیقی کو سندھی اجرک کا تحفہ پیش کیا جو وہ خصوصی طور پر کراچی سے ان شخصیات کے لئے لیکر آتے تھے۔

”’اطراف‘۔ اپنے قلمی سرپرست پروفیسر شاداب احمد صدیقی کا ممنون و شکر گزار ہے کہ ان کی مخلصانہ محنت سے ’اطراف‘ کے قارئین پر حیدر آباد شہر کے اوصاف۔ افادیت۔ اور جواہر کھل کر سامنے آرہے ہیں۔ حیدر آباد کے باسی تو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ سب شاداب صدیقی صاحب کی تحریروں کے مدح خواں ہیں۔ بہت تحقیق کے بعد پروفیسر شاداب احمد صدیقی نے اپنے عظیم شہر حیدر آباد کی معیشت کا احاطہ کیا ہے۔ وہ ایک ایک بازار میں گئے۔ دکانداروں سے باتیں کیں۔ تاریخ کے جھروکوں میں گھومے۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔“

حیدرآباد۔ تاجر برادری پریشان صارفین کی قوت خرید کم

تحریر۔ تحقیق اور تصاویر: پروفیسر شاداب احمد صدیقی

محمود شام صاحب کا طرہ امتیاز رہا ہے کہ وہ ہر مہینے ماہنامہ اطراف میں قارئین کی دلچسپی ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دلچسپ معلوماتی موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں اس طرح ’اطراف‘ کے قارئین میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ انہیں ہر ماہ ماہنامہ اطراف کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ گزشتہ کامیاب ماہنامہ اطراف نمبروں کی طرح اس مرتبہ بھی محمود شام صاحب نے بہت اہم موضوع ”آپ کے شہر کی معیشت“ کو اجاگر کرنے کے لیے مئی میں ماہنامہ اطراف کے ذریعے شہروں اور ملک کی ڈوبتی معیشت پر بڑے دانشوروں اور ادیبوں کے مضامین شامل کیے جا رہے ہیں تا کہ قارئین شہروں اور وطن عزیز پاکستان کے معاشی حالات سے باخبر ہوں سب سے پہلے پاکستانی معیشت پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کی معیشت گزشتہ کچھ سالوں سے بڑی مشکلات کا شکار ہے۔ پاکستان اپنی گرتی ہوئی معیشت کو پٹڑی پر لانے کے لیے آئی ایم ایف سے مسلسل مطالبہ کر رہا ہے کہ اس کو قرضوں کی فراہمی یقینی بنائے۔ چند معاشی ماہرین کے مطابق پاکستان کے سیاسی اور معاشی بحران ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاسی اتھل پتھل شاید براہ راست معاشی بحران کا سبب بنی ہے۔ جب پوری حکومت خسارے پر چلی جائے تو مہنگائی پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ جب حکومت کے پاس مستقبل میں سرمایہ کاری کے لیے رقم نہ ہو تو معاشی ترقی ناممکن ہے۔ معیشت کا بڑھوتری کی طرف نہ جانا ہر مسئلے کو مزید گھمبیر بنا دیتا ہے۔ قومی آمدنی میں اضافہ کیا جائے اور سرکاری اخراجات میں کمی ہو تبھی معاشی حالات میں ایک ایسا معاشی توازن پیدا ہوگا۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بزنس فرینڈلی اور طویل المدتی معاشی پالیسیاں تشکیل نہیں دی جاتیں جس سے کاروباری طبقے اور سرمایہ کاروں کی مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہی ملک بہتر ترقی کرتے ہیں جن میں پالیسیوں کا تسلسل جاری رہتا ہے۔ بنگلہ دیش اور دیگر ممالک بزنس فرینڈلی پالیسیاں تشکیل دے کر پاکستان سے آگے نکل گئے ہیں۔ معاشی سرگرمیاں کم و بیش ماند پڑ چکی ہیں اور کاروباری حضرات سخت اضطرابی کیفیت میں مبتلا شکایت کرتے دکھائی دے

آئی ایم ایف سے معاہدہ کرتے وقت صنعتی تجارتی حلقوں سے مشورہ نہیں کیا جاتا

رہے ہیں۔ حیدر آباد سندھ کا دوسرا بڑا شہر اور تجارتی، صنعتی اور زرعی حب ہے۔ انرجی بحران سے صنعتوں کی پیداواری استطاعت میں گراوٹ صنعتکاروں کے لیے بڑا مسئلہ ہے، صنعتوں کو انرجی بحران سے محفوظ رکھنے کے لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ گیس کی انڈسٹریل ضروریات کو پورا کرے۔ بجلی گیس کی غیر اعلانیہ بندش کی وجہ سے تاجر برادری مسائل کا شکار ہے۔ صنعت و تجارت معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے تاجر برادری کا ناصرف ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ہے بلکہ انہوں نے شہروں کی تعمیر و ترقی کے لیے

بھی اپنی خدمات پیش کر کے قومی فریضہ ادا کیا ہے۔ موجودہ حالات میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کی وجہ سے تاجر برادری سخت پریشان ہے نا مساعد حالات کی وجہ سے روزمرہ اخراجات پورے کرنا مشکل ہو چکے ہیں۔ مہنگائی کی ذمہ دار حکومت ہے ایسے میں تاجروں کے خلاف ایکشن سخت زیادتی ہے۔ حیدرآباد کے تاجر برادری اس وقت ملک میں جاری ہیجانی صورتحال پر شدید پریشان ہے۔ ملکی معیشت اور کاروباری امور براہ راست سیاسی نظام زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی ترقی وخوشحالی مستحکم سیاسی عمل سے

ریشم گلی خواتین کا پسندیدہ بازار۔ اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے

ہی پروان چڑھ سکتی ہے۔ ملک میں جاری غیر یقینی صورتحال سے کاروباری اعتمادتیزی سے نیچے کی طرف جارہا ہے۔

حیدرآباد کی تاجر برادری موجودہ اور مستقبل کے سیاسی حالات، مہنگائی اور روپے کی بے قدری سے خطرناک حد تک پریشان ہے۔ تاریخی مہنگائی نے حیدرآباد کے صارفین کی قوت خرید کو کم کر دیا ہے۔ حیدرآباد میں پرانا کاروباری طبقہ ہی تجارت میں مصروف ہے موجودہ حالات میں نیا کاروبار شروع کرنے والے مایوس ہو کر کاروبار ختم کر چکے ہیں۔ عید کے دنوں میں بھی حیدرآباد کے بازاروں میں وہ گہما گہمی دکھائی نہیں دی۔ میں نے جب بازاوں کا دورہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دکاندار فارغ بیٹھے تھے۔ جب میں نے اس کی وجہ معلوم کی تو دکانداروں نے مہنگائی کا کہا۔ تاجر حضرات کا کہنا تھا کہ ہمیں مال اور اشیاء پیچھے سے مہنگی مل رہی ہیں لیکن خریدار ہم سے ریٹ کم کروانے کی ضد کرتے ہیں۔ اخراجات کی لاگت بہت زیادہ ہے جبکہ شرح منافع بہت کم ہے۔ ٹیکسوں کی بھرمار نے حیدرآباد کے تاجروں کے لیے کاروبار انتہائی مشکل کر دیا۔ حکومت گرتی ہوئی ملکی معیشت کا بوجھ تاجر برادری اور مظلوم پاکستانی عوام پر ڈال کر آئی ایم ایف کو راضی کرنے میں مشغول ہے

۔ایک تاجر نے کہا کہ ملازمین کی تنخواہیں اور دکانوں کے کرایوں کی ادائیگی تک دشوار ہوگئی ہے۔ ایک اور تاجر نے کہا کہ ملکی معیشت کے لیے آئی ایم ایف ایک ناسور ہے۔ جس کی وجہ سے کاروبار تباہ ہوگیا ہے۔ بجٹ بناتے وقت تجارت اور صنعت کی قیادت سے رابطہ نہیں کیا جاتا۔ حکومت آئی ایم ایف سے ڈکٹیشن لے کر مالی سال کا بجٹ بناتی ہے۔ تاجروں کا کہنا تھا کہ اب وہ کاروبار کرنے کے قابل نہیں رہے اور ان کے کاروبار اسٹیٹ بینک یا حکومت ہی سنبھال لے۔ حکومت نے ٹیکس کا جال مزید پھیلانے کے لیے کاروبار کرنے والے ریٹیلرز اور ہول سیلرز کے لیے لازمی رجسٹریشن اسکیم کا منصوبہ پیش کر دیا ہے اس طرح پاکستان نے آئی ایم ایف کی ایک اور شرط پوری کر دی۔ حکومت کے اس اقدام سے حیدرآباد کے تاجروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی خاص طور پر چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والے تاجر حضرات پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ 'اطراف' کے موضوع کے مطابق حیدرآباد شہر کی معیشت کا جائزہ مشاہدات اور تجربات قلمبند کرنے کے علاوہ اپنے قارئین اور حیدرآباد شہر کے تجارتی مراکز سے آگاہی پیش کر رہا ہوں۔ تو چلیے سب سے پہلے شہر حیدرآباد کے مختلف بازاروں کے نام اور تفصیلات پیش خدمت ہیں۔

حیدرآباد شہر کے مختلف بازاروں کے نام اور تفصیلات

اندرون سندھ سے بڑی تعداد میں عوام بالخصوص خواتین حیدرآباد کا مشہور اور قدیم بازار ریشم گلی میں خریداری کرنے آتے ہیں۔ یہ بازار شادیوں کے لیے کپڑے، جوتے، چپلیں، جیولری، سونے کے زیورات، زنانہ اور مردانہ کپڑے، بچوں کے کپڑے خریدنے کے لیے بہترین جگہ سمجھی جاتی ہے۔ ایک پہاڑی پر قائم ریشم گلی بھی جنگل ہوا کرتا تھا۔ اب یہ خرید وفروخت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں تقریباً دس ہزار خواتین آتی ہیں۔ اکثر خواتین یہ شکایت کرتی ہیں کہ بازار میں بیت الخلا، پینے کے صاف پانی اور آرام کرنے کی سہولتوں کا فقدان ہے۔ نہ تو دکانداروں نے گاہکوں کی سہولت کے لیے کوئی انتظام کیا ہے اور نہ ہی انتظامیہ نے اس جانب توجہ دی۔ ریشم گلی بازار حیدرآباد کے سابقہ کوہ نور سینما چوک سے صرافہ مارکیٹ ،سرے گھاٹ اور شاہی بازار اور دیگر ملحقہ بازاروں سے جڑا ہوا ہے ۔ یہ مختلف چھوٹے بازاروں کا سنگم بھی ہے۔ حیدرآباد کی ریشم گلی جسے Bangle Capital of the World کہنا چاہیے۔ ریشم گلی بازار کا دوسرا راستہ لیڈی ڈفرن ہسپتال المعروف زنانہ اسپتال اسٹیشن روڈ حبیب بینک کے ساتھ بھی ہے۔ یہ بازار تقسیم ہند

شاہی بازار۔ بتاشہ گلی۔ گجگ گلی

سے پہلے سے قائم ہے۔ اس زمانے میں ریشم کی فروخت کی وجہ سے اس بازار کا نام ریشم بازار پڑ گیا۔ اسے اس وقت سلک اسٹریٹ بھی کہا جاتا تھا۔ سب سے پہلے یہ انگریزوں کی جگہ تھی بعد میں ہندو تاجروں نے اپنا کاروبار شروع کیا۔ ایک سنار کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جس نے اپنی زندگی کے ستر (70) سال ریشم گلی اور گولڈ مارکیٹ میں سونا بیچ کر گزار دیے، یہاں روزانہ کروڑوں مالیت کے سونے کا کاروبار ہوتا تھا، اندرون سندھ اور حیدرآباد کے شہری اپنی پسند کے زیورات خریدتے تھے۔ ان گھرانوں کی خواتین نوٹکھا ہار اور پازیب شوق سے خریدتی تھیں۔ اب تعداد مہنگائی کی وجہ سے کم ہوگئی ہے۔ خواتین کے لیے یہ ایک بہترین بازار ہے جہاں بچوں کے کھلونے، تحائف کے سینٹر، کراکری سندھی دستکاری ملبوسات، اجرک، سندھی ٹوپی، میک اپ، خواتین کے سوتی لان ملبوسات اور ضرورت کی ہر اشیاء موجود ہیں۔ یہاں تجاوزات کی بھرمار ہے۔ بیشمار جھوٹے اسٹالز لگے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کو ضرور حیدرآباد کے مشہور بازار کا رخ کرنا چاہیئے یہاں آپ کو حیدرآباد شہر کے حقیقی رنگ اور مختلف قوموں کے افراد نظر آئیں گے۔ سیاح اگر ممکن ہو تو ایک مقامی گائیڈ حاصل کریں

تاکہ آپ کو شاپنگ میں مدد ملے گی۔ یہاں بے پناہ رش کی وجہ سے پولیس سیکورٹی بے حد ضروری ہے۔ یہاں جیب کتروں سے ہوشیار رہیں۔ بہت مصروف بازار ہے۔ موٹر سائیکل کے لیے پارکنگ چارج کی بنیاد پر آسانی سے دستیاب ہے جبکہ کار کے لیے پارکنگ تلاش کرنا قدرے مشکل ہے۔ مقامی ٹرانسپورٹ بھی آسانی سے دستیاب ہے۔ اگر کوئی بھوکا ہو تو یہاں بازار کے شروع میں کھانے پینے کے اسٹال بھی ہیں۔ مثلاً پیٹس، سموسے اور پکوڑے، چاٹ وغیرہ کھانے کے لیے دستیاب ہیں۔

حیدرآباد کا شاہی بازار

حیدرآباد شہر کی پہچان ''شاہی بازار'' ہے۔ جو پکا قلعہ حیدرآباد کے سامنے سے شروع ہوتا ہے اور مارکیٹ ٹاور تاریخی گھنٹہ گھر پر ختم ہوتا ہے۔ دونوں اطراف دکانیں ہیں۔ یہ بازار کلہوڑوں اور تالپوروں نے بنوایا تھا۔ جب غلام شاہ کلہوڑو نے حیدرآباد آباد کیا تو وہ خود قرابت داروں اور اشرافیہ کے ساتھ قلعے میں رہنے لگے اور قلعے سے باہر مختلف پیشوں کے لحاظ سے لوگوں کو آباد کیا۔ تالپوروں نے جب ہالانی کی جنگ میں کلہوڑوں کو شکست دے کر قلعہ کو فتح کیا تو میر فتح علی خان تالپور نے قلعے کے دروازے کے بالکل سامنے شاہی رستوں پر بازار بنوایا۔ شاہی بازار کے دونوں جانب آبادیاں وجود میں آئیں، بازار کے مشرق میں زیادہ تر مسلم آبادیاں تھیں اور مغرب میں ہندو آباد تھے۔ اس بازار کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ پکا قلعہ سے اس بازار میں داخل ہوں گے تو بازار کی تاریخی خوبصورتی اور انواع و اقسام کی دکانیں دیکھتے جائیں اور طویل مسافت اور تھکن کا احساس تک نہیں ہوتا۔ حاجی ربڑی والے کی دکان سے شروعات ہوتی ہے۔ حاجی ربڑی بھی تقسیم ہند کے وقت سے قائم ہے۔ حاجی ربڑی کے ذائقے سے بھی لطف اندوز ہوں۔ حاجی ربڑی والے کی دکان سے تھوڑا آگے چلیں تو سنار یا صرافہ بازار شروع ہو جاتا ہے۔ پورے حیدرآباد میں اس سے بڑا کوئی صرافہ بازار نہیں ہے۔ اس علاوہ یہاں ہوزری کا سامان، پیپر ڈیکوریشن، گھڑیاں، جوتے، چپل، شیشے، کپڑا، بتاشے، سندھی اجرک اور ٹوپی، رومال، دھاگے، گرم بستر غرض کہ ضرورت کا ہر سامان میسر ہے۔

بتاشہ گلی

شاہی بازار میں میٹھی اشیا کا مرکز بتاشہ گلی بہت مشہور ہے، اسے گجک گلی بھی کہا جاتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں یہاں حیدرآباد سمیت اندرون سندھ سے لوگ گھر والوں اور دوست احباب کی فرمائش پر گجک کی خریداری کے لیے آتے ہیں۔ اس گلی میں گجک کے علاوہ بتاشے، ریوڑیاں، نمکو اور گڑ شکر کی اشیاء ملتی ہیں۔

مرکزی کلاتھ مارکیٹ۔ چیزیں سستی مل جاتی ہیں

مکھ کی گھٹی یا مکتی گلی

یہ گلی فقیر کے پڑ اور سرور قبی لین کے درمیان واقع ہے، یہاں کسی زمانے میں مکھی گوبند رام کے آبائی واجداد رہا کرتے تھے، اس لیے اس کا نام مکھیں کی گھٹی پڑا۔ دیوان شوتی رام جو کہ ہندو پنچائیت کا مکھیا تھا اس گلی میں رہتا تھا اسی وجہ سے اس کا نام مکھ کی گھٹی پڑا۔ مگر اب اس کا نام مکتی گلی ہے اور یہاں کھلونے ہول سیل کے حساب سے ملتے ہیں۔

سٹی کالج نے حیدرآباد کو ہی نہیں پورے پاکستان کو علمی شخصیات فراہم کیں

آڈوانی گھٹی یا آڈوانی گلی

قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے لفظ ''گھٹی'' کی وضاحت بے حد ضروری ہے کیونکہ حیدرآباد کے اکثر بازار لفظ ''گھٹی'' سے منسوب ہیں۔ سندھی زبان کے بے شمار خوبصورت صوتی الفاظ میں سے ایک لفظ ڈ ''گھٹی'' ہے یہ سندھ کے شہروں میں ہر جگہ پائی جاتی ہے اور قصبات اور گوٹھ یعنی گاؤں میں بھی ہے۔ گھٹی اردو میں گلی کو کہتے ہیں۔ گھٹی اور گلی دونوں استعمال ہوتے ہیں اب مگر گھٹی کہنے کا اپنا مزہ ہے، جیسے سندھ کے لفظ ''پڑ'' کا ترجمہ ''علم'' تو ضرور ہے، مگر تشنہ ہے۔ ''فقیر جو پڑ'' ایک مکمل لفظ ہے اور اس کا اردو ترجمہ صرف ''جو'' کو ''کا'' میں تبدیل کر کے ''فقیر کا پڑ'' کہتے ہیں۔ حیدرآباد میں بہت ساری گلیوں یا گھٹیوں میں ایک ''آڈوانی'' گھٹی بھی ہے۔ یہ گلی آج کل میڈیسن ادویات کی بہت بڑی ہول سیل مارکیٹ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس گلی کے جنوبی سرے پر ''فاطمہ'' مسجد ہے جو مشہور ہندو پروفیسر کلا چند آڈوانی کا گھر ہے اور اس کے آباء واجداد تقسیم ہند کے بعد یہاں سے ہجرت کر کے بھارت چلے گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص بی جے پی کے سرکردہ رہنما لال کرشن آڈوانی کا قریبی رشتہ دار تھا۔

چھوٹی گھٹی یا چھوڑ جی گھٹی

چھوٹی گھٹی کبھی چھوڑ (چھال) اور چمڑے کے کاروبار کی وجہ سے چھوڑ جی گھٹی کہلاتی تھی اس لیے کہ سندھی زبان میں پیڑ کی چھال کو چھوڑ کہتے ہیں جو چمڑا رنگنے کے کام آتی ہے۔ چھوڑ سے پہلے اس کا نام ''سمی چارٹی'' تھا۔ فوجداری روڈ سے چھوٹی گھٹی کا راستہ ہے اور اس کے برابر میں بلدیہ اعلیٰ حیدرآباد آفس اور سٹی پولیس اسٹیشن ہے۔ یہ حیدرآباد کا ایک بڑا کاروباری مرکز ہے یہاں الیکٹرونکس کا سامان اور تمام کھیلوں کی اشیاء ملتی ہیں۔ چھوٹی گھٹی کے اوپر بازار میں حلوائیوں اور نمکو کی دکانیں ہیں۔ یہاں 1937ء سے قائم ہندوؤں کی عمارات ہیں۔

فقیر کا پڑ بازار

شاہی بازار سے متصل ریشم گلی کے سامنے فقیر کا پڑ شروع ہوتا ہے۔ جو ایک قدیم مارکیٹ ہے۔ یہاں بھی 1936ء سے برٹش دور میں ہندوؤں کی تعمیر کردہ عمارات ہیں۔ آج بھی یہ اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ یہاں ایک امام بارگاہ آستانہ سید پیر شاہ ست بخاری بھی موجود ہے۔ فقیر محمد جونیجو تالپور حکمرانوں کا مشیر تھا، اس نے یہاں ایک امام بارگاہ قائم کیا اور تعزیہ بنوایا تھا۔ فقیر محمد جونیجو ایک عزادار تھا۔ یہاں ایک قدیم تاریخی مسجد مائی خیری بھی ہے۔ مائی خیری تالپور خاندان کی حکمرانی کی بنیاد رکھنے والے میر فتح علی خان تالپور کی ماں تھیں۔ اصل نام خیر النساء تالپور تھا۔ انہوں نے فقیر جو پڑ کے علاقے میں ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کروایا تھا۔ مدرسہ آج بھی موجود ہے۔ یہ مسجد آج سے دو سو سال پہلے آستانہ پیر شاہ ست بخاری عرف فقیر جو پڑ 1949ء میں قائم ہوا۔ یہاں ایک قدیم مچھلی مارکیٹ ہے۔ Mrs Rami Bi Jet Mall کی مالی امداد سے وجود میں آئی 1936ء سے یہاں ایک قدیم گوشت مارکیٹ ہے۔

حیدرآباد کی مرکزی کلاتھ مارکیٹ

حیدرآباد کی مرکزی کلاتھ مارکیٹ سستی مارکیٹ ہے۔ یہاں کپڑے، جیلری، جوتے چپل اور دیگر مردانہ وزنانہ اشیاء فروخت کی جاتی ہے۔ اس کے سامنے حیدرآباد کا سب سے بڑا انڈا بازار لگتا ہے جہاں غیر ملکی اشیا سستے نرخوں میں ملتی ہیں۔

اس کے ساتھ تاریخی سٹی کالج ہے۔ اس کلاتھ مارکیٹ کا سٹی کالج سے گہرا تعلق ہے۔ بہتر تعلیم کی فراہمی کے لیے علم دوست شخصیات نے

لطیف آباد کے بازار نمبروں سے جانے جاتے ہیں

1951ء کے دوران ایک تنظیم ''رینا ساں ایجوکیشنل سوسائٹی'' Renaissance Educational Society قائم کی جس کے بانی سی ایس پی آفیسر ایس کے رحیم تھے۔ ان کے رفیق کار معروف علمی وادبی شخصیت مرزا عابد عباس بھی تھے۔ وہ سٹی کالج حیدرآباد میں کافی عرصے تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ مرزا عابد عباس کے چار پسوت منفرد صحافی ہیں جن میں مظہر عباس معروف صحافی اور تبصرہ نگار، ظفر عباس ایڈیٹر روزنامہ ڈان، اطہر عباس سابق ڈی جی آئی ایس پی آر اور اظہر عباس مینیجنگ ڈائریکٹر جیو نیوز چینل ہیں انہوں نے اپنی تعلیم اور صحافت کا آغاز حیدرآباد سے شروع کیا۔ مرزا عابد عباس سٹی کالج کے پہلے پرنسپل تھے۔ سٹی کالج کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔ فلم اسٹار محمد علی نے بھی اس کالج سے تعلیم حاصل کی۔ سٹی کالج کا کلاتھ مارکیٹ سے یہ تعلق ہے کالج کو چونکہ ہمیشہ ہی فنڈز کی کمی کا سامنا رہا اس لیے اس کی انتظامیہ نے مطلوبہ ضرورتیں مدنظر رکھتے ہوئے کالج کی اراضی پر 232 دکانیں تعمیر کیں اور انہیں ماہانہ کرائے پر دے دیا۔ کالج کے اطراف میں مجموعی طور پر گارمینٹس، چوڑی، لوہے، اشیائے خورد ونوش کی مجموعی طور پر 16 اہم مارکیٹیں ہیں۔ چوڑی کی ہول سیل نشاط مارکیٹ بھی اس کے ساتھ ہی ہے۔

سرے گھاٹ بازار

شاہی بازار کے ساتھ سرے گھاٹ چوک سے بازار شروع ہوتا ہے۔ سرے گھاٹ چوک پر 1949ء سے محمد اسحاق کا کینڈی نام سے چائے کا ہوٹل ہے۔ یہاں جوتوں کی قدیم دکانیں نسل در نسل کاروبار کرتی آرہی ہیں۔ انصاف شو کمپنی۔ پنجاب بوٹ ہاؤس بھی 1901ء سے آج تک موجود ہیں۔ یہ خاندان سیالکوٹ ڈسکہ سے یہاں آیا اور جوتوں کا کاروبار شروع کیا۔ رحمان سوئیٹ 1960 میں قائم ہوئی۔ ان کے شاہی ٹکڑے مشہور ہیں۔ یہاں ایک 75 سال پرانی شربت کی دکان ہے۔ اقبال پان ہاؤس 60 سال پرانا ہے۔ مٹھائیوں کی دیگر دکانوں میں دلشاد سوئیٹ اور اس کے برابر میں مدینہ سوئیٹ ہے۔ یہاں مرزا چپل شاپ بہت مشہور ہے جہاں سے بھارت سے آنے والے افراد مرزا چپل خرید کر لے کر جاتے ہیں۔ سرے گھاٹ چوک پر 55 سال پرانا اوجڑی کا ٹھیلا ہے۔ حیدرآباد کے شہری مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔

نول رائے مارکیٹ، ٹاور مارکیٹ، حیدرآباد کا خاموش گھنٹہ گھر

آج سے 100 سال پرانے گھنٹہ گھر کو راستہ تاریخی علاقے ہیرآباد کی کشادہ گلیوں سے گزر کر جاتا ہے۔ یہ مارکیٹ ٹاور بھی کہلاتا ہے۔ یہ 1914 میں تعمیر ہوا۔ اس مارکیٹ کے بانی مشہور ہندو صحافی اور تعلیم دان رائے بہادر دیوان نول رائے شوقی رام تھے جو ڈپٹی کلکٹر کے ساتھ میونسپلٹی کے صدر بھی رہے۔ انگریزوں نے ان کی خدمات کے اعتراف میں یہ ٹاور ان سے منسوب کیا۔ اس عمارت کا رقبہ 492 مربع گز اور اونچائی 83 فٹ ہے۔ ہوائی ستونوں پر توس کی شکل کے دروازوں پر قائم عمارت میں تین بڑے کمرے ہیں جن میں داخل ہونے کے لیے ہر دو جانب سیڑھیاں ہیں۔ دائیں بائیں جانب کے کمروں میں دونوں جانب کھلنے والی کھڑکیاں ہیں جب کہ درمیان والے کمرے میں خوبصورت بالکونی ہے۔ اور ٹاور میں چاروں جانب گول گھڑیال لگا ہوا ہے۔ یہ ٹاور شہر کے داخلی راستوں سے نظر آتا ہے، جسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شہر شروع ہو گیا ہے۔ یہ گھنٹہ گھر وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ خاموش ہو گیا۔ حیدرآباد کے پرانے شہری بتاتے ہیں کہ حیدرآباد کی اصل مارکیٹ یہی تھی، اس کے بعد جیسے ہی شہر بڑھتا گیا، کاروباری مراکز بھی تبدیل ہو گئے جب تک یہ ٹاور میونسپل کمیٹی کے حوالے تھا، تب تک اس کی صورتحال کچھ بہتر تھی مگر شہری حکومتوں کے نظام میں معمر ترین ٹاور زوال کا شکار ہو گیا۔ کاروباری علاقہ ہونے کی وجہ سے اب لوگوں کی نگاہیں نہ تو گھنٹہ گھر کو دیکھتی ہیں اور نہ ہی اس گوشت مارکیٹ کو جو کہ اس ٹاور کی چھت کے عین نیچے قائم ہے۔ یہ مارکیٹ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ یہ گھنٹہ گھر۔ کسی زمانے میں گوشت مارکیٹ اور مچھلی مارکیٹ یہاں کی اہم ترین مارکیٹیں ہوا کرتی تھیں۔ گوشت مارکیٹ کی ساگوان کی لکڑی سے بنی ہوئی چھت کو ختم کر کے ایک سیمنٹ کی چھت بنائی گئی ہے۔ کچھ قصاب آج بھی اسی مارکیٹ میں گوشت بیچتے ہیں۔ یہاں سبزی والے، پھل فروش، کنفیکشنری اور مختلف قسم کے کھیلے والے کاروبار کر رہے ہیں۔ یہ ہول سیل مارکیٹ ہے۔ پرچون کا سارا سامان ملتا ہے۔ کپڑے کی بھی دکانیں ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ کو اس ایک صدی پرانی عمارت کو قائم رکھنے کے لیے ضرور کوشش کرنی چاہیئے۔

ہندوؤں کی تعمیر کردہ عمارات آج بھی شہرہ آفاق ہیں

تلک چاڑی بازار

تلک چاڑی حیدرآباد کی مشہور چاڑی ہے۔ جسے پہلے دھکا چاڑی کہا جاتا تھا بعد میں یہاں پوسٹ آفس قائم ہوا لہذا یہ پوسٹل چاڑی کہلائی۔ پھر یہاں کانگریس کا جلسہ ہوا جس میں ہندوستان سے مشہور کانگریسی لیڈر مہاراج لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک نے شرکت کی تو حیدرآباد کے کانگریسی صدر ڈاکٹر چوتھ رام نے اس کے نام سے موسوم کر کے اس کا نام تلک چاڑی رکھا۔ یہ نام آج تک چلا آرہا ہے۔ تلک چاڑی اگر حیدرآباد کی شان ہے تو خیانی چند محل یا مینشن تلک چاڑی کا مان ہے۔ قارئین کو کچھ دیر کے لیے تاریخ کے جھروکوں میں لیے چلتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے اپنے اس تحقیقی مضمون میں پہلے بتایا کہ پاکستان بننے سے قبل حیدرآباد میں ہندوؤں کی خاصی تعداد آباد تھی ہے جو پاکستان بننے کے بعد حیدرآباد چھوڑ کر بھارت چلے گئے لیکن جاتے جاتے ہمارے لیے ایک انمول عمارات اور بازاروں کا خزانہ چھوڑ گئے۔ ان ہی میں سے ایک تلک چاڑی پر قائم خیانی چند محل ہے۔ یہ عمارت 1928ء میں بن کر مکمل ہوئی ہے۔ تلک چاڑی کے اوپر کی جانب دائیں طرف لوہے کا جنگلہ لگا ہوا ہے اس کے پیچھے یہ محل واقع ہے۔ عمارت کی پیشانی پر''

خیابی چند محل'' لکھا ہوا ہے۔اس میں اس وقت کئی خاندان آباد ہیں۔یہ آج بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔وسیع، کشادہ آنگن، درمیان میں لگا ہوا فوارہ، مضبوط خوبصورت دیدہ زیب سیڑھیاں، محرابی دروازے ہیں۔کسی زمانے میں اکبر ایس کے دہلوی جو فرانس کے سفیر رہ چکے ہیں ان کے والد بیرسٹر محمود دہلوی جو بمبئی پریزیڈنٹ کونسل کے ممبر تھے، نے حیدر آباد کی اس بلڈنگ میں اپنی وکالت کا دفتر قائم کیا تھا۔ اکبر ایس دہلوی نے قائد اعظم کی زندگی پر فلم بھی بنائی جو بہت مشہور ہوئی۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ایک اہم معلومات تحریر کر رہا ہوں کہ مشہور فلم اور ریڈیو اداکار مصطفیٰ قریشی بھی تلک چاڑی پر رہتے تھے۔تلک چاڑی پر ان کے مرحوم بھائی کی گھڑیوں کی دکان ''قریشی واچ'' کے نام سے موجود ہے۔اب مصطفیٰ قریشی صاحب کے بھتیجے جنید قریشی سنبھالتے ہیں۔تلک چاڑی پر بیشمار دکانیں ہیں جن میں گارمنٹس، کپڑوں اور جوتوں کی دکانیں ہیں۔ یہاں کا کوزی حلیم بہت مشہور ہے اور اس کے ساتھ ہی سندھی ادبی بورڈ کتاب گھر ہے۔ یہاں گھڑیوں اور چشموں کی دکانیں بھی ہیں۔ یہاں تاریخی پگٹ میموریل گرلز ہائیر سیکنڈری اسکول اور گورنمنٹ ایلیمنٹری کالج آف ایجوکیشن موجود ہیں۔ پگٹ اسکول مشنری اسکول جیکب روڈ تلک چاڑی پر ٹیچرز ٹریننگ اسکول کے سامنے واقع ہے۔حیدر آباد کے پرانے شہریوں کے مطابق یہ جگہ مشہور تاریخی کردار نانو مال کی تھی۔جس نے 1843ء میں میانی کی جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔اور اس سلسلے میں اسے بڑے بڑے انعامات ملے تھے۔ ٹیچرز ٹریننگ کالج فار مین 1887 میں قائم ہوا۔اس وقت کے ایجوکیشن انسپکٹر HP.Jacob کے دور میں مکمل ہوا۔ٹیچرز ٹریننگ کالج فار وومین 1871 میں تلک چاڑی پر چرچ کے برابر میں قائم ہوا، جسے دیوان نول رائے شوقی رام نے انتہائی شوق سے بنوایا تھا۔

گول بلڈنگ بازار

اس بازار کا تاریخی پہلو یہ ہے کہ کسی زمانے میں گورنمنٹ ہائی اسکول سوسائٹی کے سامنے کھوکھر محلے کے شمال مغرب میں ایک گول پارک تھا۔ 1963 میں اس خوبصورت پارک کو ختم کر کے میونسپلٹی نے ایک جدید گول مارکیٹ بنائی۔ جو گول بلڈنگ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کی زمینی منزل پر فرنیچر کی دکانیں اور اس سے اوپر تین منزلوں تک دفاتر اور فلیٹ ہیں۔ یہاں گارمنٹس موٹر سائیکل کی دکانیں ہیں، کھانے کے ہوٹل، پرنٹنگ پریس ہیں۔

لطیف آباد کے بازار

محترم قارئین! اب تک میں نے حیدر آباد سٹی کے تاریخی اور اہم بازاروں کے بارے میں آپ کو اپنی تحقیقی معلومات فراہم کیں۔ آیئے اب میں آپ کو حیدر آباد کے تعلقہ لطیف آباد کے بازاروں میں چلتے ہیں۔

100 سال پرانا
نول رائے کھنڈ گھر

سب سے پہلے لطیف آباد کے بارے میں جانیے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے خاندانوں کے لیے شاہ لطیف آباد نامی یہ ٹاؤن 1952ء میں قائم ہوا۔لطیف آباد کے علاقوں کو گنتی کے نمبروں سے پکارا جاتا ہے۔ ان تمام نمبروں میں مختلف قسم کے بازار موجود ہیں۔ لطیف آباد کی شروعات پونے 7 نمبر سے ہوتی ہے۔ پونے 7 میں شاہراہ پر ریسٹورنٹ، کڑاہی مرغی اور فرائی سینٹر موجود ہیں۔ انارکلی بازار کمپیوٹر کی مارکیٹ ہے، یہاں شاہ لطیف ڈیری ہے، یہاں کی ربڑی بھی بہت مشہور ہے۔ اس روڈ پر تمام بینک اور فوٹو اسٹیٹ کی دکانیں، فروٹ والے سینٹ الزبتھ اسپتال بھی جسے امریکن اسپتال بھی کہتے ہیں۔ یہ اسپتال کیتھولک چرچ مشن کے تحت 1958ء میں قائم کیا گیا تھا۔

یہاں بسم اللہ اسکوائر کے نیچے اور سامنے ہول سیل انڈوں کی دکانیں ہیں، اس کے سامنے لطیف آباد کی مشہور عادل بیکری ہے۔ یہاں برگر، شورما، بروسٹ اور دیگر فاسٹ فوڈز کی دکانیں ہیں۔ 7 نمبر کے اندر آتے ہیں تو سبزی فروش کے ٹھیلے، پرچون، شاپس، گائے اور بکرے کے گوشت کی بڑی مارکیٹ ہے۔ 8 میں ایک بہت بڑی جامع کلاتھ مارکیٹ ہے۔ اسے لیڈیز بازار بھی کہا جاتا ہے۔ جامع کلاتھ مارکیٹ یونٹ نمبر 8 جسے حیدر آباد کے چوڑی کے مشہور تاجر سیٹھ محمد دین نے بنائی تھی۔ یہاں پارکنگ کی سہولت ہونے کی وجہ سے اندرون سندھ اور قاسم آباد کے شہری بھی خریداری کرنے آتے ہیں۔ دستیاب اشیا میں لیڈیز گارمینٹس، چوڑیاں، جیولری ہے بچوں کے گارمنٹس نے جوتوں اور چپل کی دکانیں، لیڈیز بیگ، میک اپ، گھڑیاں، برتن، چشمے، سناروں کی دکانیں۔اس کے علاوہ لطیف آباد کے ہر نمبر میں بازار موجود ہیں۔ ہر طرف مارکیٹوں کا دور دورہ ہے۔شہر کا ہر مکان ٹوٹ کر مارکیٹ میں بدل رہا ہے۔

قاسم آباد کا بازار

حیدر آباد ڈویلپمنٹ اتھارٹی نے بیسویں صدی کے آخری عشروں میں قاسم آباد کی بنیاد رکھی۔ یہ حیدر آباد کے خوبصورت علاقوں میں سے ہے۔ اس میں نسیم نگر، گلستان سجاد، عبداللہ ہومز، سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی واقع ہیں۔ انورولاز، قاسم آباد فیز I اور II شامل ہیں۔ ہر علاقے میں بیشمار بازار موجود ہیں۔ نام محمد بن قاسم کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کے بازاروں میں نسیم نگر چوک بازار، علی پیلس' قاسم آباد پکوڑا چوک یا اسٹاپ بازار، مہران سینٹر، علمدار چوک بازار، سٹیزن کالونی بازار، وادھوواہ روبازار شامل ہیں۔

قارئین محترم! یہ تھا حیدر آباد کے بازاروں کا آنکھوں دیکھا احوال اور تحقیق، امید ہے اس کاوش سے قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ جو قارئین حیدر آباد کے مقامی تھے لیکن بعد میں دوسرے شہروں اور بیرون ملک منتقل ہو گئے یقیناً اپنے پرانے شہر حیدر آباد کے بازاروں کی تازہ ترین معلومات اور ناموں سے ضرور محظوظ ہوں گے۔ اگر کبھی بھی قارئین حیدر آباد گھومنے پھرنے آئیں تو اس مضمون کی مدد سے رہنمائی حاصل کر کے بازاروں کا دورہ کر کے شاپنگ کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر حیدر آباد کے تاریخی بازاروں، شاہی بازار اور ریشم گلی ضرور جائیں اور حیدر آباد کے کھانوں سے بھی لطف اندوز ہوں۔ ۞

گوجرانوالہ کی معیشت

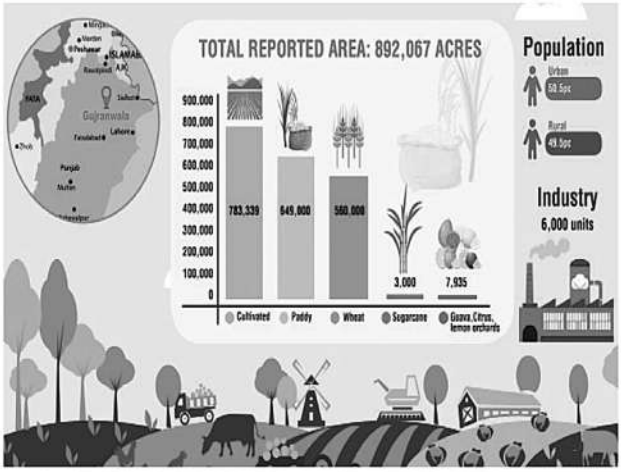

”صدام ساگر۔ گوجرانوالے کی ممتاز ادبی شخصیت ہیں۔ شاعر ہیں۔ ادبی رسالوں میں ان کی تخلیقات شامل اشاعت ہوتی ہیں۔ ہماری درخواست پر گوجرانوالے کی معیشت کے بارے میں بہت اہم معلومات پر مبنی تحریر نذر قارئین کر رہے ہیں۔ گوجرانوالہ پاکستان بننے سے پہلے بھی اپنے جفاکش ہنر مندوں کی مہارت کے لیے مشہور تھا۔ اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گوجرانوالہ قدیم و جدید صنعتوں تجارتوں کا مرکز بن گیا ہے اور پاکستان کی معیشت کے انتظام میں اس کا مرکزی کردار ہے۔“

پنکھے واشنگ مشینوں سمیت دوسری مشینیں بنانے والے کارخانے

تحریر، صدام ساگر

پاکستان کے دیگر شہروں کی طرح گوجرانوالہ شہر بھی تاریخ کے اوراق میں اپنی مقبولیت کا حامل ہے۔ تاریخ کے اوراق کے مطابق گوجرانوالہ کو گوجروں نے آباد کیا جو کشمیر کے پہاڑوں پر مقیم تھے اور بعد میں ایران کے شیرازی قبیلے نے اس شہر کا نام ”خان پور سانسی“ رکھا تاہم بعد میں اس کا پرانا نام ”گوجرانوالہ“ دوبارہ رکھ دیا گیا۔ آج بھی دنیا بھر میں جہاں فنِ پہلوانی کی وجہ سے

جدید شاپنگ مال بھی اور پرانی کریانہ دکانیں بھی

مقبولیت کا حامل ہے وہیں دنیا بھر میں اس کی خوبصورتی کا ڈنکا آج بھی بج رہا ہے۔ ہر شہر کی طرح گوجرانوالہ بھی اپنے گلی کوچوں میں روشن مینار کی طرح کھڑی تاریخی عمارتوں اور بازاروں سے بہت مقبول سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مختلف مشہور بازاروں میں ”بازار خراداں“ جہاں پر ہر قسم کی ٹیکنکل مشینوں کے چھوٹے سے چھوٹے اوزار با آسانی مل جاتے ہیں، ڈسکہ، سیالکوٹ وزیر آباد، گجرات، پسرور، نارووال، شیخوپورہ و دیگر شہروں سے لوگ یہاں خریداری کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ ”دال بازار“ اس بازار میں ضروریاتِ زندگی سے وابستہ اشیاء کی خرید و فروخت کی جاتی ہیں، گلی محلوں میں چھوٹے بڑے کریانہ سٹور والے سب یہیں سے خریداری کرتے ہیں۔ اس بازار میں بکنے والی زیادہ تر اشیاء میں شامل دال، چنا، چاول، چینی، گھی، شکر، صابن وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

گوجرانوالہ کے بازار:

”ریل بازار“ اس بازار کی بات کریں تو یہاں جوتی، کپڑا اور ضروریاتِ زندگی سے متعلق ہر قسم کی دوکانات موجود ہیں۔ ”ٹکا چوک“ اس بازار میں داخل ہوتے سب سے پہلے گوجرانوالہ کی مشہور مٹھائی ”سیالکوٹ سویٹس“ کے رس گلے اور گلاب جامن کھانے کو من کرتا ہے۔ اس بازار میں سائیکل، سلائی مشین، دیگیں اور چند کپڑوں کی دکانات موجود ہیں۔ ”بازار سیدنگری“ اس بازار میں دن اور شام کے وقت روشنی کا نظارہ خوب دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس بازار کو سنیما بازار بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ یہاں پر سونے اور چاندی کی ہول سیلز دکانیں موجود ہیں، اس بازار میں شام کے گیارہ بجے کے بعد بلے کے گرما گرم چڑے اور بٹیرے بھی کھانے کو ملتے ہیں، جبکہ جمعہ چھٹی کے روز اس بازار میں قیمے والی نان نکی اور مختلف ضروریاتِ زندگی کی اشیا کو سستے بازار کی طرح سجایا جاتا ہے۔ اس بازار میں بٹالا میڈیکل سٹور کے نام سے سات شاپس موجود ہیں۔ اس بازار سے چند قدموں کی دوری پر تھانے والا بازار ہے یہاں گوجرانوالہ کا سب سے پرانا تھانہ کوتوالی ہے جس وجہ سے اس بازار کا نام مشہور ہوا۔ اسی بازار میں شہباز تکہ شاپ جہاں رات ہوتے ہی لوگوں کا ہجوم دیکھنے والا ہوتا ہے۔ اس بازار میں حکیموں کے پرانے دواخانے آج بھی موجود ہیں۔ اس بازار کے ساتھ ایک چھوٹے سے بازار کو تمبا کو بازار بھی کہا جاتا ہے جہاں تمباکو، چھریاں، قینچیاں تیز کی دکانوں کے علاوہ ہومیو پیتھک

بازار خراداں ٹیکنیکل اوزاروں کے لیے مشہور

سٹور اور دھاگے کی دکانیں موجود ہیں۔ تھانے والا بازار سے باہر نکلے تو ہیری والا چوک آجاتا ہے جہاں گوشت، دہی، دودھ، کریانہ سٹور اور چاندی کے ہول سیل ڈیلر کی دکانیں پائی جاتی ہیں۔ منگل بدھ گوشت کی چھٹی ہونے پر اس بازار سے آپ کو گائے کا گوشت با آسانی مل جائے گا۔ اس بازار کو کچھ لوگ چین کے بازار سے بھی مخاطب کرتے ہیں۔ شائد اس لیے یہاں کئی کئی مہینوں کا گوشت اور پائے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہیری والا چوک میں ڈاکٹر کیپٹن رشید کے گھر کی عمارت سب سے پرانی ہے جسے اس بازار کی یادگار عمارتوں میں سے ایک کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی ایک

قابل آدمی تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند مخلوقِ خدا کی خدمت میں مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔ اسی بازار میں کبھی ایک مندر بھی ہُوا کرتا تھا جو آج کھنڈر کی صورت میں ویران پڑا ہے۔ اسی بازار میں ایک تاریخی مسجد بھی واقع ہے۔ جہاں آتے جاتے ہوئے بچوں کی قرآن پڑھنے کی آوازیں سنائی دیتی ہے۔ اسی بازار کے آخر میں چوڑی بازار موجود ہیں جہاں خواتین کی کثیر تعداد رنگ برنگ کی چوڑیاں خریدنے آتی ہیں۔ گوجرانوالہ کا

**ریل بازار۔ بازار سید نگری۔
تھانے والا بازار۔ تمباکو بازار۔
چوڑی بازار۔ لنڈا بازار**

سب سے مشہور چوک جسے گھنٹہ گھر بازار کہا جاتا ہے۔ اس بازار میں ڈھولک بنانے اور شادی اور دیگر تقریبات پر سجاوٹ کا سامان ، برتن، جوتے اور کھانے پینے کی شاپس موجود ہیں۔ اسی بازار کے مشرق میں گورنانک پورا بازار موجود ہیں جہاں صبح کے ناشتے سے لیکر رات گئے تک کھانے پینے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اسی طرح گوجرانوالہ کا دوسرا سب سے مشہور بازار لنڈا بازار ہے جو ریل کی پٹری کے ساتھ واقع ہے۔ یہاں ہر طرف آپ کو پٹھانوں کی دکانوں پر جوتے، بیک، پردے اور صوفہ کے کپڑے کے ہر ورائٹی دیکھنے کو میسر ہوگی۔ اس بازار میں جب بھی جائیں یہاں رش عوام کا کم نہیں ہوتا۔ گوجرانوالہ کا تیسرا بازار جسے اُردو بازار کہا جاتا ہے اس بازار میں حافظ بک ڈپو، شمس بک ڈپو، انور سیلز بک ، فضل بک پوائنٹ سب سے مقبول ہیں۔ اس بازار میں پُرانی کتابوں کی دکانیں لاتعداد موجود ہیں۔ اس بازار میں کرکٹ

**اُردو بازار۔ نصابی کتابوں۔ ادبی
مطبوعات اور پرانی کتابوں کے لیے**

کا سامان اور کرکٹ کٹ کی شاپس بھی موجود ہیں۔ اس بازار میں گزرنے والوں کی آمدورفت کا رش زیادہ رہتا ہے۔ گوجرانوالہ کا چوتھا مشہور بازار جناح بازار ہے جہاں دلہن کے لئے لہنگے، فراکیں، گون اور ہر قسم کے کڑھائی والے سوٹوں کی بڑی بڑی دکانیں موجود ہیں۔ گوجرانوالہ کا پانچواں بازار برتنوں کے نام سے برتن بازار سے مشہور ہے یہاں خصوصاً شادی کے موقع پر بیٹیوں کے جہیز کے لیے برتن خریدے جاتے ہیں۔ ویسے تو گوجرانوالہ کا حاجی پورا بازار اپنی شہرت کے لحاظ سے کسی سے کم نہیں یہاں پر بھی ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی کی اشیا دستیاب ہیں۔ اس بازار سے قبل روئی والا بازار آتا ہے جہاں آرٹیفشل جولری ہول سیلز اور دلہن میک اپ کا سامان فروخت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ گوجرانوالہ شہر میں دیگر بہت سے ایسے بازار موجود ہیں جو اپنی شان وشوکت کے اعتبار سے شہرت کے حامل ہیں۔

گوجرانوالہ میں تجارت کے شعبے:

آج کے جدید دور میں صنعتی شعبہ کسی بھی ملک کی معاشی شرح نمو کے فروغ اور عوامی فلاح و بہبود کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مختلف ممالک کی طرح پاکستان میں بھی حکومتیں اقتصادی سست روی سے بچنے کے لئے ہمیشہ متحرک صنعتی شعبے کی متمنی رہی ہیں اور بعض مشکل حالات کے دوران بھی شعبہ کی معاونت کا عمل جاری رہا۔ اس حوالے سے ہر طرح کے ممکنہ اقدامات ہر شہر میں کئے جاتے ہیں۔ جس سے نہ صرف برآمدات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ غیر ضروری قرضوں کے بوجھ سے نجات میں بھی مدد ملتی ہے۔ پاکستان کے دیگر شہروں کی طرح گوجرانوالہ شہر بھی تجارتی شعبے

میں کسی سے پیچھے نہیں۔ یہاں بڑی بڑی فیکٹریوں، کارخانوں اور بازاروں میں لاکھوں، کروڑوں ررپے کی مالیت کا کاروبار ہوتا ہے۔ کبھی کبھار پاکستان کے کشیدہ حالات کے برعکس کاربار کے اُتار چڑھاؤ، بدعنوانی، اقرباء پروری اور ایڈہاک ازم کی وجہ سے معاشی ترقی کا عمل اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ دو وقت کی روٹی کمانے والے مزدور سڑکوں پر احتجاج کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ میرے نزدیک ترقی پذیر ممالک میں اکثر اس طرح کے حالات ہوتے ہیں، جہاں پر مقتدر حلقے قومی وسائل کو ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان کو بھی اس طرح کے حالات کا سامنا رہا جب ماضی کی حکومتوں کی پالیسیوں کی وجہ سے صنعتی شعبہ بری طرح متاثر ہوا اور کئی صنعتی شعبے بند ہوئے تو دیگر صنعتی اداروں کی پیداوا چالیس فیصد تک کم ہوگئی۔ جس میں سب سے زیادہ متاثرہ شعبہ پاور لومز کا تھا۔ گوجرانوالہ میں تجارتی شعبوں کے اعتبار فرنیچر، کپڑا ، سٹیل برتن، موٹر پمپ، پلاسٹک پائپ اور دیگر شعبے نمایاں ہیں جو پاکستان کی ترقی و خوشحالی میں مالی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ گوجرانوالہ میں سب سے زیادہ تجارت فرنیچر اور الیکٹرک مصنوعات کی ہوتی ہیں۔ یادر ہے یہ شہر چاول اور گندم کی تجارت میں بھی کسی سے کم نہیں۔

روایتی کاروبار:

گوجرانوالہ میں راج گیری، کھڈی، ہوٹل کوکنگ، فرنیچر پالش، لوہا ویلڈنگ، کباڑ خانہ، گاڑیوں کی مرمت، ، موبائل، لیپ ٹاپ ریپرنگ، صوفہ اور پردے کا کپڑا سمیت بہت سے روایتی کاربار ہیں جو اس خوش خوراک شہر کے لوگوں کا لہو گرم رکھے ہوئے ہیں۔

غلہ منڈی:

گوجرانوالہ میں غلہ منڈی گوندالہ والا چوک سے آگے پُرانے لاری اڈے کے پاس واقع ہے۔ جہاں ہر سال گندم کی کٹائی ہونے پر گوجرانوالہ کے کسان اپنی گندم فروخت کرنے کے لیے آتے ہیں۔ اس منڈی میں شہر کے لوگوں کے لیے سارا سال گندم کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ گوجرانوالہ میں آٹے کی ملز کے مالکان اسی منڈی سے گندم کی خرید و فروخت کو ترجیح دیتے ہیں۔ بہت سے دیگر چھوٹے بڑے شہروں کے خریدار بھی یہیں سے گندم خریدنے آتے ہیں۔ مجھے گوجرانوالہ کی غلہ منڈی میں جانے کا کئی بار اتفاق ہو چکا ہے یہاں پر ہر قسم کی فصلوں کے لیے بیجوں کے اسٹور موجود ہیں۔ جہاں کیڑا مار ادویات دستیاب ہیں۔

سبزی منڈی:

سبزی منڈی کا مطلب وہ جگہ جہاں ترکاریاں، سبزیاں اور پھل وغیرہ بکتے ہیں۔ دیگر ممالک کی طرح پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں سبزی منڈیاں قائم کی گئی ہیں۔ گوجرانوالہ میں سب سے پُرانی سبزی منڈی اندرونِ شہر نیائی چوک سے پانچ منٹ کے فاصلے پر واقع ہے جس کا کچھ حصہ نئی دکانیں اور نئی عمارتیں بننے سے کم ضرور ہوا ہے مگر پُرانی سبزی منڈی کا نام ونشاں ختم نہیں ہوا۔ یہ منڈی کئی برسوں سے اپنی اصل شکل میں یہیں پر موجود ہے۔ شہر کی آبادی بڑھنے کی وجہ سے نئی سبزی منڈی شہر کے باہر اعوان چوک اور کھیالی چوک کے درمیان میں بنائی گئی۔ جہاں صبح فجر کی اذان ہوتے ہی سب بوپاری سبزی اور فروٹ کی خرید وفروخت کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ منڈی پہنچنے پر سب پہلے مسجد میں فجر کی نماز ادا کرتے ہیں پھر سب بیوپاری گاڑیوں کے اُوپر تشریف لے جاتے ہیں اور بولی لگائی جاتی ہیں اور خریدار مال خریدنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس نئی سبزی منڈی کو گوجرانوالہ کی سب سے بڑی سبزی منڈی کہا جاتا ہے۔ ہمارا گھر اسی نئی سبزی منڈی کے قریب تھا کیوں کہ میرے والد فروٹ کے کاروبار سے منسلک تھے۔ وہ اپنے کام کے بااصول اور ایماندار آدمی تھے۔ مجھے ان کے ساتھ کئی بار یہاں فروٹ بیچنے کا موقع میسر آیا۔ میرے نانا ابو شہر کے بہت بڑے بیوپاری تھے وہ امرود کے باغ، جامن کے باغ اور تربوز اور خربوز کی زمینیں ٹھیکے پر خرید کراُن کی آبیاری کرتے اور پھر کچھ ماہ کے بعد پھل کو اسی منڈی میں فروخت کرنے کے لیے لاتے۔ مجھے اپنے ماموں کے ہمراہ کئی بار آنا پڑا۔ والد اور نانا کی وفات کے بعد اس منڈی میں جانے کا جب بھی موقع ملتا ہے تو پُرانی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ مگر کچھ ہی دیر میں ہجوموں میں یہ یادیں گم ہوجاتی ہیں۔ بہرحال اس سبزی منڈی میں بڑے بڑے اسٹور قائم ہیں جہاں کیلے، مالٹے اور دیگر فروٹ اور سبزیوں کو محفوظ کر کے مہنگے داموں بیچا جاتا ہے۔ منڈی کے قریب لوگ یہیں پر محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ ہرشہر کی طرح میرا شہر گوجرانوالہ بھی سبزی منڈی کے بنا ادھورا ہے۔

غلہ منڈی۔ سبزی منڈی میں کروڑوں کی تجارت

کارخانے ان کی نوعیت، معلومات:

لاہور، کراچی، فیصل آباد سمیت دیگر شہروں کی طرح گوجرانوالہ میں بھی بے شمار کارخانے موجود ہیں۔ گوجرانوالہ میں سب سے زیادہ کارخانے گوندالہ والا چوک سے نعمانیہ روڈ گزرتے ہی دھلا روڈ پر مین سڑک سے ملحقہ گلیوں میں موجود ہیں جہاں موٹر پمپ سمیت دیگر مشینوں کے چھوٹے بڑے اوزار بنائے جاتے ہیں۔ یہاں سٹیل کی چادر کو کاٹ کر لوہے کے دروازے اور گیٹ بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ نوشہرہ روڈ کی بات کریں تو یہاں برتنوں کے کارخانے پائے جاتے ہیں۔ سیالکوٹ روڈ کی طرف آئیں تو یہاں واشنگ مشینیں اور پنکھے بنانے کے کارخانے اور فیکٹریاں موجود ہیں۔ کارخانوں میں مشینوں اور پنکھوں کے خراد مشین پر روٹر بنائے جاتے ہیں جبکہ فیکٹریوں میں ان کی فروخت اور دیگر شہروں اور ممالک میں سپلائی بھیجی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جوتے بنانے کے کارخانے، کھڑکیوں اور دروازوں میں شیشے کی کاریگری کے مراکز بھی موجود ہیں۔

ماضی کی حکومتوں کے غلط فیصلوں سے صنعتی شعبہ متاثر

پرانی دکانیں، محلوں کے کریانہ سٹور:

ہر شہر کی گلیوں میں پُرانی عمارتوں کی طرح پُرانی دکانیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ گوجرانوالہ میں بھی ایسی بہت سی پُرانی دکانیں بھی موجود ہیں۔ عمارتیں تاریخی ہوسکتی ہیں مگر دکانیں نہیں کیوں کہ عمارتیں پاکستان بننے سے قبل کی ہیں اور دکانیں پاکستان بننے کے بعد تعمیر ہوئیں۔ گوجرانوالہ کے محلہ گرنانک پورا میں بہت سی پرانی دکانیں موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ دکانوں کی از سرِ نو تعمیر کی گئی ہے، تو کچھ اپنی پُرانی حالت میں آج بھی برسوں کی یادوں کو تازہ کیے ہوئے ہیں۔ سیالکوٹی دروازہ میں بھی بہت سی پرانی عمارتوں کے ساتھ دکانیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ گرجاکھی دروازہ کالج روڈ پر بھی لاتعداد پُرانی دکانیں اور محلوں کے یادگار کریانہ سٹور موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر پرانی محلوں میں جناح پارک (رام بستی)، محلہ شمس آباد، محلہ تلاب دیوی، کچی پمپ والی، رشید کالونی، وحدت کالونی، پیپلز کالونی، بہاری کالونی، محلہ فقیر پورہ، فرید ٹاؤن، فروز والا، عثمان پارک، سٹیلائٹ ٹاؤن، ماڈل ٹاؤن، محلہ لیاقت آباد، کشمیر ٹاؤن، محلہ کمبوہ کالونی، گلزار کالونی، راجہ کالونی، جگنہ، کچی فتو منڈ، پکی فتومنڈ، سول لائن، گورنانک پورہ، محلہ بختیا والا، اللہ بخش کالونی، تاج پورہ، سراج پورہ، بگلر آبادی، کھیالی، محلہ ریتا والا، زاہد کالونی، محلہ باغ والا گرجاکھ وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ وزیر آباد، کامونکی، موڑ ایمن آباد اور ننڈی پور ودیگر اضلاع میں پُرانی دکانیں اور محلوں کے کریانہ سٹور آج بھی موجود ہیں افسوس کہ پرانے چہرے آج ہم میں نہیں۔

گوجرانوالہ کے شاپنگ مال:

پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں کی طرح گوجرانوالہ میں بھی بہت سے ایسے شاپنگ مال قائم کیے گئے ہیں جہاں لوگ اپنی فیملی کے ہمراہ رات گئے تک شاپنگ کرتے ہیں۔ گوجرانوالہ کے ان مشہور شاپنگ مال کی فہرست میں سب سے پہلے نمبر پر گوجرانوالہ مال آتا ہے، اس کے علاوہ کنگ مال، Chess up mall، ڈار مال، علینہ شوپنگ مال، Carrefour mall، النور مال، Rainbow mall اور الامین مال شامل ہیں۔ جہاں ہر قسم کے برانڈ کی چیزیں بڑی سہولت سے مل جاتی ہیں۔ یہ سب مال اپنی صفائی اور خوبصورتی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے منفرد نظر آتے ہیں۔

گوجرانوالہ کے مشہور برانڈ:

آج کے اس جدید دور میں ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو برانڈ کا نام دیں دیا گیا ہے۔ گوجرانوالہ کے ایسے ہی کچھ مشہور برانڈز میں Sapphir, Al kram, J, MtG, Bonanza satrangi, Limelight, Khaddi, Breeze, Sanasafinaz, Zellbury, Bin saeed, ithad, VS Textiles mills, Orient Textiles, Borjan, Stylo, Mettro, Endure جیسے برانڈ شامل ہیں۔ جہاں اعلیٰ کوالٹی کے جوتے، کپڑے اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی اشیا موجود ہیں۔ ان میں بہت سے برانڈ آپ کو گوجرانوالہ کے سٹیلائٹ ٹاؤن میں ہی مل جائیں گے، اس علاقے کو گوجرانوالہ شہر کا دل بھی کہا جاتا ہے۔

میرے نانا پھلوں کے باغ ٹھیکے پر لیتے۔ سبزی منڈی میں فروخت کرتے

کمپیوٹر، انفارمیشن ٹیکنالوجی سے متعلق کاروبار:

کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی اب جدید زندگی کے تقریباً ہر پہلو میں ضم ہو چکی ہے، کیوں کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی مہارتیں بہت ساری صنعتوں پر لاگو ہوتی ہیں کہ تعلیم اور تجربہ رکھنے والے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس شعبے میں کام کرنا پسند کر سکتے ہیں، دیگر ترقی پسند ممالک کی طرح پاکستان نے بھی اپنے شہروں میں کمپیوٹر، ٹیکنالوجی سے انفارمیشن کے ڈیپارٹمنٹ کو بہتر بنانے میں کوشاں ہے۔ پاکستان کے ہر شہر کی طرح گوجرانوالہ میں بھی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو نافذ کیا گیا ہے۔ جس سے ہر لمحہ باخبر رہنے میں آسانی ہو سکے۔ دیگر شہروں کی طرح گوجرانوالہ میں کمپیوٹر کے متعلق کاروبار سول لائن کمپیوٹر مارکیٹ مشہور ہیں۔ جہاں کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کے ہول سیل ڈیلرز کے علاوہ اس کی ریپرنگ کے افراد بھی میسر آئیں گے۔ اس مارکیٹ میں کچھ ایسے ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں جہاں طالب علموں کو کمپیوٹر کے متعلق ہدایات فراہم کی جاتی ہیں۔ ۞

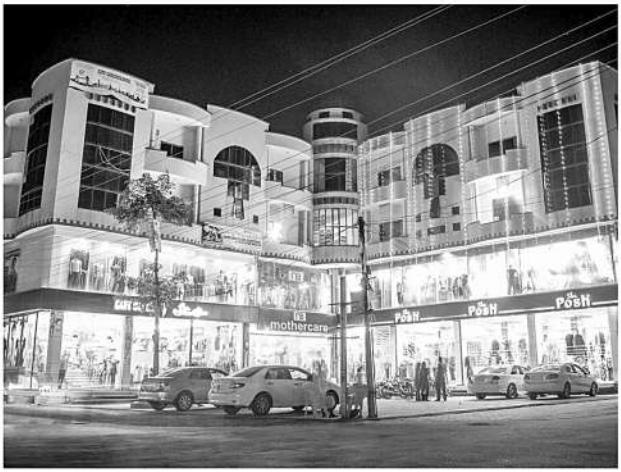

پاکستان کے شہروں کی معیشت۔ بازار کے موضوع پر ہماری درخواست کے بعد ڈاکٹر انور شاہین نے اپنی کتاب "پاکستان میں سماجی تبدیلی" سے ایک مضمون اپنے آبائی علاقے پھالیہ اور منڈی بہاؤ الدین کے بارے میں عنایت کیا ہے۔ ڈاکٹر انور شاہین، ڈاکٹر سید جعفر احمد کی رفیق حیات ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنفہ۔ پاکستان اسٹڈیز سینٹر جامعہ کراچی کے ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔

پنجاب کا تیزی سے بدلتا سماجی ومعاشرتی منظرنامہ

تحریر: ڈاکٹر انور شاہین

ایک سیاح نے مقامی شخص سے پوچھا: یہ سڑک کہاں جاتی ہے۔ وہ بولا: کہیں نہیں جاتی بس یہیں رہتی ہے۔ یقیناً سڑکیں وہیں کی وہیں رہتی ہیں اور رفتار زمانہ کو ٹک ٹک دیکھتی رہتی ہیں۔

جنگلوں میں تہذیبیں نہیں پلتیں اور بنا حرکت برکت نہیں ہوتی۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ تہذیبی ترقی کے لیے سفر اور رہگزر اہم عوامل ہیں۔ رہگزر چاہے کسی عظیم جرنیل بادشاہ کی تعمیر کردہ ہو یا محض انسانوں کے قدموں کی مستقل چھاپ سے اس کے نقوش واضح ہو گئے ہوں، کسی نہ کسی تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی عملیے سے ضرور وابستہ ہوتی ہے۔ اسی طرح کی ایک رہگزر ایک پختہ سڑک، ایک معروف شاہراہ میرے کیریئر کے سفر میں بھی محفوظ ہے لیکن اسے اس مضمون کا عنوان بنانا کیوں ضروری ہو گیا، اس کی داستان سنیئے:

ضلع منڈی بہاء الدین کے بیچوں بیچ گذرتی یہ سڑک زبانِ حال سے وہ کچھ بتا رہی ہے جو آج کے پنجاب میں تیزی سے بدلتے سماجی ومعاشی منظرنامے کا ایک اہم باب ہے۔ اس سڑک سے گزرے مجھے تقریباً پچیس سال ہو چکے تھے۔ آج اپنے کالج دور کی روزانہ کی گذرگاہ سے گذرنا مجھے عجیب سا لگ رہا تھا 1975-1977 کے دوران دو سال تک میں نے اس کی طوالت ناپی تھی اس کے ہر زیروبم کے ساتھ میں نے جھٹکے کھائے تھے اور اس کے گرد پھیلے کھیتوں، باغوں اور بستیوں کے نقوش جیسے ہمیشہ کے لیے مجھے ازبر ہو گئے تھے۔ میرے گھر (پھالیہ) سے منڈی بہاء الدین شہر کا فاصلہ تقریباً 20 کلومیٹر ہے اور اس کو طے کرنے میں کم سے کم 20 منٹ اور زیادہ سے زیادہ سوا گھنٹہ تک لگ جاتا تھا۔ تب ٹرانسپورٹ کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کی نظر کرم کے باعث طالبعلموں کا انٹر سٹی 20 میل تک کا کرایہ 10 پیسے تھا۔ بسوں والے یہ کرایہ وصول کرتے وقت ہچکچاتے تھے وہ کوشش یہ کرتے تھے کہ بسوں میں طلبہ کو سوار نہ کرائیں اور اگر کرا لیتے تو کرایہ نہ لیتے۔ یہ امر طلبہ کی پریشانی میں اضافہ ہی کرتا تھا۔ اس میں ایک اور مشکل ہم نے بڑھادی تھی جب لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی روزانہ ایک شہر سے دوسرے شہر جانے لگی تھیں۔ یہ جراتمندانہ قدم اپنے علاقے میں پہلی بار میں اور میری سات کلاس فیلوز نے میٹرک کے فوراً بعد فرسٹ ایئر میں داخلے کے لیے اٹھایا تھا۔ لڑکے تو پائیدان اور چھتوں پر سفر کر لیتے تھے، لڑکیوں کو لازماً بس کے اندر جگہ دینا ہوتی تھی۔ ضیاء دور کی ملبوساتی پابندیوں کے تحت ہم سب بڑی چادر ضرور اوڑھ لیتی تھیں ویسے بھی معاشرے میں اس کا چلن تھا اور کسی حد تک یہ پسندیدہ انداز بھی تھا۔ تاہم شریر عناصر نے ہمیں گاہے گاہے پریشان ضرور کیا۔ اس دور کے

فلور ملوں اور چاول چھڑائی کارخانوں کے دیوقامت پیکر

خاموش سفر نے مجھے مشاہدے کی تربیت بخشی۔ آج جب پچیس سال بعد میں نے اس سڑک کے خدوخال دیکھے تو اندازہ ہوا کہ اس ضلع سے ہجرت کر جانا اور پھر واپس آنا وقت کے دو نقاط کے درمیان ہونے والی تبدیلی کی دستاویز پیش کر رہا ہے۔ وہ ایک سست رفتار زمانہ تھا۔

آہستہ خرامی کا یہ حال تھا کہ بسوں کی تعداد بہت کم تھی، ٹرک بھی کم کم تھے۔ کار انتہائی کم تھی، چمکتی کاریں تو خال خال ہی تھیں۔ سڑک کنارے سائیکل چلاتے لوگ بھی کم تھے اس لیے کہ قصبوں کے درمیان فاصلہ زیادہ تھا۔ گاؤں کے درمیان اور کم فاصلے کے لیے لوگ گھوڑا گدھا استعمال کرتے تھے یا پیدل بھی چلتے تھے

(میرے نانا کے لیے تو پانچ سے دس کلومیٹر پیدل روزانہ چلنا عام تھا)۔آج اس سڑک کا منظر نامہ اتنا بدل چکا ہے کہ چمکتی دمکتی کاریں لگژری جیپیں فراٹے بھر رہی ہیں۔موٹر سائیکلوں کی وہ بھر مار ہے کہ لگتا ہے ہر شخص کے پاس ایک موٹر سائیکل ہے کم سے کم اور وہ بھی چمکتی ہوئی۔اکثر دکانوں میں کوئی ذی نفس نظر نہ آیا لیکن باہر چار پانچ موٹر سائیکلیں ضرور کھڑی تھیں۔ٹرانسپورٹ میں کوئی انقلاب آیا ہے تو وہ دیہات کے اعتبار سے تو موٹر سائیکل انقلاب (Revolution) ہے اور جو کاریں یہاں نظر آ رہی ہیں وہ شہر کے کار انقلاب کا آؤٹ فال یعنی ہلکا سا چھینٹا ہے۔ساتھ ہی نئی عوامی سواری ''چنگچی'' بھی حتی المقدور فراٹے بھر رہی ہے۔یہ نہ صرف قصبات کے درمیان فاصلوں کو پاٹ رہی ہے بلکہ شہروں کے اندر، گاؤں سے شہروں تک اور گاؤں کے اندر ہر کونے تک پہنچ رہی ہے۔یہ برق رفتار نہ سہی، سڑک کی ناہمواری کی راز دار ضرور ہے۔کم قیمت بھی ہے اور مسافروں کو مرضی کے راستوں کونوں، نکڑوں تک لے جاتی ہے۔غیر محفوظ کتنی ہی ہو، کسی کو اس کی پرواہ نہیں۔پرانی گول منہ والی تنگ کھڑکیوں والی بسوں اور لمبے ڈبوں کی جگہ اب ان گنت ہائی ایس وین اور APV نے لے لی ہے۔

اب ان تمام وسیلہ ہائے سفر کے مسافر بھی بہت بدلے بدلے لگ رہے ہیں۔یہ اب صاف ستھرے کلف دار شملے، بہت صاف قمیص، کرتوں اور تہبند والے کسان ہیں جو ایک چمکیلی موٹر سائیکل پر ایک دو یا تین اکٹھے سوار فراوانی سے آتے جاتے نظر آ رہے ہیں۔خواتین کسی طرح اس ایڈونچر میں پیچھے نہیں ہیں۔وہ بھی خوش لباس جدید تراش کے پوشاک پہنے، اکثر منہ سر نقابوں میں چھپائے، اپنے اپنے خوش ذوقی کے پیمانوں کے اعتبار سے پرس جوتے پہنے موٹر سائیکلوں پر ایک ایک یا دو دو سوار ہیں۔زندگی کا کارواں رواں دواں ہے۔معیشت کا پہیہ چل رہا ہے۔وطن پاکستان سے دور کسی فیکٹری، کسی زیر تعمیر پلازہ کسی ریستوران کی بھٹی یا کسی چمنی میں ان خوش پوش مسافروں کے بیٹے، بھائی، شوہر، باپ، دھول دھوپ میں لپنے، خطرات سے کھیلتے، غیر انسانی جبر اور اندھے قانون تلے خون پسینہ ایک کر کے ریال اور ڈالر کما رہے ہیں۔ہماری سڑکوں اور ہمارے کھیتوں کا، شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کا منظر بدل رہا ہے۔انسانوں کی خوراک، پوشاک، رہائش، ذوق اور ادراک سب بدل رہا ہے، قیمت کون دے رہا ہے، کون سوچتا ہے، البتہ تنخواہ سیکڑوں ڈالر میں ملتی ہے، یا ہزاروں میں، اس کا فوری حساب ایک ان پڑھ کسان بھی جانتا ہے۔

اس سڑک کنارے کے کیا کیا مناظر میری یادداشت کے دریچوں میں محفوظ تھے، آج غور کیا تو سبھی تقریباً گم گشتہ تھے۔میں نے مانگٹ قصبے کا قبرستان دیکھا۔یہ اپنی جگہ قائم تھا، قبریں حرکت نہیں کرتیں۔لیکن اس قبرستان کی پرانی چاردیواری اب نیچے ہو کر سڑک کی بتدریج بڑھتی اونچائی میں دبتی جا رہی تھی، اس لیے اس کے اوپر خوب صورت ڈبوں والی اضافی دیوار بھی نظر آ رہی تھی۔قبرستان گذشتہ پچیس برسوں میں بہت بڑا ہو گیا تھا۔قبروں پر کتبے اب زیادہ ہو گئے تھے۔سنگ مرمر کے کتبے بھی بہت نمایاں ہو گئے تھے۔اب سیمنٹ کی سلوں کی ہمراہی میں ان کی

کل کی خستہ دکانیں۔آج نئے رنگ۔
اشتہاروالی اڑھائی سو دکانیں

سفیدی بھی زیادہ نمایاں ہو رہی تھی ورنہ ماضی میں تو یہاں خال ہی کوئی قبر پختہ نظر آتی تھی۔اسی قبرستان کے کنارے پر موجود کسی صوفی بزرگ کا مزار آج زیادہ اچھے رنگ و روغن سے چمک رہا تھا۔ترسیلاتی ڈالروں نے قبرستان کا چہرہ بھی بدل دیا تھا۔موت

کا اہتمام اب زیادہ ہوتا ہے اس لیے کہ اب زندگی کا اہتمام بھی زیادہ ہونے لگا ہے۔

اسی سڑک کے کنارے اپنے آپ میں مست پرانے خاموش

ہیڈ کھوکھرا سے نکلنے
والی تین نہریں

زمانوں کی کچھ یادگاریں اور مناظر ابھی باقی ہیں۔کہیں کہیں کھیتوں میں رات کو مویشیوں کو باندھنے کے لیے بکھری کھرلیاں (چارہ دان) نظر آ رہی ہیں، اس بے گھری کا اصل مقصد مویشیوں کے گوبر کو کھیتوں میں بکھیرنا ہوتا ہے۔کہیں کہیں کھیتوں کے درمیان سیدھی چھتوں والے چھپر، جن کے ستون اور شہتیر اکثر کیکر کی ٹیڑھی میڑھی لکڑی سے بنے ہوتے ہیں، موجود ہیں۔کہیں کہیں گندم کے بھوسے کے دیسی ذخیرہ خانے بھی ہیں۔لیکن یہ سارے منظر جن ہیولوں کے پیچھے دھندلا گئے ہیں وہ ہیں متعدد فلور ملوں اور چاول چھڑائی (Rice-Husking) ملوں کے دیو قامت پیکر، جن میں سے کچھ اچھے تعمیراتی ذوق کی تقسیم کے مظہر بھی ہیں۔اور انہی کناروں پر ابھرتے عالیشان رہائشی محلات کے منظر جو اپنے مالکان کی جدت طرازی، نمائشی افتاد طبع اور مسرفانہ مزاج (Hyper Consumerism) کے شاہکار ہیں۔مکانات کیا ہیں، چہار دانگ عالم کے تعمیراتی نمونوں کا ملغوبہ، کہیں پگوڈا نما چھتیں ہیں کہیں کنول نما ٹنکیاں، کہیں چمکیلے شیشوں سے مزین فلک بوس پلازوں کے منی ایچر کسی چھت پر عقاب اپنے شکار کو دبوچ رہا ہے، تو کہیں بحری جہاز کا ماڈل بنا ہے غرض جو کچھ کرہ ارض کے براعظموں میں ہو رہا ہے، یا کہیں ہو سکتا ہے، یہاں کی تعمیرات میں متنوع انداز میں متشکل ہو رہا ہے۔اس تعمیراتی بھاگ دوڑ کے تقاضوں کے تحت سڑک کنارے اکثر جگہوں پر سنگ مرمر کی فیکٹریاں ہیں۔ہر طرح سے تعمیراتی سامان کے ہر انداز کے اسٹور ہیں۔اور بھٹوں کی چمنیوں کا بل کھاتا دھواں لال لال اینٹوں کی تیاری کا اشاریہ، سب بھرپور انداز میں نظر آ رہا ہے۔انہی بھٹوں پر اینٹیں بنانے، ڈھونے، بھٹے میں جوڑ کر پکانے اور پھر واپس نکالنے والے اپنے کام میں مگن ہیں۔خون پسینہ آج بھی یہاں ایک ہو رہا ہے اور انسانیت کی تذلیل کے جو انداز یہاں عشروں قبل قائم ہوئے تھے، آج بھی قائم ہیں۔ترسیلات زر نے اس استحصالی نظام کو لازما

مہمیز کیا ہے، اس پر بند نہیں باندھا۔ منڈی بہاء الدین سے چل کر بس چند منٹ میں کنگ روڈ کے اسٹاپ پر پہنچ جاتی تھی جہاں اکثر یہ پندرہ سے بیس منٹ تک کھڑی رہتی۔ یہ چونکہ سرگودھا، بھلوال سے آتی سڑک کا جنکشن تھا اس لیے اس کنکشن کے مسافر لینے کا لالچ ہوتا تھا۔ ہم طالبات سرد و گرم موسموں میں پگھلتی ٹھٹھرتی، کڑھتی، جلتی اپنی سیٹ پر بیٹھے رہنے پر مجبور تھیں۔ اسی اسٹاپ پر ایک شخص وکس (Vix) ٹافیاں بیچنے والا روزانہ بس میں بلا ناغہ آتا اور کافی دیر تک اپنی تقریر سے ہمیں نوازتا۔ اس کی روزانہ تقریباً پندرہ سے بیس روپے کی ٹافیاں بکتی ہوں گی لیکن وہ کئی برسوں تک اس دھندے سے چمٹا رہا۔ میں نے اس کو اس کی جوانی سے بڑھاپے تک صرف ٹافیاں بیچتے اسی بس اسٹاپ پر صبح سے شام تک کی بسوں میں دیکھا۔ یقیناً اس کا کوئی اور روزگار نہ تھا۔ کیا اسے دبئی چلو اور پھر یورپ، ولایت یا ملائشیا چلو کی خبر نہ ہوئی تھی۔

بس اسٹاپ جو بڑے قصبوں کے تھے ان پر موجود چند دکانوں کے آج خستہ ڈھانچے یہ بتا رہے تھے کہ یہ وہی پرانی دکانیں ہیں۔ لیکن ان کے بورڈ اور گلھڑا سب بدل گیا تھا۔ نئے رنگ کے نعرے، ماڈرن اشتہار، سب کچھ نیا اور کسی حد تک عجیب بھی لگ رہا تھا جس جگہ پہلے پانچ دکانیں تھیں، آج وہاں ڈھائی سو دکانیں ہیں۔ کچھ خوب صورت نام اور اسراف کے نئے انداز بھی فروغ پا چکے ہیں۔ ست سرا، جوسات سڑکوں کے سنگم کے مقام کا نام تھا، آج وہاں Seven Way Hotel بنا ہوا ہے۔ کئی خوب صورت ناموں کے بلوریں میرج ہال ادھر ادھر بہار دکھا رہے ہیں۔ گولڈن پائپ بینڈ کی دکانوں کے باہر اشتہارات کا اژدہام ہے جو اسی کاروبار سے متعلق پروڈکٹس کو پوری قوت سے بیچ رہا ہے۔ سامنے سفید رنگ کی شاہانہ بھی کھڑی ہے جو دبئی پلٹ دولہا کی شادی کو اس کے معاشی اسٹیٹس کے شایانِ شان بنانے کی بھرپور خواہشوں کی تعمیل میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس سڑک کے کنارے تعلیم کے نام پر بھی بہت کچھ پیش کیا جا رہا ہے۔ ان میں کئی رنگ برنگ لیبل والے ماڈل کالج و ماڈل اسکول ہیں۔ شفا خانوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے، ادھر جہاں ایک حادثہ ہوا تھا تو اس کے ساتھ ہی ریسکیو 1122 کی ایمبولینس بھی پہنچی ہوئی تھی۔ میرے شہر کے بالکل پاس ایک نیا گرڈ اسٹیشن زیر تعمیر تھا جسے لوڈ شیڈنگ کے ستائے عوام حسرت سے دیکھ کر ٹھنڈی و گرم آہیں بھر رہے تھے۔ ابھی بھی کھمبوں، اشتہاری بورڈوں اور بیشتر خالی جگہوں پر انتخابی امیدواروں کے گذشتہ معرکے کی یادگار تصویریں موجود تھیں۔ عوام نے ان کو ووٹ دیا تھا۔ اب وہ ان سے اپنی بنیادی حسرتوں کی تکمیل کا تقاضا کرنے میں حق بجانب بھی تھے اور اگلے الیکشن میں اپنے ووٹ کی طاقت سے ڈرا بھی رہے تھے۔ اب یہاں کے عوام ووٹ کارکردگی کی بنیاد پر دیتے ہیں کسی اعتقاد کی بنا پر نہیں، آزادی فکر کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔

ہیڈ کھوکھر سے نکلنے والی تین نہریں جو کافی فاصلے تک ہمجولی بن کر چلتی ہیں، ان کے کنارے سفر اور پانی میں لہراتے درختوں کی چھاؤں سے میرا بچپن کا رومانس یکدم احاطہ خیال میں تازہ ہو گیا لیکن اس نظارے نے مجھے آج اور بھی حیران و خوش کر دیا جب نہر کنارے کئی ایکڑ پر پھیلی ڈسٹرکٹ کمپلیکس منڈی بہاء الدین کی عمارات اپنی سنجیدگی اور وقار اور رعب و اختیار

79 فی صد گھرانوں کے پاس موبائل فون۔ دو لاکھ افراد غربت کا شکار

کے ساتھ مجھے پہلی بار نظر آئیں۔ آج ان کے گرد آہنی جنگلہ ہے، اب وہ کوئی نوآبادیاتی دور کی سربند پہیلی نہیں ہیں۔ اب ان کے انصرافی عمل میں حصہ لینا عوام کا جمہوری حق بھی ہے۔ سڑکوں، بازاروں اور مکانات میں کارفرما ایک تسلسل سے چلتی روایت تشخص کے حوالے سے زندہ ہے۔ بلکہ تقویت پانے لگی ہے۔ جو لوگ پہلے اپنی معمولی ذات پر اصرار نہیں کرتے تھے، پیسہ آ جانے پر اب ذات کا ٹیگ اپنے نام کے ساتھ لگانا ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ جہاں خاندانی ناموں سے مزین فیکٹریوں، احاطوں، انتخابی دفاتر اور رہائش گاہوں کے بورڈ اپنی نسلوں پر انی شناخت اور اعزازات پر اصرار کر رہے ہیں، وہیں پہ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر لگے گوناگوں اشیا و خدمات کے بورڈ بھی اپنے مالکان کی ذات برادری کے پرانے حقیقی یا نو اختیار شدہ تشخص والے خاندانی نظام پر بہت شدید نہیں، تو معتدل، جائز اور آزادانہ اصرار کرنے کا اعلان ضرور کر رہے ہیں۔ خواہ یہ کوئی عام چھوٹا ہوٹل ہو یا چارپائی اسٹور، شٹرنگ کی دکان ہو یا پولی کلینک، سب کچھ ذات برادری کے شکنجے میں تھا۔ یہاں انسان ابھی تک آزاد پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ اور لگتا ہے اگلے کئی عشروں تک ہم ان نقاخری شکنجوں سے نجات نہیں پا سکیں گے۔ الغرض ضلع منڈی بہاء الدین کے درمیان سے گذرتی اس سڑک پر ربع صدی بعد گذرنا میرے لیے نہ صرف بھولی بسری یادوں کو تازہ کرنے کا سبب بنا، بلکہ تغیر و تبدل کے ایک عظیم سلسلے کو سمجھنے کے حوالے سے چشم کشا بھی ثابت ہوا۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ پنجاب پاکستان کا سب سے زیادہ تیزی سے بدلتا ہوا صوبہ ہے اور اس امر کی گواہی اس صوبے کے عوام کے اپنی زندگی گزارنے کے لائحہ عمل اور ایک مسلسل ارتقا پذیر تصور عالم (World View) سے مل رہی ہے۔ ❁

ضلع منڈی بہاء الدین۔ ترقی کے اشاریے 2013

آبادی		
2013	اندازاً	1,613,167
1998	مردم شماری	1,160,552
1981	مردم شماری	846,114
پیدائشی کم وزن کے بچے		25 فیصد
۵ سال سے کم کمزور بچے		25 فیصد
ماؤں کی اموات کی شرح		227 فی ایک لاکھ پیدائش
مرد و عورت (صنفی) تناسب		100 مرد: 95 عورت
گھرانے کا سائز		6.4 افراد
بچوں میں وقفہ کرنے والے خاندان		35 فیصد
ذاتی ملکیت کے مکان		82 فیصد
بجلی کی سہولت		98 فیصد
کل سرکاری ہسپتال		6
پینے کا موٹر پمپ سے پانی		34 فیصد
دیہی مراکز صحت (RHC)		8
ہاتھ کے نلکے کا پانی		57 فیصد
بنیادی مراکز صحت/ ڈسپنسری (BHU)		72
لینڈ لائن ٹیلیفون		24 فیصد گھرانے
موبائل فون		79 فیصد گھرانے
ٹیلیویژن		66 فیصد
ائرکنڈیشنر		5 فیصد گھرانے
پنکھا یا ایئر کولر		94 فیصد گھرانے
شرح خواندگی کل		65 فیصد
شرح خواندگی مرد و عورت کا تناسب = 100 خواندہ مرد بمقابلہ 78 خواندہ عورتیں یہ ضلع صوبہ پنجاب کے چھتیس اضلاع میں خواندگی کے اعتبار سے بارہویں نمبر پر ہے		
زراعت شماری		ہر تیسرے گھرانے کو کاشتکاری کے لیے زمین دستیاب ہے۔
چھوٹے کسان		54 فیصد میں ان کا اوسط زیر کاشت رقبہ دو ایکڑ ہے۔
درمیانے کسان		44 فیصد ہیں اوسط زیر کاشت رقبہ نو ایکڑ ہے۔

بڑے کسان 2 فیصد ہیں لیکن کل زرعی زمین کے 13 فیصد پر قابض ہیں۔

اس ضلع کی آبادی میں سے دو لاکھ افراد شدید غربت کا شکار ہیں۔ ہر چھٹے خاندان میں کم سے کم ایک نسل مکمل طور پر تعلیم سے ناواقف ہے۔

ماخذ: پنجاب لوک سجاگ، ضلع منڈی بہاؤالدین: ترقی اور سیاست۔

”شعبۂ تدریس سے وابستہ پروفیسر جویریہ یاسمین 'اطراف' کی قلمی سرپرستوں میں نمایاں ہیں۔ ہماری درخواست پر ہر موضوع پر بہت ہی سادہ زبان میں مگر دلکش پیرائے میں تحریریں بھیجتی ہیں۔ پاکستان اور کشمیر کا درد رکھتی ہیں۔ اپنا ایک گرلز کالج سائنسی تعلیم کے لیے چلا رہی ہیں۔ میرپور کی معیشت پران کی تحریر تاریخی اور جغرافیائی معلومات سے آراستہ۔ پڑھیں اور اپنی رائے دیں۔“

جدید میرپور۔ پرانے میرپور کے زیرآب آنے پرآباد ہوا

تحریر: جویریہ یاسمین، میرپور آزادکشمیر

جدید میرپور شہر کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں کیونکہ یہ 1967 میں پرانے میرپور کے منگلا ڈیم کے نتیجے میں زیرآب آنے پر آباد ہوا۔ جدید میرپور پر بات کرنے سے قبل ضروری ہے کہ کچھ بات پرانے میرپور کے بازار کی بھی ہوجائے۔

تقسیم سے پہلے پرانے میرپور کا بازار ایک اونچے قطعہ اراضی پر واقع تھا بازار میں لمبی قطار میں دو رویہ دکانیں تھیں بیشتر دکاندار ھندو اور سکھ تھے میں بازار میں سامنے ان کی دکانیں اور پیچھے مکان تھے۔

بازار کے مغربی حصے میں مسلمانوں کی معمولی دکانیں تھیں جن میں خوردہ فروش حجام موچی یا حلوائی تھے۔ نظام دین حلوائی کی دکان بہت مشہور تھی جو نئے میرپور میں ابھی بھی قائم ہے اور اس کی حلوہ پوری آج بھی شہر بھر میں پسند کی جاتی ہے۔

پنجاب کے تجارتی شہروں سے اونٹوں کی لمبی قطاریں طویل فاصلہ

سامنے دکانیں پیچھے مکان ہوتے تھے

طے کر کے رات کی تاریکی میں بازار میں داخل ہوتیں اور سامان کی بوریاں اتر کر ہندو مہاجنوں کے گوداموں میں منتقل ہوجاتیں۔

جھنگ اور جدہال گاؤں کے آرائیں سبزیاں کاشت کرتے اور اسی بازار میں لاکر فروخت کرتے تھے خطہ کشمیر کی بہترین سبزیاں میرپور میں کاشت ہوتی تھیں اور جموں تک جاکر فروخت ہوتی تھی۔

مسلمانوں کا بڑا ذریعہ معاش کاشتکاری تھا زمین بارانی تھی اور اس

ہندوؤں کا ذریعہ معاش تجارت۔ مسلمانوں کا زراعت

پر ظلم یہ کہ پیداوار کا بڑا حصہ کھیتوں سے ہی ہندو ساہوکار اٹھا لیتے اور مسلمان سال بھر کی ضروریات زندگی کی اشیاء ان سے ادھار لیتے رہتے تھے۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں کی معاشی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ 1958 میں میر خالد بشیر صاحب نے یہاں کشمیر بیکری کے نام سے ایک معیاری بیکری قائم کی جو بعد ازاں نئے میرپور میں منتقل ہوئی اور اب اس کی کئی برانچیں کام کررہی ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ درزیوں کی دکانیں اور دو تین زرگروں کی دکانیں میرپور کے مسلمانوں کی ملکیت تھیں۔ 1967ء میں لوگ بے سروسامانی کے عالم میں نئے بننے والے شہر میں وارد ہوئے تو ابتدائی ماسٹر پلان کے مطابق شہر کو A سے G تک سیکٹرز اور سب سیکٹرز میں تقسیم کیا گیا۔ جہاں لوگوں نے اپنی جمع پونجی اور ڈیم کے

نتیجے میں ملنے والے معاوضوں سے گھر بنائے اور کاروباری سرگرمیاں شروع کیں۔

پہلی بیکری 1950 میں قائم ہوئی

پولیس لائن کے ساتھ قدیم بازار قائم تھا جو ابتداءً سادہ پکی دکانوں پر مشتمل تھا جسے پرانیاں ہٹیاں کہا جاتا ہے جدید شہر میں اسے سیکٹر C/1 کا نام دیا گیا ہے اب یہاں جدید دکانیں اور پلازے تعمیر ہو چکے ہیں جہاں کپڑے جوتے جیولری برتنوں اور کاسمیٹکس کی متعدد دکانیں ہیں لیکن بازار کا نام اب بھی پرانیاں ہٹیاں ہی ہے۔

اس کے علاوہ میر پور کے سیکٹر B/1 میں نانگی بازار کا شمار قدیم بازاروں میں ہوتا ہے جہاں کپڑے جوتے گروسری کی ہول سیل دکانوں کے علاوہ شہر کا سب سے بڑا صرافہ بازار بھی موجود ہے۔

اس کے علاوہ گوشت اور سبزیوں کی دکانیں بھی ہیں شہر کی سب سے بڑی مرکزی سبزی منڈی بھی یہیں ہے یوں یہ شہر کا مرکزی

پرانیاں ہٹیاں۔ نانگی بازار۔ صرافہ بازار

بازار کہلاتا ہے یہیں سے سامان شہر اور مضافات کے دیگر بازاروں میں سپلائی ہوتا ہے۔

شہر کی مرکزی سڑک علامہ اقبال روڈ اور میاں محمد بخش روڈ پر الیکٹرک اور الیکٹرانکس کی بڑی بڑی دکانیں ہیں جہاں سے ہر طرح کا معیاری سامان ملتا ہے۔

سیکٹر F/1 کے بیچوں بیچ کوٹلی روڈ پر جوتوں اور کپڑوں کے تمام مشہور اور بڑے برانڈز موجود ہیں جنہوں نے بڑے بڑے جدید پلازوں میں اپنے شاندار Outlets قائم کر رکھے ہیں۔

میر پور کو تارکین وطن کا شہر اور منی لندن بھی کہا جاتا ہے کہ آبادی کی اکثریت بیرون ملک اور بطور خاص برطانیہ میں مقیم ہے یہ لوگ جب خاص مواقع اور شادی بیاہ کے سلسلے میں اپنے آبائی شہر آتے ہیں تو جی بھر کے شاپنگ کرتے ہیں اسی لئے میر پور میں موجود تمام برانڈز کے اسٹور Best Seller تصور کئے جاتے ہیں۔

کوٹلی روڈ پر جوتوں کپڑے کے تمام برانڈ

شہر کے مضافاتی سیکٹرز میں مارکیٹ سے دوری کی وجہ سے گلی محلے میں بھی دکانیں قائم ہیں۔ میر پور شہر ایک پہاڑی پر آباد ہے جس کی وجہ سے بیشتر گھروں میں ایک سیمی بیسمنٹ بھی موجود ہے جہاں دکانیں بنا دی گئی ہیں گلی محلے کی یہ دکانیں زیادہ تر ایسی ہی

جگہوں پر قائم ہیں جہاں خوردنی اشیاء کے علاوہ بنیادی روزمرہ استعمال کی تمام اشیاء بھی دستیاب ہیں۔

بڑے کاروباری گھرانوں میں حاجی سلیم صاحب (مرحوم) کا قائم کردہ نفیس گروپ آف کمپنیز ہے جن کے زیر انتظام بیکری' کنفیکشنری کے علاوہ متعدد ریستوران اور شادی ہالز بھی چل رہے ہیں۔ یہ گروپ آن لائن شاپنگ کی سہولت بھی فراہم کر رہا ہے ان کا کاروبار برطانیہ کے بھی تقریباً تمام بڑے شہروں میں قائم ہے۔

آزاد گروپ آف کمپنیز بھی ایک بڑا کاروباری گھرانے ہے جس کو چودھری نعیم صاحب اور چودھری سعید حج صاحب لا رہے ہیں اس گروپ نے آزاد میگا مارٹ کے نام سے ایک بڑا فرنس سینٹر بنا رکھا ہے اس کے علاوہ ریستوران' پیٹرول پمپس اور گاڑیوں کے شوروم زبھی ہیں ابھی حال ہی میں ایک ہاؤسنگ اسکیم بھی اسی گروپ نے شروع کی ہے۔

انڈسٹریل ایریا میں 12 دواساز کمپنیاں۔ دواؤں کی برآمد میں مصروف

ایک اور گھرانہ چوہدری اللہ دتہ صاحب (مرحوم) کا ہے جنہوں نے 1978 میں سیمنٹ اور

چوہدری نعیم۔ چوہدری اللہ دتہ کے گروپ آف کمپنیز

ٹرانسپورٹ کا کام مشروع کیا اور اب پورے آزاد کشمیر میں بیسٹ وے سیمنٹ کے سپلائر ہیں۔

2017 میں سراج اسٹیل کے نام سے اسٹیل ملز کا کام شروع کیا جہاں سریا بنتا ہے بعد ازاں فرنس مل لگا کر کام کو مزید بڑھالیا' ایک عدد پٹرول پمپ بھی اسی گروپ کے تحت چلایا جا رہا ہے حال ہی میں مرحوم کی وفات کے بعد ان کے چاروں بیٹے ایاز احمد، امتیاز احمد، فیاض احمد اور محمد رضا اس کو چلا رہے ہیں۔

حاجی منظور صاحب کا گھرانہ ہے جو پچھلے ساٹھ سال سے گروسری اور دیگر فوڈ آئٹمز کا ہول سیلر اور سپلائر ہے اور ضلع بھر میں دوسرے کاروباری حضرات ان سے سامان لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انڈسٹریل ایریا میں 12 فارماسیوٹیکل کمپنیاں کام کر رہی ہیں جو تقریباً 15 سے 16 ملین کی میڈیسن سالانہ ایکسپورٹ کرتی ہیں۔

دوسری بڑی انڈسٹری ماربل انڈسٹری ہے جس میں تقریباً آٹھ بڑی فیکٹریز کام کر رہی ہیں جو سالانہ 300 ملین کی ایکسپورٹ کر رہی ہیں۔ تقریباً 25 کنسٹرکشن کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔

فوم بنانے والی 13 انڈسٹریز کام کر رہی ہیں۔

میر پور کی ٹوبیکو انڈسٹری سالانہ 2 لاکھ ڈالر کی ایکسپورٹ کر رہی ہے۔

اس کے علاوہ فوڈ انڈسٹری کے تحت بھی درجنوں کمپنیاں کام کر رہی ہیں۔ ضلع میر پور سے سالانہ تین ارب روپے ٹیکس اکٹھا ہوتا ہے۔

چونکہ شہر کے مکینوں کی ایک بڑی تعداد بیرون ملک اور

سمندر پار پاکستانیوں کی ترسیلات کا 37 فی صد میر پور بھیجتے ہیں

بطور خاص برطانیہ میں مقیم ہے لہٰذا پاکستان کے کل Foreign remittance کا 37% صرف میر پور سے حاصل ہوتا ہے۔ ❁

”لیاری۔ ساحلی بستی کراچی کی جان ہے۔ لیاری کی کھڈا مارکیٹ ایک صدی پرانی۔ اب کچرا کنڈی بن گئی ہے۔ محترم و مکرم ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی نے عمر عزیز کی کئی دہائیاں آگرہ تاج کالونی میں گزاری ہیں۔ وہ اس مچھلی مارکیٹ کے بارے میں حقائق بیان کر رہے ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔“

کھڈا مارکیٹ اب کچرا کنڈی کے مناظر

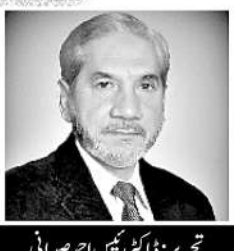

تحریر: ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی

کراچی کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اس شہر نے مچھیروں کی بستی سے آغاز کیا، اپنی منفرد جغرافیائی حیثیت کے باعث ترقی کی منازل تیزی سے طے کرتا گیا۔ یہاں پر قائم قدرتی بندرگاہ نے اس شہر کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا اور اپنے غریب پرور شہر ہونے کے باعث پورے ملک سے لوگ اس کی جانب کھنچے چلے آئے۔ قیام پاکستان سے قبل ہی اسے ایک ترقی یافتہ شہر کا درجہ حاصل تھا۔ اس لیے کہ یہاں اسکول، کالج، بندرگاہ، ریلوے اسٹیشن، تجارتی مرکز بن چکا تھا۔ قیام پاکستان کے وقت دنیا کی بڑی ہجرت ہوئی اور بڑی تعداد میں ہندوستان سے پڑھے لکھے، ہنرمندوں کی بڑی تعداد نے کراچی کو اپنا مسکن بنایا جس کے باعث کراچی اور بھی تیز رفتاری سے ترقی کی جانب گامزن رہا۔ ملک کا دارالحکومت ہونا، گویا سونے پہ سہاگہ، ثابت ہوا۔ کھڈا مارکیٹ کو کراچی کی قدیم ترین مچھلی مارکیٹ تصور کیا جاتا ہے۔

کراچی کی قدیم آبادی جولیاری کا حصہ ہے کھڈا کہلاتی ہے۔ اسے کھڈا مارکیٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے، کھڈا مارکیٹ کراچی کے ساحل کے اس حصے سے منسلک ہے کبھی چاند کی ابتدائی تاریخوں میں سمندر کی لہریں رخ کیا کرتی تھیں اور سمندر کا پانی کراچی کی مختلف نچلی آبادیوں میں داخل ہو جایا کرتا تھا۔ ان علاقوں میں ماری پور روڈ پر عین اس جگہ جہاں قائداعظم محمد علی جناح کی ایمبولینس خراب ہوئی تھی اسے وزیر مینشن بھی کہا جاتا ہے سے ملی ہوئی مچھیروں کی بستی تھی، کیوں کہ یہ جگہ نشیب میں تھی اس وجہ سے اسے کھڈا کہا جانے لگا، ایک اور روایت یہ بھی بیان کی گئی کہ کراچی کا استعمال شدہ پانی ایک نالے کی صورت میں کراچی کے مختلف علاقوں کے گندے پانی کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا لیاری کی اس آبادی میں جمع ہو کر سمندر میں جا گرا کرتا، بہت سا پانی کافی عرصہ تک یہاں جمع رہنے کی وجہ سے یہاں بڑا سا گڑھا بن گیا تھا جو کھڈا کہلایا۔ وقت کے ساتھ ساتھ آبادی میں اضافہ ہوا، بستی کے مکینوں جن کا ذریعہ معاش ماہی گیری تھا جو چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہا کرتے تھے، آج بھی اس جگہ کو دیکھیں تو مچھلی کے کاروبار کے نشانات بہت واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔ مچھیروں کی یہ کچی آبادی بڑھتے بڑھتے آج بلند و بالا عمارتوں کا روپ دھار چکی ہے نیز اسے میمن سوسائٹی اور نوا آباد کا نام بھی دیا گیا لیکن تمام تر جتن کے باوجود یہ جگہ کھڈا

> **نئی عمارت کے سبز باغ دکھا کر مسماری تو ہوگئی۔ نئی مارکیٹ نہیں بنی**

مارکیٹ ہی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اس جگہ ایک مچھلی مارکیٹ تعمیر ہوئی جو کھڈا مارکیٹ کہلائی۔ یہ صرف مچھلی مارکیٹ تھی۔ راقم الحروف کو اس مارکیٹ کو دیکھنے، اس مارکیٹ سے مچھلی خریدنے کا اتفاق متعدد بار ہوا۔ راقم نے حاجی عبد اللہ ہارون کالج سے انٹر بعد ازاں اسی کالج میں چوبیس سال خدمات بھی انجام دیں، علاوہ ازیں میری رہائش بھی لیاری کے علاقہ ”آگرہ تاج کالونی“ میں تھی جہاں پر میرا

بچپن گزرا، پھر جوانی اور بڑھاپے کی دہلیز پر بھی قدم رکھا۔ اس وجہ سے کھڈا، ہارون کالج کی پہچان ہے، ہارون کالج کو کھڈا کالج کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ کالج اور کھڈا مارکیٹ شاہ ولی اللہ روڈ پر عیدگاہ کے مقابل واقع ہے۔

شاہ ولی اللہ روڈ کے بارے میں اقبال اے رحمن مانڈویا نے اپنی کتاب "اس دشت میں ایک شہر تھا: کراچی کے سنہرے دنوں کی داستان" میں لکھا اس سڑک کا پرانا نام 'دالو چیلا رام روڈ' ہے، دالو مل چیلا رام کانگریسی تھے شہرت سیاسی اور سماجی رہنما کے طور پر تھی، جہاں سے اس کا آغاز ہوا ہے یہ علاقہ دریا آباد ہے جس کا نیا نام نیازی چوک ہے۔ (اس علاقے میں میانوالی سے تعلق رکھنے والے زیادہ تعداد میں رہائش رکھتے ہیں) آگے چلیں تو کھڈہ اور نوا آباد آتے ہیں اور سڑک نسبتاً چوڑی ہو کر ایک پررونق علاقہ میں تبدیل ہو جاتی ہے جہاں عید گاہ، مدرسہ اسلامیہ، عبداللہ ہارون کالج، یتیم خانہ اور اوکھائی

آگرہ تاج کالونی۔ میرا بچپن۔ جوانی اور بڑھاپے کی دہلیز بھی

میمن برادری آباد ہے، قدیم سندھی آبادی بھی اس علاقے کے مکین ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ میمن برادری کی اچھی خاصی تعداد اس علاقے میں آباد ہوگئی"۔ اسی مناسبت سے اس جگہ کو میمن سوسائٹی اور نیا آباد کہا جانے لگا۔ عین اسی جگہ پر عید گاہ کے مقابل کھڈا مارکیٹ کی قدیم عمارت اور اس میں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھی جہاں مچھلیاں فروخت ہوا کرتی تھیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھی اور معاون حاجی عبداللہ ہارون نے 1923ء میں کھڈا مارکیٹ کے مقام پر جامعہ اسلامیہ یتیم خانہ قائم کیا بعد میں اس جگہ ہارون خاندان نے پرائمری و سیکنڈری اسکول، حاجی عبداللہ ہارون ووکیشنل انسٹی ٹیوٹ اور حاجی عبداللہ ہارون کالج اور اسپتال کا قیام جامعہ اسلامیہ یتیم خانہ کے احاطہ میں عمل میں آیا۔ حاجی عبداللہ ہارون نے 1923 میں اسی مچھیروں کی بستی کھڈا میں غریبوں، ناداروں اور بے سہارا بچوں کے لیے ایک یتیم خانہ قائم کیا جو آج بھی قائم ہے۔ وہ اپنے ہی قائم کیے ہوئے یتیم خانہ کے احاطہ میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ کھڈا مارکیٹ کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح کی پیدائش گاہ کھڈا مارکیٹ کے نزدیک تر ہے جسے وزیر مینشن کہا جاتا ہے۔ قائد کی پیدائش 1876ء میں ہوئی، اسی طرح کھڈا مارکیٹ کے سامنے قائم ہونے والے دینی مدرسہ "مظہر العلوم" کا قیام 1884ء میں عمل میں آیا۔ یہ مارکیٹ مچھلی کا کاروبار کرنے والوں کا بڑا مرکز تھی۔

کھڈا مارکیٹ لیاری کی تعمیر کو صدی سے زیادہ ہو چکا تھا، اس کا مخدوش ہونا، خطرہ کی علامت بن جانا بنتا تھا جس کے باعث انتظامیہ نے اس عمارت کو مخدوش قرار دے کر اسے زمین بوس کرنے کے احکامات جاری کیے اور اس کی تعمیر نو کا منصوبہ بھی تشکیل دیا گیا۔ یہ ایک اچھا عمل تھا۔ کراچی کی قدیم ترین مارکیٹ کو از سر نو تعمیر کرنے سے ماہی گیری کے پیشے کو وسعت ملتی، ماہی گیروں کو اپنے کاروبار کو بہتر انداز سے چلانے اور روزی کمانے کا ذریعہ میسر آتا۔ علاوہ ازیں بڑا قطع اراضی جو اب قیمتی زمین ہے قبضہ مافیا کے سے محفوظ ہو جاتا لیکن شومئی قسمت، مارکیٹ کو گرانے کے احکامات تو جاری کر دیے گئے، عمارت کو از سر نو تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی بھی کاغذوں پر تیار کر لی گئی، دکانوں کے مالکان کو سبز باغ دکھا کر عمارت کو مسمار کر دیا گیا، اس عمل کو سالوں بیت گئے، کھڈا مارکیٹ جس پلاٹ پر تھی وہاں اب کچرا کنڈی کی صورت میں کھڈا مارکیٹ چیخ چیخ کر اپنے مسمار ہونے کی دہائی دے رہی ہے۔ اب جب کہ سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی مسلسل حکومت کی ہیٹرک چل رہی ہے، بلدیہ کراچی کا میئر بھی پاکستان پیپلز پارٹی کا ہے، اہل لیاری نے ستر کی دہائی میں ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے گلے لگایا تھا، پارٹی سے عشق آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہے۔ امید رکھنی چاہیے کہ حکومت وقت اس قدیم مچھلی مارکیٹ کے از سر نو تعمیر کے منصوبہ پر عمل درآمد کرنے میں دیر نہیں کرے گی۔ ❁

عمر کوٹ کی معیشت عمر کوٹ کی بیٹیوں کی تحریریں

عمر کوٹ: پاکستان کے قدیم ترین شہروں میں ہے۔ مغل بادشاہ ہمایوں جب دربدر تھے۔ تو یہاں پناہ لی۔ یہیں عظیم مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کی پیدائش ہوئی۔ عمر ماروی کی داستان کے حوالے سے بھی عمر کوٹ مشہور ہے۔ 'اطراف' کے مضمون نویسی کے مقابلوں میں عمر کوٹ کی طالبات اور طلبہ بھرپور حصہ لیتے رہے ہیں۔ انعامات بھی حاصل کرنے والے پائے ہیں۔ ہم گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج کی پرنسپل پروفیسر قرۃ العین کے منون ہیں کہ وہ اپنی طالبات میں قومی زبان کے فروغ کے لیے ہمیشہ سرگرم رہتی ہیں۔ ہماری درخواست پر انہوں نے شہر کی معیشت پر گیارہویں جماعت کی تین غیر مسلم ہم وطن طالبات سے مضامین لکھوا کر بھیجے ہیں۔ پڑھنے اور اپنی رائے دیجئے۔ 'اطراف' کو فخر ہے کہ وہ واہگہ سے گوادر تک ایک ولولۂ تازہ دے رہا ہے۔

عمر کوٹ۔ جلال الدین اکبر کی پیدائش سے تاریخ میں امر

گیارہویں جماعت کی مونیکا بنت ہریش کمار کی تحریر

عمر کوٹ کو اب حکومت سندھ کی طرف سے ضلع کی حیثیت حاصل ہے عمر کوٹ قلعے ہی وجہ سے اس شہر کا نام عمر کوٹ پڑا۔ عمر اس بادشاہ کا نام ہے جس نے قلعہ بنوایا تھا اور کوٹ۔ قلعہ۔ 'عمر کا قلعہ' یہ قلعہ بادشاہ عمر سومرو نے بنوایا تھا۔ عمر کوٹ کا پرانا نام 'امر کوٹ' تھا۔ امر۔ مہارانا امر سنگھ۔ کوٹ۔ قلعہ۔

جب ہمایوں مغل بادشاہ راجپوتانہ سے مایوس ہو کر لوٹا تو عمر کوٹ پہنچا تھا اسی سال 949 ہجری۔ 1542ء میں اکبر پیدا ہوئے۔ تاریخ میں عمر کوٹ کی اس وجہ سے بھی اہمیت بڑھ گئی کہ یہاں ہندوستان کا مشہور مغل بادشاہ اکبر پیدا ہوا۔ عمر سومرو نے 1355ء سے 1390 تک عمر کوٹ پر حکومت کی تھی۔

بازار: شاہی بازار۔ تھر بازار۔ مینا بازار۔ جمیل بازار۔ مثالی بازار میں ہر قسم کی دکانیں ہیں پر سب سے زیادہ کپڑے کی دکانیں ہیں جمیل بازار میں بھی سب سے زیادہ کپڑے کی دکانیں ہی ہیں۔ تھر بازار میں سب سے زیادہ کنفیشنری یعنی ریڑی کی دکانیں ہیں۔ مینا بازار میں کپڑے کی دکانیں ہیں اور جنرل اسٹورز زیادہ ہیں۔

زیادہ تجارت کی چیزیں: عمر کوٹ میں کھانے پینے کی چیزوں کی تجارت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ تھر پارکر۔ سانگھڑ۔ اور میر پور خاص اضلاع کے سب لوگ کھانے پینے کا سامان یہاں سے لے جاتے ہیں۔

روایتی کاروبار: ریڑی کی دکانیں کیونکہ ریڑی کی دکان رکھنے میں کسی طرح کے تجربے کی ضرورت نہیں ہوتی سامان لے آئے اور بیچ دیا۔

غلہ منڈی: عمر کوٹ میں تین سے چار گودام ہیں جہاں پر پورے گھر سے جو بھی فصلیں آتی ہیں وہ گودام پر یا الگ الگ دکانوں پر بکتی ہیں پر عمر کوٹ میں کوئی بھی غلہ منڈی نہیں ہے۔

سبزی منڈی: پہلے سبزی منڈی چھور روڈ جناح پارک کے پاس تھی اور ابھی جو سبزی منڈی ہے وہ کنری روڈ پر اندلس ہال سے تھوڑی آگے ہے یہاں سب سے زیادہ بکنے والی سبزی آلو۔ ٹماٹر۔ بھنڈی اور سب سے زیادہ بکنے والے پھل سیب۔ کیلے۔ رمضان میں اللہ چوک کے پاس رمضان بازار لگتا ہے جہاں پر پورے رمضان بہت بھیڑ رہتی ہے رمضان میں سب سے زیادہ بکنے والا پھل تربوز۔

سردا۔ اور کھجوریں ہیں۔

کارخانے: عمر کوٹ میں برف کے کئی کارخانے ہیں ایک پولیس چوکی کے پاس دوسرا عمر کوٹ گیٹ کے پاس اور تیسرا کارخانہ نرسری کے پاس ہے۔ ایک کارخانہ چھاچھرو بائی پاس پر ہے ایک حبیب بینک کے پیچھے اور ایک چندی رام محلے میں ہے۔ 2004 میں خالد سراج سومرو نے بحث کالونی کے پاس گتے کا کارخانہ بنوایا تھا پر وہ زیادہ چل نہیں پایا اور بند ہو گیا۔

پرانی دکانیں: سیلوں کی دکان جو شاہی بازار میں ہے۔ دوسری

ناگوری خاندان پہلے نمبر پر۔ پھر مہیشوری۔ پھر میلوں

کنفیشنری دکان یہ بھی شاہی بازار میں ہے۔ تیسری تھر کتاب گھر یہ بھی شاہی بازار میں ہے۔ چوتھی العزیز کتاب گھر یہ ذکریہ مسجد کے سامنے ہے۔

محلے میں دکانیں: عمر کوٹ کے زیادہ تر محلوں میں ایک دکان ضرور ہوتی ہے جس پر ضرورت کی چیز آسانی سے مل جاتی ہے پر کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف بڑے بازاروں میں ملتی ہیں۔

بڑے شاپنگ مال: ایک شاپنگ مال مینا بازار میں ہے جسے UK Mart کہتے ہیں۔ دوسرا پولیس چوکی کے سامنے ہے جسے RK Preegani کہتے ہیں جہاں پر ضرورت کی ہر چھوٹی بڑی چیز مل جاتی ہے۔

بڑے برانڈ: مردانہ کپڑوں کے برانڈ میں سب سے پہلے گل احمد، خاص، لباس خاص، غازی MC12، ہی آن لائین یہ مشہور برانڈ ہیں

مردانہ کپڑوں کے۔ لیڈیز کپڑوں کے برانڈ میں سب سے زیادہ گل احمد لیڈیز لان اور کاٹن مشہور ہے دوسرے بھی ہیں پر کوالٹی کے حساب سے یہ زیادہ چلتا ہے اور جوتوں میں سب سے زیادہ بکنے والے یا مشہور جوتے ہیں کے ٹو، باٹا، پشاوری سینڈل اور ہوائی چپل۔

کمپیوٹر کی دکانیں: مہتاب کمپیوٹر۔ موہت کمپیوٹر یہاں پر فوٹو کاپیاں کروائی جاتی ہیں۔ اسکالرشپس کے ٹیسٹوں کے فارم بھی مل جاتے ہیں اور کچھ دکانوں پر الیکٹرانکس کا سارا سامان جیسے کہ کمپیوٹر، موبائل فون، ایم پی تھری، میموری کارڈ، اور بھی بہت سی چیزیں مل جاتی ہیں۔

بڑے کاروباری گھرانے: پہلے نمبر پر ہیں میشوری/ واٹیاں اس کے بعد ناگوری، شاہ فیملی، پہلے نمبر پہ میشوری اس لیے کہ وہ ہول سیلر ہیں ان کی دکانیں بڑی ہیں خاص طور پر کپڑوں کی دکانیں۔ ناگوری کاروباری اور زمیندار ہیں۔

تفریح گاہ: عمرکوٹ کا قلعہ، سورج پارک جو کہ وھرلے میں ہے۔ جناح پارک چھوڑ روڈ پہ ہے۔ شانتی نگر جناح چوک کے پاس ہے،

قدیم تاریخی شہر سے پرانے بازار بھی۔ جدید شاپنگ مال بھی اور محلے کی دکانیں بھی موجود

نرسری پارک وائرسپلائی حلا کے پاس ہے۔

عمرکوٹ کو صحت کے حوالے سے دیکھا جائے تو سول اسپتال جو کنری روڈ، وھرو بائی پاس پر ہے جہاں پر، بہت سے مریض علاج کے لیے آتے ہیں۔ خاص طور پر ہفتے اور اتوار نے دن سول اسپتال میں الگ الگ شہروں سے الگ الگ بیماریوں کے ڈاکٹر آتے ہیں۔ لوگ بھی دور دور سے علاج کروانے کے لیے بسوں اور رکشوں سے آتے ہیں جس کی وجہ سے بسوں اور رکشوں والوں کی اچھی کمائی ہو جاتی ہے اسی طرح تعلیم کے ذریعے بھی رکشے والوں کی اچھی کمائی ہو جاتی ہے۔ وہ بچوں کو کالج، یونیورسٹی، اور اسکول چھوڑنے جاتے ہیں۔

عمرکوٹ کا پرانا اسکول پاٹ شالا ہے۔ عمرکوٹ کا پرانا میڈیکل سینٹر ملیر میڈیکل سینٹر ہے۔ جسے کہ اپنی میڈیکل سینٹر بھی کہا جاتا ہے عمر کوٹ کے پرانے میڈیکل اسٹور کمار میڈیکل اسٹور کارونجھر ہوٹل کے سامنے ہے۔ دوسرا مصطفی میڈیکل اسٹور ہے۔ عمرکوٹ کا سب سے پرانا ہوٹل کارونجھر ہوٹل ہے جو چھا چھرو روڈ پر ہے۔

تین تلوار چوک، موتی چوک اور اللہ والا چوک یہ عمرکوٹ کے مشہور چوک ہیں۔

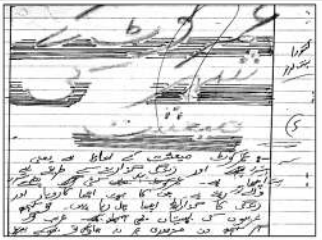

بازار بھی۔ ریڑھیوں پر بھی چیزیں بکتی ہیں۔ زیادہ دکانیں کپڑوں اور جوتوں کی۔ لڑکوں لڑکیوں کے لیے ہاسٹل بھی ہیں

بازار میں درزیوں کی دکانیں، زیورات کی دکانیں ہیں۔ پرچون کی دکانیں بھی شامل ہیں۔

عائشہ بازار

پہلے عائشہ بازار نہیں تھا۔ یہاں پر اس کی جگہ صرف ایک چھوٹا چوک تھا۔ اس چوک کے آس پاس صرف ایک دو آٹے کی چکیاں تھیں۔ اب عائشہ بازار ایک بہت بڑا بازار ہے جہاں عورتوں اور لڑکیوں کے کپڑے اور زیورات ملتے ہیں۔ یہاں مردوں کے کپڑے اور لڑکوں کے کپڑے اور ضرورت کا سامان بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ عمرکوٹ میں سندھ بازار ۔ تھر بازار ہیں جہاں سے ضرورت کی چیزیں حاصل کی جاتی ہیں۔

عمرکوٹ کے ان بازاروں میں عید، ہولی، دیوالی اور کئی تہواروں پر بہت بھیڑ ہوتی ہے۔

روایتی کاروبار

عام طور پر یہاں کے لوگ کاروبار ہی کرتے ہیں۔ پہلے پرچون کی دکانیں ہوتی تھی وہ اب بھی ہیں۔ اس کے علاوہ لوگ اور بھی کئی طرح کی دکانیں رکھ کر بھی اپنا کاروبار چلا رہے ہیں۔ جیسے کپڑوں کی۔ جوتوں کی۔ مٹھائی کی۔ کتابوں کی۔ قصائی کی اور کئی قسم کی دکانیں ہیں۔

پرچون کی دکانوں سے روز مرہ کی چیزیں ملتی ہیں۔ کئی لوگ ریڑھیوں پر چیزیں رکھ کر اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ یہاں پر دوسروں کے جوتے سیل کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ کئی لوگ دوسروں کے گھر پر مزدوری کر کے اپنا گزارا کرتے ہیں۔

عمرکوٹ میں جو شاگرد ہوتے ہیں جن کو آگے چل کر بزنس مین بننا ہوتا ہے تو وہ لوگ آدھا وقت اپنی پڑھائی کو دیتے ہیں اور آدھا وقت اپنے کسی رشتے دار کی دکان کو۔ انہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ کاروبار کیسے کرتے ہیں۔

غلہ منڈی

عمرکوٹ میں غلہ منڈی ایک بھی نہیں ہے۔ لیکن یہاں دیہات میں ہونے والی ہر فصل ملتی ہے۔ گودام اللہ والا چوک ہے۔ دکانوں پر گندم، کپاس، ہر قسم کی دالیں چینی وغیرہ ملتی ہے۔ ہر قسم کا اناج اور آٹا بھی دستیاب ہے۔ جیسے گندم، گندم کا آٹا، چنے کی دال اور بیسن چاول اور چاول کا آٹا۔

سبزی منڈی

یہاں کی سبزی منڈی کنری روڈ کے پاس ہی ہے۔ جہاں پر ہر سبزی ملتی ہے۔ سبزی منڈی میں ہمیں کئی طرح کے اچھے پھل بھی ملتے ہیں۔ اسٹابری۔ انگور۔ انار۔ لوگ عمرکوٹ کی سبزی منڈی سے سبزی اور پھل لے کر دیہات میں بیچتے ہیں اور اپنا کاروبار کر کے گزارا کرتے ہیں۔ عمرکوٹ میں ہر سال رمضان کی سبزی منڈی الگ سے لگتی ہے جس میں پھل اور سبزیاں اچھی اور سستی ملتی ہیں۔

گیارہویں جماعت کی کنغو ابنت لوئو کا مضمون

عمرکوٹ معیشت کے لحاظ سے یعنی پیشوں اور زندگی گزارنے کے طریقے سے بہت اچھا ہے۔ یہاں کئی سو لوگ رہتے ہیں۔ جن کا بہت اچھا کاروبار ہے اور زندگی کا گزارا اچھا چل رہا ہے۔ کچھ غریبوں کی بستیاں بھی آباد ہیں۔ غریب لوگ اگر دن میں مزدوری پر نہ جائیں تو بھوکے رہ جاتے ہیں۔ یہاں مسلمان اور ہندو دونوں رہتے ہیں۔ دوسرے مذاہب سے لوگ بھی مگر اتنے زیادہ نہیں ہیں۔

عمرکوٹ کے بازار

کئی ایسے بازار ہیں جہاں ضرورت کا سامان ملتا ہے۔ جیسے شاہی

مشہور دکانیں اور محلے کی دکانیں

مشہور دکانیں عمرکوٹ میں کپڑوں کی ہے جوتوں کی ہے۔عمرکوٹ میں سونے اور چاندی کے زیورات کی بھی الگ مشہور دکانیں ہیں۔ مشہور مردوں کے کپڑے کی دکان گل احمد کی پروڈکٹ چلتی ہے۔ عمرکوٹ کے ہر محلے میں دکانیں ہیں جہاں سے ضرورت کی چیزیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ عمرکوٹ میں مشہور دکانیں ہیں جیسا کہ شاہ لطیف کتابوں کی دکان، میڈیکل اسٹور، میلوں پنساری کی دکان۔ انمول مٹھائی کی دکان، کرشن مٹھائی کی دکان، ڈائمنڈ مٹھائی کی دکان، چندر فوڈز، سندھ کتاب گھر، علی عزیز کتاب گھر جیسی۔

کمپیوٹر

ساری دنیا میں اب کمپیوٹر کا نظام چل رہا ہے۔ تو تھوڑا بہت ہمارے شہر عمرکوٹ میں کمپیوٹر کا ماہانہ کورس کرایا جاتا ہے۔ جیسے Mohit Computer Center , Super Sistem کمپیوٹر کی کئی الگ دکانیں بھی ہیں۔ جہاں سے شاگرد کمپیوٹر چلانا سیکھتے ہیں۔ کمپیوٹر فوٹو اسٹیٹ بھی ہیں۔ فوٹو اسٹیٹ، کراچی فوٹو اسٹیٹ، ناگوری فوٹو اسٹیٹ، موہت اور انمول فوٹو اسٹیٹ شامل ہے۔ کئی جگہوں پر لڑکیوں کو بھی کمپیوٹر کا ماہانہ کورس کرایا جارہا ہے۔

خاندانی کاروبار

عمرکوٹ میں سب سے پرانی برادری ناگوری ہی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ مذہب کے لوگ یہاں رہنے لگے۔ کئی لوگ دیہات سے آکر یہاں رہنے لگے۔ تو کئی دوسرے شہروں سے آکر۔ ابھی بھی کافی زمینیں خالی ہیں وہ لوگوں کی خریدی ہوئی ہیں۔ جیسے کہ سونارا، میسوری، ناگوری، ہندو، عیسائی بلوچی اور کئی لوگ۔ ان کے علاوہ شاہ فیملی خاندانی برادری شامل ہے۔

پرانی دکانیں:

عمرکوٹ میں زیادہ تر پرانی 36 دکانیں ہیں لیکن میلوں کی پنسار کی دکان بہت پرانی ہے۔ جہاں سے مختلف جڑی بوٹیاں بھی ملتی ہیں۔ پرچون کا سامان بھی۔ اس کے بعد کرشن حلوائی کی دکان، شاہ لطیف کی کتابوں کی دکان، انمول۔

شاپنگ مال

یہاں مشہور شاپنگ مال بھی پائے جاتے ہیں جیسا کہ سورج شاپنگ سینٹر، UK مال، RK مال، عائشہ مارکیٹ وغیرہ۔ یہاں سے مختلف ساڑھی اور فینسی کپڑے، جوتے، اسکول کے جوتے، اور لڑکیوں کے زیورات ملتے ہیں۔

تفریح گاہیں

عمرکوٹ میں سیر و تفریح کے لیے بھی اچھی جگہیں ہیں۔ جیسے عمرکوٹ کا قلعہ جس میں عمر اور ماروی کی داستان سنائی جاتی ہے۔ اس قلعہ میں عمر ماروی کی پتھر کی مورتیاں بنی ہوئی ہیں وہ بھی شاندار طریقے سے اور اس کے علاوہ کئی پرانے سکے اور کتابیں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ نرسری پارک، سورج پارک، وغیرہ یہ سب سیر و تفریح کی جگہوں میں شامل ہیں۔ عمرکوٹ میں سیر و تفریح کے لیے مختلف میلے بھی لگتے ہیں۔ ان میلوں میں کلاکار آتے ہیں جو اپنا فن دکھاتے ہیں جیسے رسی پر سائیکل چلانا اور آرٹ کرنا۔ میلوں میں اکثر لوگ جھولے بھی لگاتے ہیں۔

کارخانے

عمرکوٹ میں کئی کارخانے بھی ہیں جن میں دو برف کے کارخانے ہیں ایک کارخانہ موتی چوک پر یعنی 15 نمبر پولیس چوکی کے پاس ہے۔

دوسرا کارخانہ عمرکوٹ کے مین گیٹ پر میگھ ملہار ہوٹل کے آگے ہے۔ جہاں پر لوگوں کو گرمی کے موسم میں برف ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک گتے کا کارخانہ بھی بنا تھا جو چل نہیں سکا اس کی وجہ یہاں بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہے۔

ان سب چیزوں کے علاوہ عمرکوٹ میں اچھی تعلیم ہونے کی وجہ سے لوگ اپنے بچوں کو یہاں مختلف ہاسٹلوں میں داخل کراتے ہیں۔ جنت لڑکیوں کا ہاسٹل، سماٹ لڑکوں کا ہوسٹل ہے۔

کچھ شاگرد رکشوں بسوں سے عمرکوٹ کے مختلف اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔

سبزی منڈیوں میں دوسری جگہوں سے بھی سبزی اور پھل آتے ہیں۔
ہر محلے میں ایک دو دکانیں ہیں۔ یہاں سب بڑے بڑے برانڈ بھی ہیں

گیارہویں جماعت کی درشنا بائی بنت حکموں کی رپورٹ

عمرکوٹ میں بہت سے بازار موجود ہیں جس میں سے کچھ مشہور یہ ہیں۔ تھر بازار، شاہی بازار، سندھ بازار، عائشہ بازار وغیرہ۔ تھر بازار میں بہت سے اسپتال موجود ہیں جیسے پرانا سول اسپتال۔ کراچی اسپتال۔ مہران سینٹر۔ یہ اسپتال تھر بازار میں موجود ہیں۔ تھر بازار میں بہت سی دکانیں جیسے پرچون کی دکانیں جنرل اسٹور، کریانہ اسٹور اور تھر بازار میں تھر کا اناج دستیاب ہے۔ شاہی بازار میں بہت سی دکانیں جیسے سعد سرفراز شاہ کی سندھی ٹوپیاں بہت مشہور ہیں۔ اور سوائی کیبن جس کا پان بہت مشہور ہے اور شاہی بازار کے پیچھے ایک تیل کا گھانا موجود ہے جو اسماعیل تیلی کا ہے۔ سندھ بازار میں بہت سی پرانی دکانیں ابھی بھی ہیں۔ میلومل کی دکان، پیٹرول پمپ، اللہ والا چوک اور عمرکوٹ کا سب سے بڑا سرکاری کالج ڈگری کالج سندھ بازار میں موجود ہے۔ عائشہ بازار جس میں عورتوں کا ہر قسم کا سامان جیسے کپڑے، چپل، جوتیاں، جیولری، کھانے پینے کی اشیاء اور برتن وغیرہ دستیاب ہیں۔

غلہ منڈی: عمرکوٹ میں ایک بھی غلہ منڈی نہیں ہے لیکن اناج کے گودام ہیں ایک گودام اللہ والا چوک سے تھوڑا آگے ہے جس میں رانا جاگیر، کنری، اور مہیشوریوں کا اناج آتا ہے۔ عمرکوٹ میں ایک اور گودام ہے جو چھور کے روڈ پر ہے

عمرکوٹ کی سبزی منڈی: عمرکوٹ میں پہلے تین سبزی منڈیاں مشہور ہیں۔ ایک ٹاؤن کمیونٹی کے سامنے دوسری سلیم مہر کے میدان میں اور تیسری اکھاڑہ کے سامنے ہے اب وہ ساری منڈیاں مل کر ایک جگہ خالد سومرو کے میدان میں ہیں جو کنری روڈ سول اسپتال کے سامنے ہے اس منڈی میں ہر قسم کی سبزی، پھل ملتے ہیں جو نہ صرف عمرکوٹ بلکہ دوسرے شہروں جیسے کنری، کراچی، حیدرآباد، پنجاب اور بلوچستان سے آتے ہیں۔ اس سبزی منڈی میں زیادہ تر سندھ کے پھل آتے ہیں ان میں سے سندھڑی آم بہت مشہور ہے اس منڈی میں اناس، پپیتا، اور ناریل کم آتے ہیں اور رمضان کے مہینے میں یہاں اسٹال لگتے ہیں جہاں تازہ پھل سبزی اچھے اور کم قیمت میں ملتے ہے۔

عمرکوٹ میں پرانی دکانیں اور محلے کی دکانیں: عمرکوٹ مس آج بھی بہت سی پرانی دکانیں موجود ہیں جن میں میلومل کی دکان جس میں پنساری، جڑی بوٹی کا سامان مشہور ہے، اور سعد سرفراز شاہ کی دکان کی سندھی ٹوپیاں بہت مشہور ہیں۔ سوائی کیبن جن کی دکان کا پان بہت مشہور ہے۔ ریبھو حلوائی جن کی دکان کا میسو آج بھی بہت مشہور ہے۔ تھاکول وائیوان کی دکان کا پنساری کا سامان جیسے جڑی بوٹی کا سامان بہت مشہور ہے۔ دھرموں جیسا رام یادھر موڑاری والا اور کرشنا بیکری یہ سب بڑی دکانیں عمرکوٹ میں بہت مشہور ہیں۔

محلے کی دکانیں: عمرکوٹ کے ہر محلے میں ایک سے دو دکانیں موجود ہیں۔ ان دکانوں میں بچوں کے کھانے کی چیزیں، کاپی، کتاب پین، اور گھریلو سامان جیسے آٹا شکر، چاول وغیرہ یہ سارا سامان ہر محلے کی ہر دکان پر ملتا ہے۔

کپڑوں کے برانڈ: عمرکوٹ میں بہت سے کپڑوں کے برانڈ موجود ہیں جو بہت پہلے سے چلتے آرہے ہیں جس میں سے کچھ یہ ہیں۔۔ کیٹی۔ گھوڑا بوسکی۔ چائنا بوسکی۔ اسٹار گل احمد۔ خراش۔ ٹویو بوکیٹی۔ گل احمد کاٹن۔ اور غازی یہ سارے برانڈ عمرکوٹ میں بہت مشہور ہیں ان میں سے پہلے غازی بہت مشہور تھا اور اب گل احمد کاٹن بہت مشہور ہے۔

جوتیوں کے برانڈ: عمرکوٹ میں جوتیوں کے بھی بہت سے برانڈ مشہور ہیں

جیسے باٹا، کیریوں، جاوولا، کمانڈو، ایئر سوفٹ، نائیک، اور پشاوری چپل بہت مشہور ہیں لیکن اب بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن پہلے عمرکوٹ میں ہاتھ سے بنے چمڑے کی جوتیاں ملتی تھیں جو گھنشام داس اور دیچند جی بناتے تھے اور وہ کوکھی دری پر بناتے تھے اور ہاتھ سے بنی جوتیاں عمرکوٹ میں بنتی تھی۔

عمرکوٹ میں بڑے شاپنگ مال: عمرکوٹ میں اگر بڑے شاپنگ مال کی بات آگئی تو یو کے مال، آر کے مال اور سورج شاپنگ مال کا نام بتایا جاتا ہے۔ ان شاپنگ مال میں عورتوں کے ہر قسم کا سامان جیسے کپڑے، جوتیاں جولیری، برتن، چوڑیاں، کھانے پینے کی چیزیں یہ سب چیزیں یہاں ملتی ہیں اور ہول سیل ریٹ پر اور اچھی کوالٹی اور کم قیمت میں۔ اور یہ عمرکوٹ کے بیچ میں واقع ہے۔

عمرکوٹ میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی: عمرکوٹ ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر سائنس میں پیچھے نہیں رہا عمرکوٹ میں کمپیوٹر کی دکانوں میں مہتاب شاپ جو ٹاؤن کمیٹی کے پاس ہے اور موہت شاپ وہ بھی کمپیوٹر کی مشہور دکان ہے۔ نندلال اسٹامیٹر جس کے پاس ہر قسم کے کاغذ ہیں۔ عمرکوٹ میں موبائل فون کا بھی ایک بڑا شوروہ ہے جس کو شیشے کی دکان بولتے ہیں وہاں ہر قسم کا موبائل فون مرمت کیا جاتا ہے۔

عمرکوٹ میں روایتی کاروبار: عمرکوٹ میں روایتی کاروبار جیسے پرچون کی بھی پرانی اور نئی دکانیں موجود ہیں۔ روایتی کاروبار میں میلومل کی دکان، سعد سرفراز شاہ کی دکان، تھاکومل واٹیو کی دکان یہ ساری کریانہ دکان یا منیاری دکان بہت مشہور اور روایتی کاروباری دکانیں ہیں۔ ان دکانوں میں پنساری سامان کھانے پینے کا سامان، گھریلو سامان اور دوسرے سامان ملتے ہیں۔

عمرکوٹ میں بسنے والے تاجر خاندان: عمرکوٹ میں پرانے کاروباری خاندانی لوگ موجود ہیں جن میں سے ناگوری جو سب سے پہلے عمرکوٹ میں آئے اور اپنا کاروبار شروع کیا۔ ان کی بہت سی کپڑے کی دکانیں ہیں اور اب تک موجود ہیں۔ چل رہی ہیں۔ اور دوسرے ہیں شاہ جو کو پرانے کاروباری لوگ ہیں جن کا کاروبار ابھی تک چل رہا ہے۔ اور مہیشوری واٹیا بھی عمرکوٹ کے پرانے کاروباری لوگ ہیں

عمرکوٹ کی تفریح گاہوں کا معیشت میں کردار: عمرکوٹ میں تفریح کی بھی بہت سی جگہیں موجود ہیں جن میں عمرکوٹ کا قلعہ، سوج پارک، شانتی نگر، اکبر بادشاہ قبیو، سوریہ کامپلیکس وغیرہ یہ ساری جگہیں عمرکوٹ کی معیشت میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ عمرکوٹ کا قلعہ عمر ماروی کی داستان سے مشہور ہے۔ ایسی بہت سی تفریح گاہیں موجود ہیں جن کو دیکھنے کے لیے نہ صرف عمرکوٹ بلکہ دوسرے شہروں سے بھی لوگ آتے ہیں۔ ❁

گجرات کی معیشت

بہت دلکش انشاپردازی کی خالق نازیہ آصف بھی اطراف کو سوشل میڈیا سے نصیب ہوئیں۔ الفاظ بہت شیریں۔ جملے بہت رواں اور آسان۔ گجرات سے الفت ان کی ہر سطر سے ظاہر۔ ہماری درخواست پر انہوں نے گجرات کی معیشت پر دل میں اترتی۔ ذہن کو بیدار کرتی تحریر ارسال کی ہے۔ ایسی تحریر ایک باکمال وڈیو کی طرح الفاظ میں موضوع کی تصویریں کھنچتی چلی جاتی ہے۔ نازیہ آصف کے دلی شکریے کے ساتھ آپ کو گجرات لیے چلتے ہیں۔

لکڑی کی چارپائیوں۔ پیڑھیوں۔ صندوقوں سے فرنیچر گجرات کی عالمی پہچان بن گیا

تحریر: نازیہ آصف، گجرات

خطہ یونان، سوہنی کا دیس، شہیدوں کی سرزمین، میرا سوہنا شہر "گجرات" عہد اکبری سے ہی دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح صنعت وحرفت اور تجارت میں بھی روز افزوں ترقی کرتا آرہا ہے۔

ایک وقت تھا جب گجرات گوجر، جاٹ اور کئی دوسرے قبائل کی بے ہنگم بستی تھی۔ مغل حکمران کابل یا کشمیر جاتے ہوئے اکثر چناب کنارے پڑاو ڈالتے تھے۔ ایک دفعہ اکبر بادشاہ نے اپنے قیام کے دوران یہاں شاندار قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دے دیا۔ بادشاہ کے حکم کے بموجب 1580 میں یہاں اکبری قلعہ تعمیر کروا کر آبادی کو ایک بے ہنگم بستی سے باقاعدہ شہر بنا دیا۔ جس کی بلند فصیل کے چاروں سمت ایستادہ پرشکوہ داخلی دروازوں کے اندر اور باہر صنعت وحرفت اور تجارت سے وابستہ افراد نے ڈیرے ڈال لیے۔ اکبری قلعے کے بیچوں بیچ مرکزی راہگزر پر نان بائیوں، حلوائیوں، شیر کھیر فروشوں نے اپنے چبوترے اور برآمدے بنا لیے۔ اس کے علاوہ جفت سازوں، پارچہ بافوں نے بھی اپنے ساز وسامان سے انھیں علاقوں کو زیر نگیں کرنا مناسب خیال کیا۔

شہر کا جنوبی دروازہ کالری دروازہ کہلایا۔ تو شہر کے تخلیقی وتصوراتی ذہن نے وہاں قلعے کی فصیل کے ساتھ ساتھ ڈیرے جما لیے اور اس سرزمین کی چکنی اور خوشبودار مٹی کو مخصوص اشکال میں ڈھال کر کہیں کوزہ سازی تو کہیں ظروف سازی کے ذریعے اظہار فن کا راستہ اپنایا۔ جس سے متصل فصیل شہر کے ساتھ ظروف سازی کے گہوارے اور دکانیں وجود میں آتی گئیں۔ کوزہ گری سے ارتقاء پذیر ہونے والی یہ حرفت بالآخر چینی کے اعلیٰ ترین برتنوں تک بھی پہنچی۔ مگر پھر بجلی کے بلوں، بیکسز کی بھرمار اور چائنا کے غیر معیاری درآمدی میٹریل کے سامنے پیالہ سازی کی یہ صنعت تو دم توڑ گئی مگر دور رومانوی وافسانوی کرداروں سوہنی اور مہینوال کے رومانوی رشتے کی بنا پہ آج بھی یہ بازار سوہنی کا بازار کہلاتا ہے اور ایک میل کے علاقہ پر محیط ہے۔ یہ سوہنی ایک ظروف ساز خاندان کی بیٹی تھی جس کے کمال عشق کو کئی شعرا تو کئی قصہ گویوں نے اپنے اپنے انداز میں قصہ سوہنی مہینوال" کے روپ میں پیش کیا ہے۔

قلعہ کا مشرقی دروازہ جسے حضرت کبیر الدین شاہ دولہ کی نسبت سے شاہ دولہ گیٹ پکارا جاتا ہے، کے اندرون میں جہاں روایتی کھانوں اور مٹھائیوں کے کاریگر براجمان ہوئے، وہیں اکبری حویلی کے قریب ترسونے چاندی کے زیورات بنانے والوں نے سترھویں صدی میں ہی صرافہ بازار بنا لیا اور اسی صرافہ بازار کے بالاخانوں اور سہ نشینوں پر رقص وموسیقی سے وابستہ مرد وزن سازوآواز کا سحر جگانے لگے، اور یوں شام ڈھلتے ہی بازار صرافاں فنون لطیفہ سے مزین رنگین شاموں کا گہوارہ بن جاتا۔ یہ بازار 1931 تک اپنی آب وتاب کے ساتھ قائم ودائم رہا۔ پھر اسے آتش ناگہاں نے خاکستر کر دیا۔ جس کے بعد جوہریوں اور صرافوں نے تو اپنا کام شروع کر لیا لیکن بازار حسن دوبارہ اپنی رعنائیاں نہ دکھا سکا۔ رقاصائیں اپنے

> شام ڈھلتے ہی صرافہ بازار۔ رنگین شاموں کا گہوارہ بن جاتا

سازندوں، کنیزوں اور چاکروں کو لے کر گجرات کے اکلوتے ریلوے اسٹیشن کے قریب آباد ہو گئے، اور بھٹو کے دور حکومت میں ان پر پابندی عائد ہونے تک ریلوے سٹیشن کا یہ پسلو رنگ دنور سے مہکتا رہا اور داد عیش دینے والے سرشام ہی وہاں ٹھکانے بنا لیتے۔

دریائے چناب وجہلم کے درمیان واقع شہر گجرات اپنے شمال مشرق میں جموں اور کشمیر سے جا ملتا ہے۔ یوں جموں میں دریاؤں کے کنارے دیودار اور میدانی علاقوں میں نہروں کے دور ویہ ایستادہ شیشم اور کیکر کے گھنے جھنڈ اعلیٰ ترین عمارتی لکڑی کی فراہمی کا ذریعہ بنے۔ جس کے فوائد کو صدیوں قبل گجرات کے باسیوں نے بھانپ لیا تھا۔ جس سے چوبی چارپائیوں پیڑھیوں اور صندوقوں سے فرنیچر سازی کا ایک درخشاں دور

شروع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آج یہ صنعت اپنے پائیدار، خوبصورت اور عصر حاضر سے ہم آہنگ فرنیچر کی عالمی پہچان کا حامل ضلع بن چکا ہے۔

جب موسم سرما کے آغاز میں سرد ترین پہاڑی چوٹیوں سے گجر قبائل اپنے ریوڑ ہانکتے ہوئے میدانی علاقوں کا رخ کرتے تو کئی قبائل گجرات نامی اس بستی کے آس پاس میں بھی آ کر پناہ گزیں ہوتے رہے۔ یہی لوگ تھے پھر جن کی محنت و مشقت سے ضلع گجرات کا نواحی قصبہ جلالپور جٹاں پنجاب کا مانچسٹر کہلایا۔ جہاں گھر گھر کھڈیاں بنیں ہر طرح کا سوتی و اونی کپڑا کاریگروں کے ہاتھوں بہترین ملبوسات کی شکل اختیار کرنے لگا۔ اعلیٰ قسم کے پشمینہ و پارچہ بافی کی صنعت قائم ہوئی۔

قارئین! گذشتہ صدی کے اوائل میں برتن و فرنیچر سازی کی صنعت کی تیز تر ترقی اور پھیلاؤ سے گجرات شہر کا طول و عرض سہ چند بڑھ گیا۔ مرکزی قدیمی لاری اڈہ سے جانب سرگودھا، سڑک اور ریلوے اسٹیشن فرنیچر سازی کے صنعتی زون بن گئے۔ یہ زون اب جی ٹی روڈ کے دونوں طرف پھیل کر محض اسی صنعت سے متعلق ہو چکا ہے۔

چمڑے کی مصنوعات صدیوں تک حسب ضرورت بنائی گئیں، لیکن قیام پاکستان کے بعد گجرات جفت سازی میں نمایاں مقام حاصل کر گیا۔ معروف جفت ساز ادارے، باسکو اور سروس قائم ہوئے باسکو

نوجوانوں کی معاشی ہجرت سے گجرات عالمی گاؤں کا حصہ بن گیا

قومیائے جانے کے بعد رفتہ رفتہ بند ہو گیا۔ لیکن سروس انڈسٹریز دن بہ دن ترقی کرتی رہی جو گذشتہ پانچ دہائیوں سے عالمی معیار کے جوتے نہ صرف ملک خداداد کی حدود میں پہنچا رہی ہے بلکہ متعدد یورپی و امریکی جفت ساز اداروں کے اتصال سے قیمتی زرمبادلہ کما رہی ہے۔

اندرون شہر شیشیانوالہ دروازہ اور شاہدولہ گیٹ کے درمیان کا علاقہ قدیمی غلہ و سبزی منڈی کی موجودگی سے معروف تجارتی مرکز بن گیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شہر کا صدر بازار بن گیا۔ دو میل طوالت پر محیط یہ بازار ایک صدی قبل تک "تمبل بازار" کہلایا جواب کچھ دہائیوں سے مسلم بازار کے نام سے موسوم ہے۔ ملبوسات جوتوں سمیت روزمرہ کے جملہ سامان سے بھری ہوئے ایک ہزار سے زائد دکانیں اس بازار میں آج بھی آراستہ ہیں۔ اسی بازار کے پہلو بہ پہلو گلیاں بھی ذیلی بازاروں کی شکل اختیار کر گئیں۔ جن میں موتی بازار، کٹڑہ، شال بافاں روٹیوں والا چوک، مچھلی چوک، اور شاہدولہ چوک معروف تجارتی مرکز بن چکے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں بجلی کے آنے پر اہل گجرات نے برقی پنکھوں کی صنعت کی طرف توجہ دی اور قیام پاکستان سے قبل پنکھا سازی کی صنعت عروج پا چکی تھی۔ گذشتہ صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی پنکھا سازی کے عروج کا زمانہ تھا۔ گجرات کے سرکاری صنعتی ایریا کے ساتھ ساتھ گلی محلوں اور سڑکوں پر ہر دوسری عمارت میں پنکھا سازی شروع ہو گئی۔

گجرات میں نوے کی دہائی کے آغاز میں لگ بھگ دو ہزار کارخانے پنکھا سازی کر رہے تھے۔ پاک فین، یونس فین، ایس اے فین، رائل فین، میٹرو فین اور خورشید فین عالمی سطح کے برآمدی ادارے بن چکے ہیں

جوتے۔ پنکھے۔ موٹر سائیکل بنانے کی صنعتیں بھی نمایاں

جو یقیناً اہل گجرات کے لیے تفاخر کا باعث ہیں۔

ماضی قریب میں موٹر سائکل بنانے کی صنعت بھی گجرات میں قائم ہو چکی ہے۔ میٹرو موٹر سائیکل اور جوش موٹر سائیکل انڈسٹریز نے ملک بھر میں نام کمایا۔

عصر حاضر میں شہری آبادی میں بے ہنگم اضافے سے گجرات بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ قدیم غلہ منڈی میں بڑی گاڑیوں کی آمدورفت ناممکن ہو جانے سے ریلوے اسٹیشن کے قریب نئی غلہ منڈی قائم ہوئی، جو بنگلہ منڈی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ گنجان آبادی میں واقع سبزی و پھل منڈی کو بھی چند سال قبل برلب جی ٹی روڈ بائی پاس منتقل کر دیا گیا ہے۔

قیام پاکستان سے مہاجر ایک بڑی تعداد میں مشرقی پنجاب سے آ کر یہاں آباد ہوئے۔ مہاجر خاندانوں نے بوجہ الاٹمنٹ قدیم شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ ان ہجرت کر کے آنے والوں نے اپنے روایتی پکوانوں کو اپنا ذریعہ معاش بنا لیا۔ یوں اہل گجرات بریانی، کبابوں، فالودہ، دہی بڑے، سموسہ اور سری پائے جیسے ناشتے سے روشناس ہوئے۔

بھیا فالودہ، بابا تکہ، کراچی بریانی، دوبئی پکوڑہ، طلحہ ناشتہ اور الکرم سموسہ، دہی بڑے اور فروٹ چاٹ اپنے معیار کی وجہ سے برانڈ بن چکے ہیں۔

گذشتہ کچھ دہائیوں سے اہل گجرات کی ایک بڑی تعداد خلیجی ممالک، یورپ اور امریکہ جا بسی ہے۔

اس معاشی ہجرت نے ضلع گجرات کو گلوبل ویلج کا ایک جزو بن گیا ہے۔ چند سالوں میں ضلع کچہری کے قرب و جوار میں بیسیوں ملکی و غیر ملکی کاروباری برانڈز نے اپنے قدم جما لیے ہیں۔ اس وقت کے ایف سی، میکڈونلڈز، پاپا جونز، ہارڈیز، اور گلوریا جینز ایسے مشہور برانڈز گجراتیوں کو اپنا گرویدہ بناتے ہوئے روزانہ کروڑوں روپے کما رہے ہیں۔

کھانوں کے ساتھ ملبوسات جوتوں اور کاسمیٹکس بیچنے والے معروف برانڈز قطار اندر قطار واقع بڑے پلازوں میں کاروبار کر رہے ہیں۔ گل احمد، نشاط لینن، ڈائنرز، کیسریا، چنری، بونینزا ست رنگی، ایڈن روب،

پاپ کارنز۔ بھٹے۔ آلو چھولے۔ فنگر چپس کی ریڑھیاں گجرات کی رونق

الکرم، جے ڈاٹ، یونی ورتھ شرٹ اینڈ ٹائی شاپ، سایہ، سوکمال ملبوسات میں اور سٹائلو، بورجان، ای سی ایس، کلائیو، میٹرو، خواتین کے جوتوں میں اور لیوائز، بریک آوٹ، آؤٹ فٹرز، چارکول، ون تھنک، شیین ون، ون

سٹور مغربی ملبوسات کے لیے اہل گجرات کی توجہ اپنی جانب مبذول کیے ہوئے ہیں۔

ان بڑے کاروباری مالز کے باہر جرابیں، پراندے، ازار بند، لاسٹک اور کنگھے بیچنے والوں کی روزی روٹی کا بندوبست ہو جاتا ہے۔

موبائل اور کمپیوٹر عصر حاضر کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل مشہور کاروباری شخصیت رام طلاء کے نام سے موسوم رام طلاء روڈ کمپیوٹر، موبائل الیکٹرونکس، الیکٹرک اور شمسی توانائی کے آلات کا مرکز ہیں جس میں لگ بھگ ایک ہزار سے زائد بڑے اسٹور اور دکانیں صارفین کی خدمت کر رہے ہیں۔

قصہ المختصر کہ گجرات اپنے شاندار ماضی سے جڑے ہوئے بلند ذہن اور ہنرمند لوگوں کا وطن ہے۔ جو علم و ادب، فنون لطیفہ فوجی خدمات اور کھیل کے ساتھ ساتھ اپنی ہنرمندی صناعی اور تجارت کے لیے بھی ملک بھر میں نمایاں ہے۔ چناب کے کناروں پر زرخیز قطعات اراضی تمباکو کی فصل کے لیے ماضی بعید سے شہرت رکھتے ہیں۔ حقہ نوش آج بھی ملک بھر سے یہاں آ کر معیاری کڑوا تمباکو حاصل کرتے ہیں۔ زرعی معیشت کا حامل یہ ضلع غلہ اور سبزی اگانے میں بھی اول مانا جاتا ہے۔

ان سب کے علاوہ چھوٹے موٹے کاروبار کی بات کی جائے تو

کھانے پینے کے غیر ملکی برانڈ۔ کپڑوں کے ملکی برانڈ سب موجود

گجرات کی ڈیریز بھی کسی دوسرے میدان سے پیچھے نہیں۔ سبحان ڈیری، سردار ڈیری، ذائقہ ڈیری حمزہ ڈیری، السردار ڈیر، گوندل ڈیری دودھ، دہی، مکھن اور دیسی گھی کے سے شہریوں کو فیض یاب کر رہی ہیں۔ ان ڈیریز پہ دودھ کے ساتھ ساتھ بہترین رس، بسکٹس، بن، ڈبل روٹی بھی ملتی ہے، جو عموماً لوگ برانڈز کی مصنوعات سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کی پھینیاں خاص خصوصیت رکھتی ہیں۔ جو لوگ عموماً عید شوال پہ بہت زیادہ خریدتے اور بطور عید گفٹ بھیجنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا روایتی کاروبار یہاں نان بائیوں کا بھی ہے جو ہر گلی محلے میں دہی والا نان، آلو قیمے والا نان، روغنی نان، خمیری و پنیری روٹی اور سادہ روٹیاں بنا کر خدمت خلق میں مصروف ہیں۔

شام ہوتے ہی تقریباً شہر کا ہر چوک ہی فوڈ سٹریٹ بن جاتا ہے۔ جہاں کھمبیوں کی طرح ریڑھیاں اگ آتی ہیں۔ کوئی سیخ کباب تو کوئی چکن کارن سوپ، کوئی کلیجی پوٹ تو فرائی ونگز اور شامی کبابوں کی اشتہا انگیزیوں سے شہریوں کے دلوں کو بیتاب کر رہے ہوتے ہیں۔ کئی جگہ آپ کو کوئٹہ ٹی بھی دستیاب ہوتی ہے۔

پاپ کارنز، بھٹے، گنے کا جوس، گرما گرم خستہ بھنے چنے، آلو چھولے، فنگر چپس کی ریڑھیاں ہمارے شہر کی سڑکوں کی زینت ہیں۔

آخر میں تحریر کو اس دعا کے ساتھ سمیٹنا چاہوں گی کہ "اللہ پاک میرے شہر کی یہ رونقیں سدا شاد و آباد رکھے آمین! ❁

ضیاءالدین باجوڑ کے جواں سال طالب علم ہیں۔ اردو سے عشق ہے۔ ہماری خودنوشت 'شام بخیر' پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ 'اطراف' نے ان سے بھی فرمائش کی کہ وہ باجوڑ کے بارے میں جتنی معلومات قلمبند کر سکیں نذر قارئین کریں۔ مختلف کھانوں کے بارے میں وہ لکھ چکے۔ اب وہ باجوڑ کی معیشت۔ معدنیات اور زراعت کے بارے میں تحریر پیش کر رہے ہیں۔

قیمتی پتھروں سے مالا مال باجوڑ

باجوڑ سے طالب علم ضیاءالدین کی تحریر

انسانی زندگی میں معیشت کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معیشت کی وجہ سے انسان نہ صرف یہ کہ

عالمی مارکیٹ میں مقبول سنگ مرمر کے اَن گنت ذخائر

اپنی ضروریات کو پورا کرتا ہے بلکہ بہت سی آسانیاں بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے معاشی طور پر مستحکم شخص کو معاشرے میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے اس کے مدمقابل معاشی کمزوری کا شکار انسان نہ صرف یہ کہ سہولیات سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ بہت سے جائز ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے معاشی کمزوری کے شکار شخص کو معاشرے میں بالعموم عزت کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھا جاتا بہر کیف میرا موضوع سخن" باجوڑ کی معیشت" کے حوالے سے ہے اگر دیکھا جائے تو جنوبی ایشیا میں موجود تمام ممالک میں سے پاکستان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تحفہ ہے جنہیں اللہ نے ہر قسم کی نعمت سے نوازا ہے پاکستان کے تمام صوبوں میں سے خیبر پختونخوا واحد صوبہ ہے جو معیشت کے لحاظ سے زیادہ مستحکم ہے لیکن حکومت وقت نے ہمیشہ ہر قسم کی مراعات سے دور رکھا ہے اور ہر دور میں انہیں انصاف دلانے میں کوتاہی برتی اور وفاق ہی نے تمام حقوق سلب کر لی ہیں حکومت نے اس صوبے کے سادہ مزاج عوام کو اس خوش فہمی میں رکھا ہے غیور "پشتون"۔

باجوڑ بھی خیبر پختونخوا کا ایک ضلع ہے جو معدنیات اور دوسرے ملکی معیشت بہتر کرنے کے وسائل سے مالا مال ہے مختلف پتھروں میں سے نفرائیٹ کے باجوڑ میں بڑے ذخائر پائے جاتے ہیں چین، جاپان، ملائشیا، تھائی لینڈ اور دوسرے ممالک میں بھیجے جاتے ہیں جس سے حسن و زیبائش کے سامان بنائے جاتے ہیں۔ سنگ سلیکا یہ ایک اہم معدنی اور معاشی وسیلہ ہے جو کہ صنعتی پروڈکشن کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ باجوڑ میں سنگ مرمر کے مکمل ذخائر پائے جاتے ہیں جو قومی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں بہت مقبول ہیں۔ یہ معدنیاتی وسائل باجوڑ کی معیشت کو مضبوط بناتے ہیں اور اس علاقے کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

"ضلع باجوڑ کے باشندوں کی عام زندگی، تجارت اور دیگر پیشے"

خیبر پختونخوا میں واقع حسین و جمیل، سرسبز و شاداب علاقہ ضلع باجوڑ کے لوگوں کی معیشت زیادہ تر زراعت سے وابستہ ہے باجوڑ کی 70٪ فیصد آبادی زراعت کے پیشے سے جڑی ہے جب کہ باجوڑ میں کل قابل کاشت زمین 129036 ہیکڑز

زرعی زمینی بے حساب مگر قابل کاشت کم

زرعی زمین ہے جن میں 77062 ہیکڑز زمین کاشت کی جاتی ہیں جب کہ باقی بنجر پڑی ہیں 77062 ہیکڑز زمین میں سے صرف 15970 ہیکڑز زمین کے لیے پانی دستیاب ہیں جو اکثر

باجوڑ کی معیشت

قدرتی چشموں یا لوگوں کے طرف سے خود کھودے گئے کنووں سے سیراب ہوتی ہیں جب کہ باقی زمین کا پیداوار کا دارومدار بارش پر ہوتا ہے باجوڑ کی زمین زرعی پیداوار کے لیے آب و

سراج الدین خان نپر ائیٹ پتھر چین۔جاپان۔ملائشیا۔ تھائی لینڈ برآمد کرتے ہیں

ہوا کے لحاظ سے انتہائی مناسب ہے مگر بدقسمتی سے یہ سونا اگلنے والی زمینیں وقت کے ساتھ بانجھ ہورہی ہیں اس کے علاوہ باجوڑ کی شرح خواندگی بہت کم ہے اس لیے عموماً غریب لوگ مختلف کاروبار یعنی زراعت، محنت مزدوری کے طرف مائل ہوجاتے ہیں جو اپنے شہر یا آس پاس کے شہروں میں محنت مزدوری کے لیے جاتے ہیں اور خصوصاً مالدار لوگ تجارت اختیار کرتے ہیں اج کل باجوڑ کے صاحب اثر لوگ مختلف پتھروں کی تجارت کرتے ہیں ان کاروباری لوگوں میں

پانی کی کمی۔زراعت سے مکمل استفادہ نہیں کرنے دیتی

جماعت اسلامی کے سابق ایم پی اے سراج الدین خان بین الاقوامی سطح پر نپر ائیٹ کی تجارت کرتا ہے جو چین، جاپان، ملائشیا اور تھائی لینڈ میں بہت مشہور ہے سنگ مرمر کی تجارت باجوڑ کے لیے بہت مفید ہے جو مقامی اور قومی سطح پر ہوتی ہے۔ گرم کاری مصنوعات کی تجارت بہت زیادہ ہے جیسے کہ کپڑا، چادریں اور دیگر گرم اشیا فروخت کی جاتی ہیں مختلف قسم کے پھل مثلاً خوبانی، الوچا، اخروٹ، فارسمن اور انجیر کی کاشت

چاول۔گندم۔مکئ کی فصلیں صدیوں سے باجوڑ کی پہچان

باجوڑ میں وافر ہے۔

''باجوڑ کی مشہور غلے اور سبزیاں''

باجوڑ کی معیشت میں غلے کا اہم کردار ہے جیسے کہ چاول، گندم اور مکئ عام طور پر باجوڑ کے زرعی علاقوں میں کاشت کی جاتی ہیں ان کی بڑی مقدار موسمی زرعتی اشیا کی پیداوار میں اضافہ کرتی ہے اور معیشت کو مستحکم کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے زمانہ قدیم سے باجوڑ کے باشندے چاول، گندم اور مکئ کی فصلیں کاشت کرتے ہیں جب کہ پشت کے چاول

سارے خیبر پختونخوا میں شہرت رکھتے ہیں۔ باحوڑ کی معیشت میں سبزیوں کا بھی کافی حد تک کردار ہے سبزیاں غذائی لاحقہ میں ضروری عنصر فراہم کرتی ہیں جو صحت مند رہنے میں مدد فراہم کرتی ہیں ان کی کاشت میں مشغول لوگ معیشت کو بہتر بنانے میں ہر وقت کوشاں ہیں باجوڑ کی زراعت میں مشہور سبزیاں ٹماٹر، گوبھی، شلجم، گاجر، کھیرا، بھنڈی، بینگن، مرچ، اور پالک کی کئ قسمیں شامل ہیں یہ تمام پیداوار عموماً موسمی طور پر کاشت کی جاتی ہیں اور علاقے کی معیشت کے لیے اہمیت رکھتی ہیں مقامی عوام کی روزمرہ کی غذائی ضروریات کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مختلف شہروں میں بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ۞

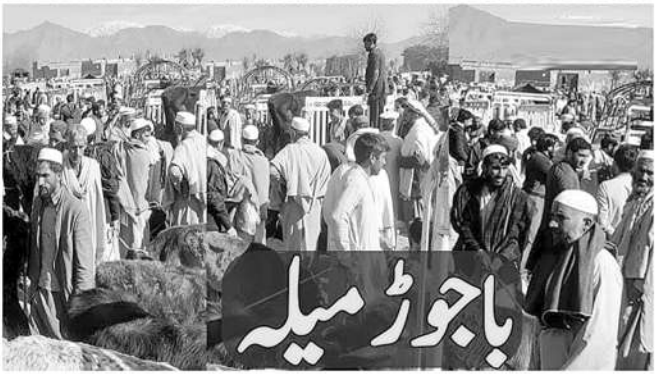

ہر شہر ملک کا اثاثہ ہوتا ہے۔ مظفر گڑھ پاکستان کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ 'اطراف' کی قلمی معاون اور اُردو کی معزز پروفیسر طوبیٰ خلیل نے 'اطراف' کی درخواست پر ایک مختصر مگر جامع مضمون عنایت کیا ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔ مظفر گڑھ کے قارئین خاص طور پر اپنے تاثرات سے نوازیں۔ وہ اپنے شہر کے بارے میں مزید اطلاعات سے بھی نواز سکتے ہیں۔

مظفر گڑھ۔ مین بازار۔ اور شاپنگ سینٹر بھی

تحریر: طوبیٰ خلیل

مظفر گڑھ شہر کی تاریخ دو سو تائیس سال پرانی ہے۔ اسکی تعمیری بنیاد نواب مظفر علی خان کے ہاتھوں ہوئی۔ انہوں نے اس شہر کے گرد اپنے

طالب علم۔ اساتذہ ایک یونیورسٹی کے لیے دعائیں کرتے ہیں

نام کا قلعہ تعمیر کروایا جو آج بھی اس کے گرد موجود ہے۔ تاریخ کے نشانات میں اس کا پرانا نام موس ہٹی ملتا ہے۔

پرانے دور میں ہر شہر یا قصبہ کو آباد کرنے سے پہلے اس کی حفاظت کے لیے چار دیواری یعنی فصیل (دروازے) بنائے جاتے تھے تاکہ حملہ آور بآسانی شہر تک نہ پہنچ پائیں۔ ہر شہر کی طرح اس کی آبادی بھی تقریباً 80 فی صد دیہات پر مشتمل ہے جن کی زبان سرائیکی ہے اور ان کی زندگی کا دارومدار شعبہ زراعت پر ہے۔ مویشی پالنا اور کھیتی باڑی کرنا ان کے محبوب مشاغل ہیں۔ موجودہ دور میں اکثریت کا رجحان کاروبار کی طرف بڑھ گیا ہے لیکن ابھی بھی کچھ لوگ ذاتی زرعی زمین ہونے کے باعث آباؤاجداد کے مشاغل کو ترجیح دیتے ہیں۔

مظفر گڑھ میں مین بازار بھی موجود ہے جہاں تقریباً ضروریات زندگی کا ہر سامان باآسانی دستیاب ہے۔ یہ شہر کے وسط میں موجود ہے جہاں تقریباً گردونواح کے علاقے کے رہائشی باآسانی ہر شے خرید سکتے ہیں۔ یہاں روایتی کاروبار میں زراعت کی فراوانی کے باعث آموں کی خرید و فروخت کا سلسلہ خاصا مضبوط ہے۔ اسکے علاوہ موسمی فصلوں کی

ترکی کے اشتراک سے ایک بڑا ہسپتال

اچھی پیداوار حاصل کی جاتی ہے۔

شہر میں غلہ منڈی موجود نہیں ہے اس سہولت کو حاصل کرنے کے لیے یہاں کے تاجر اور دوکاندار زیادہ تر قریبی شہر ملتان کا رخ کرتے ہیں۔

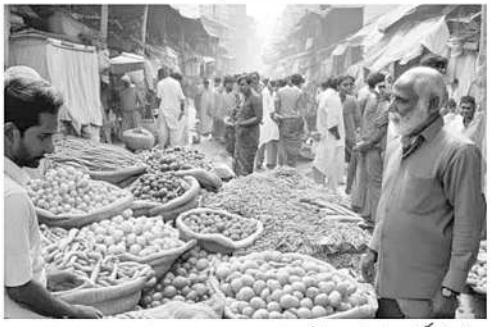

سبزی منڈی بھی محدود اور موزوں پیمانے پر موجود ہے۔

اس شہر کا رقبہ اور پھیلاؤ زیادہ وسیع تو نہیں لیکن پھر بھی یہاں پر دو سے تین کاٹن فیکٹریاں موجود ہیں جن میں تھل جیوٹ، محمود مل، فضل مل شامل ہیں۔

یہاں بڑے شاپنگ مالز دل پسند، اقراء شاپنگ سینٹر ہیں جنہوں نے ضروریات زندگی کا سب سامان ایک ہی چھت تلے مہیا کیا ہے۔

یہاں پر ایک اور خوبصورت قدم یہ ہے کہ گورنمنٹ آف پاکستان

محلوں میں پرانی دکانیں اب بھی خدمت میں مصروف

نے ترکی کی طرف سے ایک بڑا اسپتال قائم کیا گیا ہے جو مظفر گڑھ اور گردونواح کے لوگوں کے لئے مفت علاج معالجہ اور ادویات کی سہولت فراہم کر رہا ہے۔ اسکے علاوہ شہر میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اور سوشل سیکیورٹی جیسے اداروں نے بھی لوگوں کو یہ سہولت عطا کی ہے لیکن یہ صرف محدود پیمانے پر ہیں۔ اس لیے جدید مشینری اور آلات کی کمی کے باعث لوگ انڈس اسپتال کا رخ کرتے ہیں، یہ وسیع رقبے اور جدید سہولتوں سے آراستہ اسپتال رجب طیب اردگان کی دین ہے۔

پختہ سڑکیں، اسکول، کالج، کارخانے، اسپتال کی سہولتیں ہونے کے ساتھ ساتھ اس شہر میں صرف یونیورسٹی کی کمی ہے جو عدم توجہ کے باعث تاخیر کا شکار ہے۔ سیاسی شخصیات سے بے انتہا التجا کے باوجود بھی یہاں کے عوام مایوس نہیں ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی دن تو ایسا ہوگا جب اس شہر میں بھی یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا جائے گا اور یہاں کے طلبہ تعلیم کی فراہمی کے لیے دل کھول کر حصہ لیں گے۔

محدود ہونے کے باوجود بھی شہر میں ریلوے اسٹیشن، پوسٹ آفس کی سہولت موجود ہے۔ گلی محلوں میں پرانی دکانیں، اور کریانہ اسٹور ذاتی سطح پر ہیں جو بے روزگاری کی شرح کو کم کرنے کے لئے خوبصورت اقدام ہیں۔

گھریلو سطح پر بھی خواتین مردوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے گھروں میں کپڑے سلائی کرتے ہیں۔ یوں متوسط طبقے کی خواتین اپنا یہ فرض خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہیں۔

اس کے باوجود بھی شہر سے ہٹ کر کچی آبادی میں ایک بڑی تعداد خانہ بدوشوں کی بھی موجود ہے جو گداگری کو اپنا حق سمجھ کر زندگی گزار رہے ہیں۔

ان تمام پہلوؤں کے پیش نظر، اس شہر میں بیشتر آبادی غربت سے لبریز زندگی گزار رہی ہے۔

مظفر گڑھ میں تین تھرمل پاور اسٹیشن بھی ہیں۔ جہاں پر ملکی پیداوار کے لیے بجلی کا تقریباً 30 فی صد حصہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس علاقے کی بے روزگاری کو ختم کرنے کے لئے گورنمنٹ آف پنجاب کی طرف سے پنجاب جاب سینٹر کا قیام عمل میں لایا گیا ہے پہلے بھی یہاں پر لیبر ویلفیئر کا ادارہ قائم تھا لیکن موجودہ دور میں اس ادارے نے بے روزگار لوگوں کو روزگار کی تلاش کے لئے ایک خوبصورت پلیٹ فارم مہیا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مزدور طبقے کو ان کے حقوق کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

بورژوا طبقہ بھی انسانیت کے حقوق کا احترام کرتے ہوئے کچھ لوگوں

تین تھرمل پاور اسٹیشن۔ ملک کو 30 فی صد بجلی فراہم کرتے ہیں

کے کاروبار کو مضبوط بنانے کے لئے فاؤنڈیشنیں قائم کئے ہوئے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو آسان اقساط پر قرضہ فراہم کرتے ہیں تاکہ وہ اپنا معیار زندگی بہتر بنا سکیں۔ ان میں اخوت مرکز اور کشف فاؤنڈیشن کے نام نمایاں ہیں۔

ان تمام نکات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مظفر گڑھ جیسے دیگر شہر بھی پاکستانی معیشت کو مستحکم بنانے کی استعداد رکھتے ہیں۔ اگر ان شہروں پر بھرپور توجہ دی جائے اور عوامی اثاثہ کی مینوفیکچرنگ کو ترجیح دی جائے تو یقینی طور پر بہت سے مسائل حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ❁

بورے والا کی معیشت

پاکستان کے شہروں کی معیشت کے لیے بورے والا میں ہمارے اطراف نواز رانا محمد شاہد نے ہماری درخواست پر انتہائی مختصر مگر جامع مضمون سے نوازا ہے۔ جس سے بورے والا کی ایک بھرپور تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ان مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر اپنے طور پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ بڑھتی آبادی کی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

90 فیصد خواتین ریشم گلی سے خریداری کرتی ہیں

تحریر: رانا شاہد، بورے والا

بورے والا شہر کا نام پہلے بوڑھے والا تھا، جو مختلف تبدیلیوں کے بعد بورے والا بن گیا۔ یہ پاکستان کا 31 واں بڑا شہر ہے۔ بہترین تعلیمی معیار کی وجہ سے اسے سٹی آف ایجوکیشن بھی کہا جاتا ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے میں اس شہر نے کاروباری لحاظ سے بہت ترقی کی۔ جس کا ثبوت شہر میں تیزی سے بڑھتے شاپنگ مالز اور نت نئے برانڈز ہیں۔

روایتی کاروبار بورے والا میں جوتے اور کپڑے کا

شہر کے مختلف بازاروں کے نام اور تفصیلات

شہر کے مختلف بازاروں میں عارف بازار، وہاڑی بازار، ریل بازار، ریشم گلی وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ عارف بازار کا رخ قریبی شہر عارف والا کی طرف ہے جبکہ وہاڑی بازار کا رخ وہاڑی شہر کی طرف ہے۔ اسی طرح ریل بازار نام کی وجہ یہ ہے کہ اس کے قریب ریلوے اسٹیشن ہے اور ایک وقت تھا کہ اس بازار سے ٹرین گزرتی نظر آتی تھی۔ یوں یہ بازار ریل بازار کے نام سے مشہور ہوا۔

ریشم گلی کو ریشم گلی کیوں کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے ریشم گلی میں واقع ایک پرانے دکاندار محمد اقبال شیرانی سے بات ہوئی۔ جن کی پیدائش بھی یہیں کی ہے اور ان کا گھر اور دکان بھی اسی بازار میں واقع ہے۔ انہوں نے بتایا کہ 1980ء کے قریب یہاں سے کچھ لوگ حیدرآباد (سندھ) گئے۔ وہاں کی ریشم گلی میں کچھ عرصہ رہے۔ وہاں کام کیا اور سیکھا۔ پھر یہاں آکر اپنی دکانیں بنا لیں۔ جب کئی دکانیں بن گئیں اور انہوں نے متفقہ رائے سے اس جگہ کو حیدرآباد کی ریشم گلی کی وجہ سے ریشم گلی کہنا شروع کیا اور پھر یہی نام اس کی پہچان بن گیا۔ بورے والا کا سب سے مشہور بازار اگر ریشم گلی کو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ یہاں سے 90 فیصد کے قریب خواتین خریداری کرتی ہیں۔ کپڑے، جوتے اور جیولری سے لے کر روزمرہ استعمال کی دیگر اشیاء بھی مل جاتی ہیں۔ عید کے قریب آتے ہی اس بازار سے گزرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بیگم سلائی کرتی ہے تو ہر ہفتے ایک، دو چکر لگ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس عید پر بیگم سے کہا کہ میرے لیے یہاں سے گزرنا ناممکن ہے۔ بچے چھوٹے ہیں، اس وجہ سے معمولی اور ضروری چیزیں بھی لینی ہوں تو مجھے ہی جانا پڑتا ہے۔ خواتین باقاعدہ دھکے دے دے کر گزر رہی ہوتی ہیں اور عیدین پر خریداری تو گویا محاذ جنگ کی کیفیت ہی بیان ہو رہی ہوتی ہے۔

روایتی کاروبار

روایتی کاروبار جوتے اور کپڑے کا ہی ہے۔ ریل بازار اور ریشم گلی

بورے والا ٹیکسٹائل مل۔ دوآبہ آئل مل۔ ملت کاٹن فیکٹری

میں جوتے اور کپڑے کی بے شمار دکانیں ہیں۔ اب تو کئی محلوں میں بھی یہ کاروبار چل پڑے ہیں۔

غلہ منڈی

غلہ منڈی کا شمار بھی بورے والا کے قدیم بازاروں میں ہوتا ہے۔ یہاں آج بھی ایسی دکانیں مل جائیں گی۔ جنہیں دیکھ کر قیام پاکستان سے پہلے کا وقت یاد آجاتا ہے۔ شاید اسی منڈی کی مناسبت سے بورے والا شہر کا نام پہلے "منڈی بورے والا" تھا۔ آج بھی کئی جگہوں پر منڈی بورے والا لکھا نظر آتا ہے۔

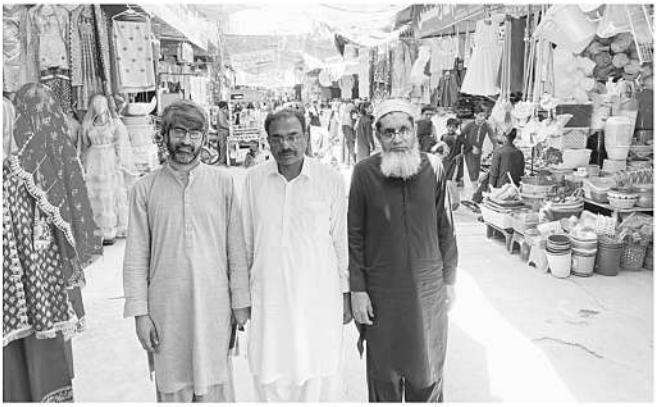

شاہ چراغ کریانہ اسٹور
عرف فوجی کی دکان

سبز منڈی

سبز منڈی پہلے شہر کے قریب ہی بی ٹی ایم ہائی سکول کے پاس تھی۔ اب یہاں بچوں کا پارک "جوائے لینڈ" ہے۔ سبز منڈی تقریباً 20 سالوں سے شہر سے باہر ملتان روڈ پر واقع ہے۔

کارخانے

"بورے والا ٹیکسٹائل مل" بین الاقوامی سطح پر بورے والا کی پہچان تھی۔ ایک وقت تھا جب بورے والا ٹیکسٹائل مل کو ایشیاء کی دوسری بڑی فیکٹری کا درجہ حاصل تھا۔ یہاں ہزاروں مزدور کام کرتے تھے۔ بین الاقوامی سطح کا کپڑا تیار کر کے دنیا بھر میں بھیجا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دو آئل مل اور کریسنٹ فیکٹری بھی مشہور کارخانے تھے۔ آج کل ملت کاٹن فیکٹری، اویس کاٹن فیکٹری اور

کمپیوٹر کی ساری دکانیں
اب موبائل فون کی دکانیں

بسم اللہ فلور مل نمایاں ہیں۔

بڑے کاروباری گھرانے، پرانی دکانیں محلوں کے کریانہ سٹور بورے والا کی پرانی دکانوں یا پرانے کاروباری گھرانوں میں دانیوال کریانہ سٹور، جوریل بازار میں واقع ہے۔ یہ قیام پاکستان سے پہلے کی دکان ہے۔ وہاں جا کر دیکھا تو اس کا طرز تعمیر بھی ویسا ہی تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے یہ کسی ہندو کی دکان تھی۔ ریل بازار اور اس کے ساتھ موجود ایچ بلاک (جہاں آج ریشم گلی واقع ہے) میں ہندو بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ ریشم گلی میں موجود مین سٹی تھانہ کی بلڈنگ میں ہندوؤں کا قدیم مندر آج بھی موجود ہے۔ اسی کے قریب وہ گھر بھی موجود ہے۔ جہاں بھارتی فلموں کے پہلے سپر اسٹار راجیش کھنہ پیدا ہوئے اور جن کے والد بورے والا کے مشہور ایم سی ماڈل ہائی اسکول کے پہلے ہیڈ ماسٹر تھے۔ دانیوال کریانہ سٹور کے مالک محمد شریف نے بتایا کہ یہاں کا نقشہ 1928ء میں منظور ہوا تھا۔ اسی طرح نواب دین کریانہ سٹور بھی بہت مشہور دکان تھی۔ جو 1970ء کے قریب بنائی گئی۔ امی بتایا کرتی تھیں کہ بڑے بھائی کی شادی کے لیے زیادہ تر خریداری انہوں نے اسی دکان سے کی تھی۔ یہ 1987ء کی بات ہے۔ اسی طرح احمد دین فقیر محمد کریانہ سٹور، رحمت کراکری بھی پرانی دکانوں میں سے ہیں۔ پاکیزہ ڈرنک کارنر کا شمار بھی پرانی اور مشہور دکانوں میں ہوتا ہے۔ ہمارے محلے گلستان کالونی میں حاجی نور کالم کریانہ سٹور 1992ء سے قائم تھی۔ چند سال پہلے حاجی صاحب کے انتقال کے بعد یہ دکان ختم ہوگئی۔ آج کل یہاں "شاہ چراغ کریانہ سٹور" کے نام سے دکان ہے۔ جو فوجی صاحب کی دکان سے مشہور ہے۔ شاید اس لیے کہ دکان کے مالک فوج سے ریٹائرڈ ہیں۔

بڑے شاپنگ مال

"سٹی سینٹر" بورے والا کا پہلا بڑا جدید شاپنگ مال ہے۔ جو 2003ء میں بنایا گیا۔ اس کے علاوہ الیقین ٹریڈ سینٹر، الحبیب سپر سٹور، الرحمان سینٹر، قاسم پلازہ وغیرہ نے بھی شہر کی کاروباری سرگرمیوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جہاں تک شہر کے برانڈ کی بات ہے تو ان میں ایڈن روپ، فیوور (Furor)، مولانا طارق جمیل (MTJ) وغیرہ مشہور ہیں۔

کمپیوٹر، انفارمیشن ٹیکنالوجی سے متعلق کاروبار

بورے والا میں کمپیوٹر سے متعلق بڑی مارکیٹ "العزیز مارکیٹ" ہے۔ یہاں 2000ء سے پہلے آموں کے درخت تھے۔ 2001ء میں یہ مارکیٹ بنی۔ گزرتے وقت کے ساتھ یہاں کمپیوٹر کی دکانیں موبائل کی دکانوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ اب دو، چار کو چھوڑ کر تمام دکانیں موبائل کی ہی ہیں۔ ❁

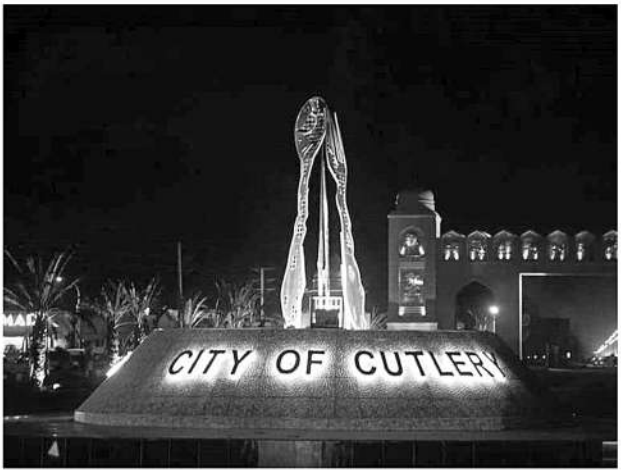

"ہمارے حلقۂ احباب میں جو بھی شامل ہوتا ہے۔ اس سے ہم بھی درخواست کرتے ہیں کہ اپنے شہر کے بارے میں قلم اٹھائیں اور کچھ معلومات قلمبند کریں۔ زید حبیب۔ ادب کے دلدادہ ہیں تعلق لاہور سے ہے۔ لیکن ننھیال وزیر آباد سے۔ 'شہر کی معیشت' نمبر میں ہماری فرمائش پر انہوں نے ایک مختصر سی تحریر مستند اور مصدقہ اعداد و شمار سے آراستہ کر کے نذر قارئین کی ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔"

برتن۔ چھریاں۔ چاقو۔ چمچے بنانے والا سٹی آف کٹلری

تحریر: زید حبیب

میرا تعلق لاہور سے جبکہ میرا ننھیال وزیر آباد ہے۔ لاہور سے 100 کلومیٹر کی دوری پر واقع اس شہر بے مثال سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ وزیر آباد کی بنیاد مغل بادشاہ شاہجہاں کے ایک گورنر وزیر خان نے رکھی اور اپنے نام کی مناسبت سے اسے وزیر آباد کا نام دیا۔ نواب وزیر خاں نے اس شہر کے گرد ایک فصیل بنوائی تھی جس کے مختلف دروازے تھے: گجراتی دروازہ، رسول نگری دروازہ اور لاہوری دروازہ وغیرہ۔ تاریخی اہمیت کا حامل یہ شہر آباد ہونے سے لے کر آج تک کبھی ویران نہیں ہوا البتہ اس پر بہت سی آفتیں وارد ہوتی رہی ہیں۔ رنجیت سنگھ تین بار اس شہر پر حملہ آور ہوا۔ ان دنوں یہ شہر اسلحہ سازی کا مرکز بن چکا تھا اور یہاں توپیں تک بنتی تھیں۔ حالات میں تبدیلی کے سبب آہستہ آہستہ یہ صنعت بالکل ختم ہوگئی۔ رنجیت سنگھ کے ایک مقرب دیوان حکمت رائے نے وزیر آباد میں ایک شیش محل بنوایا تھا جس پر اس دور میں 80 لاکھ کے لگ بھگ خرچ آیا تھا۔ اس عمارت کیلئے شیشے باہر سے منگوائے گئے تھے۔ اس کے ساتھ پائیں باغ اور بارہ دریاں بھی تھیں۔ آج اس عظیم الشان باغ کے محض آثار دکھائی دیتے ہیں۔ فرانسیسی جنرل ابوطویلہ نے علاقہ کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے چوپڑ کا بازار اور شہر پناہ تیار کروانے کے علاوہ پلکھو نالہ کے کنارے مثمن برج نامی رہائش تعمیر کی' اس کے پاس ایک باغ اور بارہ دری بھی تعمیر ہوئی۔ برطانوی عہدِ حکومت کے ابتدائی دور میں وزیر آباد میں ایک فوجی چھاؤنی بھی قائم کی گئی جہاں انگریز فوجی تربیت حاصل کرتے تھے۔

دریائے چناب کے کنارے واقع اس شہر کی معیشت پر بات کی جائے تو یہ کٹلری مصنوعات اور چھری' چاقو بنانے میں مہارت کی بدولت دنیا بھر میں اپنی منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اسے 'سٹی آف کٹلری' بھی کہا جاتا ہے۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے شہر کا تعارف جی ٹی روڈ پر واقع داخلی گول چکر کراتا ہے جس پر چمچ، کانٹا، چھری، چاقو بطور ماڈل نصب ہیں۔ کٹلری اور چاقو تیار کرنے والے تقریباً پانچ سو چھوٹے بڑے یونٹس وزیر آباد کے دس مربع کلومیٹر کے علاقے میں قائم ہیں۔ ملک کے اندر استعمال کیے جانے

فوجی چھاؤنی میں انگریز بھی تربیت حاصل کرتے تھے

کے علاوہ یہاں کی تیار کردہ مصنوعات بیرون ملک بھی بھیجی جاتی ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق یہاں سے 90 ملین امریکی ڈالرز کی مصنوعات برآمد کی جاتی ہیں اور اس صنعت سے 25 ہزار افراد کا روزگار جڑا ہوا ہے۔

قدیم شہر وزیر آباد نے اسلحہ سازی سے کٹلری سازی تک کا سفر کئی دہائیوں میں طے کیا۔ یہاں معیاری اور خوبصورت چاقو، تلواریں، خنجر، چھریاں، چاقو وغیرہ تیار کیے جا رہے ہیں۔ قدیم جنگوں کے

25 ہزار افراد کا روزگار۔ 90 ملین ڈالر کی برآمد

دوران استعمال ہونے والی تلواریں اور خنجر بھی خصوصی طور پر بنائے جاتے ہیں جنہیں سووینئر کے طور پر دنیا بھر میں لوگ اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔ محلات میں تحائف اور بادشاہوں کے روپ میں

دکھائے جانے والے اداکاروں کے زیر استعمال خنجر اور تلواروں کی طرح دکھائے جانے والے کٹلری آلات یہاں کے کاریگروں کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ صلیبی جنگوں میں کمانڈروں اور فوجیوں کے زیر استعمال تلواریں ان دنوں ترکی کے تاریخی ڈراموں، ارتغرل غازی، کورلس عثمان اور الپ ارسلان وغیرہ میں استعمال ہوتی دیکھی جاسکتی ہیں۔ وزیرآباد میں تیار ہونے والے آلات کی امریکہ اور یورپ میں کافی مانگ ہے۔ یہاں کی مقامی صنعت کٹلری اور سرجیکل آلات بنانے میں مشہور تو ہے تاہم اسکے قریبی دیہات چاول، گندم، سبزیات اور گنے کی پیداوار میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔

وزیرآباد شہر میں موجود بازاروں کا تذکرہ کیا جائے تو علاقہ کا سب سے بڑا بازار ''مین بازار'' کہلاتا ہے۔ یہ بڑا پررونق بازار ہے جو وزیرآباد شہر اور اردگرد موجود اڑھائی سو سے زائد دیہات کے

یہاں کے سرجیکل آلات کی مانگ امریکہ اور یورپ میں بھی

لوگوں کی ضروریات کو بخوبی پورا کر رہا ہے۔ یہاں کے دیگر اہم بازاروں میں موتی بازار، ریل بازار، موج دین بازار، بکر گلہ، برتن بازار قابل ذکر ہیں۔ برتن بازار میں آپ کو گھریلو استعمال کے تمام برتن با آسانی مل جاتے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے پہلے وزیرآباد میں کوہستانی لکڑی کی بہت بڑی منڈی تھی جسے وقت کی رفتار کھا گئی ہے۔

وزیرآباد شہر میں موجود شاپنگ مالز کا ذکر کیا جائے تو یہاں مسٹر مارٹ، اُسامہ سنٹر، وزیرآباد مال، نیٹ مال، پیرس سپر مارٹ اور سٹی سپر مارٹ کے نام قابلِ ذکر ہیں جہاں ایک ہی چھت تلے بنیادی اشیائے ضروریہ کی دستیابی کو یقینی بنایا گیا ہے۔ ان مالز میں روزانہ سینکڑوں افراد خریداری کیلئے آتے ہیں۔ وزیرآباد میں ایک منفرد نوعیت کا شاپنگ مال بھی تعمیر کیا گیا ہے، مال ون کے نام سے منسوب یہ شاپنگ مال وزیرآباد کے شہریوں کیلئے جدید تعمیراتی حسن کا ساہکار ہے۔ وزیرآباد شہر میں نامور برانڈز کے کپڑوں اور جوتوں کی متعدد دکانیں بھی کھل چکی ہیں جن میں گل احمد، کیسریا، سیفچ، بی برانڈز، سروس، باٹا قابلِ ذکر ہیں۔

وزیرآباد شہر کی سیاست پر تو چٹھوں اور چیموں کا ہی زیادہ تر قبضہ رہا ہے تاہم یہاں کی مشہوری کاروباری شخصیات یا فیملیز کا تذکرہ کیا جائے تو ان میں حاجی غضنفر علی مرحوم کی فیملی (یہ خاندان گزشتہ پچپن برس سے زائد مین بازار میں اپنا کاروبار کر رہا ہے)، حمید اختر چڈھا، الیاس چوہان، حاجی سرور، مشتاق احمد بٹ، شیخ محمد آصف، چوہدری ناصر محمود اللہ والے، فرحان الٰہی، محمد خالد مغل، شیخ توصیف، ضیغم الٰہی، ملک قاسم علی اعوان، مہر شکیل اعظم، وسیم اکبر،

دلاور جمشید' مہر زاہد ودیگر شامل ہیں۔ حاجی غضنفر علی راجپوت تجارت کے پیشہ سے منسلک تھے جن کی مین بازار میں متعدد دکانیں تھیں۔ان کا کاروبار کافی وسیع تھا' اپنی نفیس طبع کی بدولت اہل علاقہ ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔

وزیر آباد شہر کے گلی محلوں میں پرچون اور کریانہ کی بھی بہت سی دکانیں ہیں جو لوگوں کے باعزت روزگار کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں ۔ شہر کے مین بازار میں موجود انوارالٰہی مرحوم کی دکان وزیر آباد کی چند پرانی پرچون کی دکانوں میں سے ایک تھی جہاں سے لوگ اپنی بنیادی اشیائے ضروریہ خریدنے کیلئے آتے تھے۔

مین بازار۔اڑھائی سو سے زیادہ دیہات کی ضروریات کا کفیل

اسی طرح 1974ء میں عبدالحفیظ امرتسری کی قائم کردہ ایرانی نان شاپ (موجودہ صوفی نان شاپ) بھی شہر کی پرانی دکانوں میں سے ایک ہے۔عبدالحفیظ کی فیملی امرتسر سے ہجرت کر کے یہاں آئی تھی۔ان کا کہنا ہے کہ جب میں نے اس دکان کا آغاز کیا تو ایک روپے کے 25 نان آتے تھے لیکن گاہک زیادہ نہ ہونے کے باعث سائیکل پر رکھ کر شہر میں گھوم پھر کر نان فروخت کیا کرتا تھا۔ اُس دور میں زیادہ تر افراد گھر کی گندم کا آٹا ہی کھاتے تھے۔

وزیر آباد میں تین غلہ منڈیاں او ایک سبزی منڈی بھی موجود ہے جو یہاں کے رہائشیوں کو اناج اور سبزیوں کی فراہمی کیلئے کافی معلوم ہوتی ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں برصغیر میں چمڑے کے دو کارخانے (وزیر آباد اور کانپور) ہوا کرتے تھے۔شیخ نیاز احمد ان میں سے ایک کارخانے وزیر آباد ٹمیزی کے مالک تھے۔تجارت، صنعت اور سخاوت کے علاوہ شیخ نیاز احمد طب میں بھی مہارت رکھتے

تھے۔وزیر آباد میں ربڑ اور پلاسٹک کی مصنوعات بنانے والی عالمی معیار کی کمپنی'' ڈارسن انڈسٹریز'' لیدر کی مصنوعات بنانے والی کمپنی'' پاکستان ٹمیزی'' اور مکینکل انجینئرنگ کمپنی'' البدر'' یہاں کے لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کے علاوہ شہر کی معاشی ترقی کا ذریعہ بھی بن رہی ہیں ۔ اس کے علاوہ وزیر آباد شہر کے قریبی دیہات چاول، گندم، سبزیات اور گنے کی پیداوار میں بھی مشہور ہیں۔ پاکستان میں پریشر ککر بنانے کا آغاز بھی اسی شہر سے ہوا۔ پاکستان کا نمبرون برانڈ ڈومیسٹک (حال شیف) پریشر ککر بنانے کی بڑی فیکٹری وزیر آباد میں قائم ہے۔علاوہ ازیں دری بافی (گکھڑ منڈی) کے لحاظ سے بھی یہ علاقہ نمایاں ہے ۔وزیر آباد کا علاقہ گکھڑ کئی قسم کی زرعی اجناس پیدا کرنے کیلئے مشہور ہے جبکہ یہاں کی مشہور صنعت 'دری سازی' ہے۔یہاں پر ملک کا ایک بڑا گرڈ اسٹیشن بھی ہے جو پنجاب کے بڑے شہروں کو بجلی سپلائی کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ گکھڑ منڈی صنعتی شہر بنتا جا رہا ہے۔اس کی دیگر صنعتوں میں سنگ مرمر، پنکھے، برتن، سرامکس اور فرنیچر شامل ہیں۔

نامور سیاسی' سماجی' علمی اور اَدبی شخصیات کا تعلق وزیر آباد سے رہا ہے۔خود اس شہر کے بانی نواب وزیر خاں ایک بڑے طبیب اور عالم فاضل تھے۔ سیّد احمد شہید کی تحریک کے آخری امیر مولوی فضل الٰہی، تحریک پاکستان کے عظیم رہنما اور نامور صحافی مولانا ظفر علی خاں، مولانا حامد علی خاں، جسٹس ایس اے رحمن، منو بھائی' عطاء الحق قاسمی' مولانا عبدالغفور ہزاروی' کرشن چندر، مولوی محمد عابد وزیر آبادی، پنجابی شاعر نذر مولا، ناول نگار رضیہ بٹ، قائد اعظمؒ کے پولیٹکل سیکرٹری محمد شریف طوسی، جسٹس جواد ایس خواجہ 'سابق صدر پاکستان محمد رفیق تارڑ' سابق آئی جی موٹروے پولیس ذوالفقار احمد چیمہ' سابق سپیکر قومی اسمبلی حامد ناصر چٹھہ' سابق وزیر غلام سرور چیمہ' معروف گلوکار عاطف اسلم ودیگر کئی نامور شخصیات کا تعلق سرزمین وزیر آباد سے ہے۔

درج بالا سطور میں وزیر آباد شہر کی تاریخ اور معیشت کا مختصر تذکرہ کیا ہے' ان معلومات کی فراہمی کیلئے میں فرحان الٰہی' رانا فاروق طاہر اور نعیم اشرف کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے شہر کی تاریخ اور معیشت کے حوالے سے اعداد وشمار سے آگہی فراہم کی۔ ❁

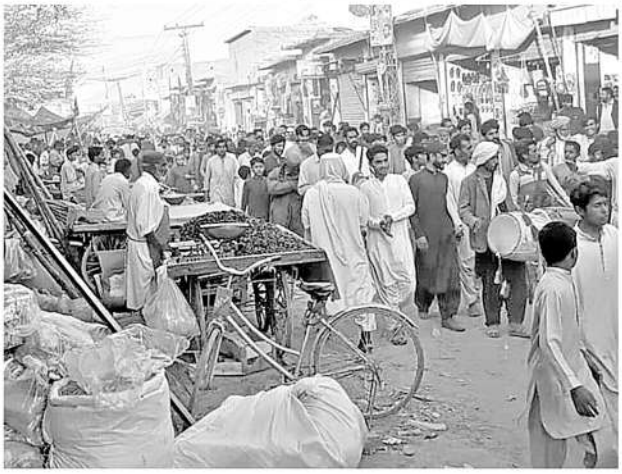

بھاگ شہر کی معیشت

”'اطراف' کو فخر ہے کہ پاکستان کے بڑے چھوٹے شہروں کی معیشت۔محل وقوع اور اہم مقامات سے باخبر کرتا ہے۔محمد رفیق مغیری ابھی کاروان 'اطراف' میں شامل ہوئے ہیں۔ہماری درخواست پر انہوں نے بھاگ کے ماضی حال مستقبل سے آگاہ کیا ہے۔اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔“

صدیوں پرانا شہر بھاگ۔کاروانوں کا مرکز

تحریر: محمد رفیق مغیری

بھاگ شہر۔تاریخی پس منظر!

بھاگ لفظ کے معنیٰ ہیں بخت، خوش قسمت ،اور مالدار۔بعض

ہندو خاندانوں نے کاروبار کو سنبھالا

روایات کے مطابق یہاں سب سے پہلے کوئی مالدار شخص رہائش پذیر ہوا جسے عرف عام میں بھاگیا کے نام سے پکارا جانے لگا اور ان کی نسبت سے یہ بھاگ مشہور ہوگیا۔دریائے ناڑی کے مشرقی کنارے پہ واقع اس شہر کی تمام اراضی دریائے ناڑی سے سیراب ہوتی ہے اس لئے اسے بھاگ ناڑی بھی کہتے ہیں۔جب ہم بھاگ شہر کی قدامت اور تاریخی حیثیت کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بھاگ شہر کئی صدیوں پرانا تاریخی شہر ہے۔آج تک بھاگ کچھی کا نہایت ہی اہم شہر رہا ہے۔براعظم ایشیا کی تمام ریاستوں کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے بہت سارے ممالک کے ساتھ تجارتی رابطے رہے ہیں۔میجر سی ایف مینچن اپنی کتاب کچھی گزیٹر جو 1907ء میں شائع ہوئی تھی کے صفحہ نمبر 188-187 اور 189 پہ بھاگ شہر کا محلِ وقوع بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ" بھاگ شہر کا شمال سے جنوب کی جانب ایک بڑا مرکزی بازار چل رہا ہے۔جیسا کہ کچھی کے تقریباً تمام بازار ہیں اور کافی تعداد میں مکانات ہیں یہ قصبہ ایک مٹی کے چار دیواری یعنی قلعے کے اندر ہے قلعے کے چھ دروازے ہیں چار بڑے اور دو چھوٹے۔سب سے نمایاں عمارت ہندو دھرمسالہ ہے جو کافی لاگت سے تیار کی گئی ہے قصبے کے باہر جنوب مغرب میں ایک مقبرہ ہے جسے قبا شہیداں یا شہنشاہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔مرکزی گنبد میں فن تعمیر کی خوبصورتی کے لئے کچھ جھلکیاں ہیں اور یہ سفید پلاسٹر سے ڈھکا ہوا ہے ایک وقت میں چار گنبد بھی چبوترے کے چاروں کونوں کو آراستہ کرتے تھے جن پر مزار کھڑا ہے۔اس مقبرے میں سندھ کے روہڑی کے رہنے والے میاں غلام محمد اور ان کے شاگرد حاجی عبدالرحیم کی قبریں ہیں اس کے متعلق کہانی کچھ یوں ہے۔(میاں غلام محمد کابل کے بادشاہ زمان شاہ کے روحانی سربراہ مرشد تھے اور بھاگ کے مقام پر رہتے تھے۔زمان شاہ کے وزیروں کی سازشوں سے غلام محمد نے بادشاہ کے ساتھ اپنا اعتماد کھو دیا اور کابل سے فرار ہو گیا۔بادشاہ نے اپنے سواروں کو بھیجا جنہوں نے اپنے شاگرد کے ساتھ بھاگ کے قریب پہنچ کر قتل کر دیا اور ان کے سر لے

اناج۔اونی قالین۔کھالیں۔ تمباکو۔بادام کھجور کے باغات

گئے لیکن ان کے پیرو کار سنتوں کو جب یہ خبر ملی تو انہوں نے ان کا پیچھا کیا۔اور پیچھا کرتے ہوئے افغان سواروں تک پہنچ گئے جنگ کر کے افغان سواروں کو مارا اور سنتوں سے ان کے

سر واپس لے کر بھاگ میں دفنا دیئے۔ اس مقبرے کے دیوار کے جنوب میں ابھی بھی دو قبروں کی باقیات دیکھی گئی ہیں جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دو یورپی آفیسران کو دفن کیا گیا تھا جو پہلی افغان جنگ کے دوران ہلاک ہوئے تھے۔ قصبے کے شمال مغرب میں اور میر دروازے کے بالمقابل میر مصطفیٰ خان کا مقبرہ ہے جو میر محمود خان اول کے بھائی اور میر محراب خان دوئم کے چچا تھے۔ جو 1839ء میں قلات میں مارے گئے تھے مصطفیٰ خان کا کچھی میں کافی اثر ورسوخ تھا کوٹڑو کے قریب اپنے بھائی رحیم خان نے غداری سے قتل کر دیا دونوں بھائی اب ساتھ ساتھ اسی مقبرے میں دفن ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مقبرہ 1224ھ یعنی 1809ء میں میر مصطفیٰ خان کی بہن بی بی زینب نے تعمیر کروایا تھا ایک خادم مجاور جو ریاست کے زیر انتظام ہے قبر کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ میجر آگے لکھتے ہیں کہ بھاگ کی آبادی 1903ء کے شماریات کے مطابق 3635 نفوس پر مشتمل ہے جس میں سے 473 کاریگر ہیں جو مختلف کارخانوں میں کام کرتے ہیں جس میں کپڑے بنانے والے کارخانے جوتے بنانے والے ہتھیار بنانے والے برتن بنانے والے قالین بنانے والے اور زیورات بنانے والے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ کل آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ ہندوؤں پر مشتمل ہے میر خداداد خان کے زمانے میں اس قصبے میں تقریباً 1600 مکانات تھے جن کی آبادی تقریباً 12000 نفوس پر مشتمل تھی یہ جگہ اب بھاگ اور لہڑی کے لیے مستوفی کا ہیڈ کوارٹر ہے اور مقامی نیابت کا ایک پرائمری سکول ہے۔"

جس طرح اوپر ذکر کیا گیا ہے بھاگ کی آبادی کی ایک تہائی ہندوؤں پر مشتمل تھی بہت عرصہ پہلے یہاں سے کافی تعداد میں ہندوؤں نے ہجرت کی تو ان ہجرت کرنے والوں میں ایک بچی تھی وہ بڑی ہوئی پڑھی لکھی باشعور عورت بنی تو وہ اپنی تاریخی اصلیت کے بارے میں فکر مند رہنے لگی آخر کار کافی سوچ بچار اور تحقیق کے بعد اس نے ایک کتابچہ انگریزی زبان میں لکھا "ہسٹری آف بھاگ ناڑیز"

اس عورت کا نام تھا ہری کے نستا۔ وہ اپنی کتابچے میں بھاگ ناڑی کی تاریخ کے عنوان سے لکھتی ہیں کہ "یہ ایک کمیونٹی کی مختصر تاریخ ہے جس کی آخری گنتی میں ۲۰۰۰ سے زیادہ افراد نہیں ہونگے جس نے بمبئی کو اپنا گھر بنالیا ہے۔ اور جس کا مرکز کٹاریہ کالونی کے اردگرد ہے۔ جو ماہم شیواجی پارک اور دبئی میں ایک تاریخی نشان ہے۔ یہ نوجوانوں اور دیگر لوگوں کی ایک کمیونٹی کی کہانی ہے جنہوں نے ہندوستان کے ساحلوں سے آگے دبئی، کویت، ہانگ کانگ، امریکہ، کنیڈا اور آسٹریلیا جیسے دیگر ممالک کو اپنی کرما بھومی بنالیا ہے ہم جنوبی بلوچستان

کراچی میں بھاگ ناڑیوں کی یادگار عمارتیں

کے میدانی علاقوں میں واقع ریاست قلات کے گاؤں بھاگ اور نار (جڑواں دیہات) کے اصل باشندے ہیں جیسے کچھی میدان بھی کہا جاتا ہے جو سبی سے جنوب کی طرف سندھ کی طرف کھلنے والی ایک نشیبی خلیج ہے اس علاقے میں بنیادی طور پر مسلمان قبائل آباد تھے جنہیں براہوئی اور بلوچ کہا جاتا ہے ہندو ایک چھوٹی اقلیت تقریباً پانچ فیصد تھے تاہم تقریباً تمام کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا اور عام طور پر تمام مسلم

قبائل ان کی عزت کرتے تھے۔ ہندوؤں نے اپنے آپ کو مخصوص قبیلوں سے وابستہ کرلیا۔ نوآبادیاتی دور میں مختلف نسلی قبائل کے درمیان مسلسل جنگیں اور خونریزی ہوتی رہتی تھی لیکن ہندوؤں کو عام طور پر نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ حالانکہ وہ حریف قبیلے سے وابستہ تھے دراصل ایک غیر تحریری قانون تھا کہ بین قبائلی جنگوں کی صورت میں ہندوؤں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ تقریباً تمام کاروباری اور تجارتی سرگرمیاں ہندو ہی کرتے تھے انہوں نے ایک طرف وسطی بلوچستان اور افغانستان کے پہاڑی علاقوں اور دوسری طرف سندھ کے نشیبی علاقوں کچھی اور لسبیلہ کے درمیان سامان کے تبادلے کا اہتمام کیا۔ پہاڑی علاقوں میں پیدا ہونے والے سامان میں اناج سے اون بنے ہوئے قالین کھالیں تمبا کو بادام پوتاش کھجور اور خشک میوہ جات شامل ہیں جبکہ نشیبی علاقوں سے درآمدات میں کپڑے تیل چربی جوتے برتن مصالحے نمک اور مویشی شامل ہیں خانہ بدوش مسلم قبائل نے قافلوں کو محفوظ بنانے کے لیے ضروری نقل وحمل اور تحفظ کے لیے اونٹ فراہم کیے تھے۔ ہندو تاجروں نے اپنے سامان کی نقل وحمل کے لیے خانہ بدوش قبائل کی موسمی ہجرت کا بھی استعمال کیا۔ بہت سے قبائلی علاقوں میں آباد طرز زندگی کی طرف بڑھتا ہوا رجحان مستقل رہائش اور بازار کی دکانوں کی تعمیر کا باعث بنا اس طرح متعدد ہندو خاندان اپنے منسلک قبائل سے الگ ہو گئے اور مختلف بستیوں میں منتقل ہو گئے جن میں ڈھاڈر بھاگ سبی اور بیلہ شامل ہیں۔

بہتر زندگی کی تلاش!

تاہم ہمارے آباواجداد جو کاروباری اور آگے نظر آنے والے تھے سماجی اور اقتصادی دونوں لحاظ سے بہتر زندگی چاہتے تھے وہ اس لیے پنجاب اور سندھ جیسے محفوظ اور زیادہ خوشحال مقامات کی طرف ہجرت کی ہجرت اچانک اور اجتماعی نہیں تھی بلکہ انیسویں صدی کے اوائل سے انیسویں صدی کے اواخر تک نصف صدی سے زائد عرصے میں بتدریج پھیلی

بھاگ شہر کی معیشت

تھی انھیں راستے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا نقل وحمل کے جدید ذرائع دستیاب نہیں تھے دریائے سندھ اور دیگر آبی گزرگاہوں پر کوئی پل نہیں بنے تھے جبکہ بہت کم لوگ پنجاب میں ہجرت کر گئے ہمارے زیادہ تر آباؤاجداد شمالی سندھ میں جیکب آباد شکارپور اور سکھر جنوبی سندھ میں حیدرآباد اور کراچی چلے گئے پنجاب اور شمالی سندھ کی طرف ہجرت کرنے والے متعلقہ جگہوں کی مقامی آبادی میں ضم ہو گئے کیونکہ وہ تعداد میں بہت کم تھے چونکہ جیکب آباد حیدرآباد اور کراچی میں ہجرت کرنے والے بھاگناڑیوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے وہ اپنی انفرادی شناخت کو محفوظ رکھ سکے۔

ہم میں سے جنہوں نے حیدرآباد سندھ ہجرت کی اور بھاگ گاؤں سے تعلق رکھتے تھے وہ "بھاگیس" کہلانے کو ترجیح دیتے تھے ناڑ گاؤں سے تعلق رکھنے والے چند افراد کو "ناڑیوال" کہا جاتا تھا جیسے جیسے دونوں کا وقت گزرتا گیا بھاگیوں اور ناڑیوالوں کا اتحاد ہو گیا اور اس طرح بھاگ ناڑی کمیونٹی نے جنم لیا۔ زیادہ تر بھاگ ناڑی چند کو چھوڑ کر جو پہلے حیدرآباد سندھ میں آباد ہو چکے تھے کراچی میں آ کر آباد ہوئے جو ایک بڑا شہر تھا اور اس کے مواقع زیادہ تھے کراچی میں زیادہ تر بھاگناڑی " پاموداال اسٹریٹ جنوبی کراچی میں رہتے تھے۔ اور چند خاندان کراچی شہر کے شمال میں سولجر بازار، دھوبی گھاٹ اور کیمپ کے علاقوں میں آباد تھے آہستہ آہستہ چند خاندانوں کو چھوڑ کر باقی سب پامودلال اسٹریٹ میں شفٹ ہو گئے۔ بعد میں یہ گلی "بھاگ ناڑی پاڑا" کے نام سے مشہور ہوئی اتفاق سے آج بھی کراچی میں "پامودلال اسٹریٹ اور بھاگ ناڑی پاڑا کراچی کے پرانے شہر کا حصہ ہے۔ جہاں کراچی کے پہلے ہندو باشندے بشمول بھاگ ناڑی آباد ہوئے تھے دوسرے ہندو باشندے چھیرس نصرپوری داواس اور برہم کھتری تھے۔ لیکن بھاگ ناڑی کراچی کے پہلے ہندو آبادکاروں میں سے تھے شری چیتمل موہن داس شری بھاگناڑی پنچائیت کے پہلے صدر تھے۔

مندرجہ بالا واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ کراچی ہجرت کرنے والے بھاگناڑی کے باشندوں نے وہاں بھی خوب ترقی کی اور خوشحال ہوئے چار بھاگ ناڑیوں کو جسٹس آف پیس ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور کئی کے پاس ریوالور بندوق کا لائسنس بھی تھا ایک بھاگناڑی مسٹر کالومل نستا سندھ سمال کاز کورٹ کے چیف جج تھے۔

ہم ایک صدی سے زیادہ عرصے سے کراچی میں تھے ہم نے سندھی میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کی اور باقی تمام معاملات میں سندھی تھے لیکن پھر بھی اپنی زبان بھاگناڑی والی نہیں چھوڑی۔ کراچی میں بھاگناڑیوں کے فائدے کے لئے درج ذیل یادگاریں تعمیر کی گئیں۔

۱۔ کنیا شالا بھاگناڑی لڑکیوں کے لئے اسکول۔

۲۔ کمیونٹی ہال شری بھاگناڑی پنچائیت ہال جو بھاگناڑی پاڑا سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پہ تھا۔

۳۔ مندر پنچائیت ہال کے باہر کمپاؤنڈ میں شیو مندر

٤۔ دربار شیو مندر کے قریب گرونا نک دربار۔

٥۔ مندر لکشمی نارائن مندر

٦۔ غسل گھاٹ نجی غسل خانہ

> اناج منڈی سے سامان جیکب آباد۔
> شکارپور۔ سکھر۔ حیدرآباد۔
> کراچی جاتا ہے

۷۔ سماجی اور اسپورٹس کلب اور کمیونٹی ہال سے متصل جمنازیم۔

دوسری جنگ عظیم 1939-1940 کے دوران جب کراچی شہر پر بمباری کا خطرہ منڈلا رہا تھا ہماری پنچائیت نے کراچی سے تقریباً 100 کلومیٹر جنوب میں جھمپیر کے مقام پر ایک پلاٹ خریدا اور تقریباً 15 ہزار مربع فٹ کے رقبے پر ایک قلعہ تعمیر کیا بھاگناڑی بھائیوں کی حفاظت کے لیے یہ علاقہ دو فٹ موٹی اور بارہ فٹ اونچی دیوار سے گھرا ہوا تھا درحقیقت یہ ایک چھوٹا لیکن محفوظ اور تمام بھاگناڑیوں کے لئے محفوظ قلعہ تھا۔

تقسیم اور اس کا نتیجہ:

کراچی سے ہجرت کرنے کے بعد زیادہ تر بھاگناڑی بمبئی میں اور بنیادی طور پر ماہم کے علاقے میں آباد ہوئے پاکستان کے دیگر حصوں سے خاص طور پر جیکب آباد اور بھاگ ہماری اصل آبائی جگہ سے بہت سے بھاگ ناڑی والے ہیں جو ادے پور اور اندور چلے گئے کٹاریہ کالونی کے بہت سے باشندوں کے تعلقات ادے پور اور شاید اندور میں ہیں۔ ساٹھ کی دہائی کے آخر اور ستر کی دہائی کے اوائل تک بھاگ ناڑی خاندانوں نے دبئی میں رہنا شروع کیا اس وقت تک 600 سے زائد خاندان بھاگ ناڑی کے دبئی میں امیر ترین کاروبار کے ساتھ منسلک ہیں۔""

بھاگ ناڑی کی موجودہ صورتحال:

اس وقت بھاگ ناڑی تحصیل چھ یونین کونسل جس میں جلال خان، نوشہرہ، پہوڑ، حامد بستی، چھلگری، اور محرم پر مشتمل ہے جبکہ بھاگ شہر خود میونسپل کمیٹی ہے۔ تحصیل بھاگ ناڑی کی آبادی تقریباً 86000 نفوس پر مشتمل ہے۔ بھاگ خوانینِ قلات کے زمانے میں ریاست قلات کا سرمائی دارالحکومت ہوا کرتا تھا۔ بھاگ ناڑی کی زمین انتہائی زرخیز ہے مگر دریائی پانی نہ ہونے کی وجہ سے یہ پورا علاقہ خشک آبہ ہوتا ہے۔ مگر قانونِ قدرت نے کچھی کے تمام میدانی علاقوں کو اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ ہر دس سے بارہ کلومیٹر کے دوری پہ ایک نہر بنا رکھی ہے۔ جب شمالی پہاڑوں میں بارشیں ہوتی ہیں تو دریائے ناڑی درائے بولان اور دوسرے دریاؤں میں طغیانی آجاتی ہے اور زمینوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ اور زمینوں کو پانی بھی صرف ایک مرتبہ دیا جاتا ہے اور وہی ایک پانی پہ چار ماہ بعد کوئی بھی فصل تیار ہو جاتی ہے۔ اگر بارش نہ ہو تو زمین غیر آباد رہ جاتی ہے خریف کے موسم میں پانی آجائے تو زمینوں میں جوار مونگ موٹھ تِل گوار اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے اور اگر ربیع کے موسم میں پانی آجائے تو سرسوں، جانبھا، گندم، چنا، دھنیہ، خربوز تربوز، بہترین قسم کے ہوتے ہیں۔ اور بہت ہی پیداوار دیتے ہیں۔ بھاگ کی اناج منڈی سے تجارتی اناج جیکب آباد شکارپور سکھر لاڑکانہ حیدرآباد اور کراچی کی منڈی کے علاوہ رحیم یار خان صادق آباد بہاول پور اور ملتان تک جاتی ہے۔

یہاں بھاگ ناڑی نسل کے بکرے بکریاں اور بیل گائے نہایت ہی اعلیٰ نسل کے پائے جاتے ہیں بہت ہی خوبصورت قدآور اور جسامت میں بہت بھاری ہوتے ہیں۔ ہر سال سبی کے تاریخی میلے کے موقع پہ اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر کراچی مویشی منڈی میں بھاگ ناڑی نسل کے بیل نہ صرف انعام یافتہ قرار پاتے ہیں بلکہ بھاری رقم میں فروخت بھی ہوتے ہیں۔ بھاگ ناڑی نسل کے مویشیوں کا علاقائی سطح پہ سرکاری کیٹل فارم اوستہ محمد کے قریب ہے ملکی سطح پہ لاہور میں بھاگ ناڑی نسل کا کیٹل فارم ہے اور بین الاقوامی سطح پہ آسٹریلیا میں بھاگ ناڑی نسل کا کیٹل فارم موجود ہے۔ جس طرح بھاگ کی سرزمین بہت ہی زرخیز ہے اسی طرح مردم خیز بھی رہی ہے۔ بھاگ اور کچھی کے سرزمین نے نہایت ہی نامور شاعر ادیب اور دانشور سیاسی رہنماء پیدا کیے ہیں۔ جس میں نمایاں نام یوسف عزیز مگسی، گل زیب مگسی، ملک محمد پناہ، ملک محمد رمضان بلوچ، مولوی محمد شریف بزدار، گل محمد ایروی میاں مولوی حضور بخش جتوئی، سید رکھیل شاہ سید چیزل شاہ، صوفی احمد فقیر، ڈاکٹر عبدالحئ بلوچ کے نام نمایاں ہیں۔

بھاگ شہر میں شاہی بازار، جلال خان بازار، صابر شاہ بازار،

صرافہ بازار، پرانا بس اڈا بازار، سبزی مارکیٹ اناج مارکیٹ درزی مارکیٹ بس اڈا وگین اڈا مویشی منڈی واقع ہیں جبکہ شہر سے باہر نیو بس اڈا گریڈ اسٹیشن کے سامنے چھلگری مارکیٹ زیر تعمیر ہے جس کی تکمیل کے بعد شہر کی رونق میں مزید اضافہ ہوگا۔ بھاگ بازار کے ساتھ دس ہندو محلے ہیں بھاگ شہر میں اس وقت ایک بوائز ڈگری کالج جبکہ گرلز کالج زیر تعمیر ہے دو بوائز ہائی سکول دو گرلز ہائی سکول دو مڈل سکول اور بہت سارے پرائمری سکول ہیں بھاگ میں اسسٹنٹ کمشنر پولیس تھانہ جوڈیشل مجسٹریٹ سیشن جج کمپلیس نادرا آفیس واپڈا آفیس زراعت آفیس (جو کہ دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ ہوا ہے کہ ویران اور بند پڑا ہے کوئی پوچھنے والا نہیں) گریڈ

اسٹیشن نیشنل بینک ایجوکیشن آفیس اور پی ایچ ای آفیس موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کئی دینی مدارس بھی ہیں بھاگ پاکستان کا واحد شہر ہے جس کی آبادی کے تناسب سے مسجدوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بھاگ شہر بشمول پورے تحصیل میں پینے کا صاف پانی میسر نہیں ہے۔ سیلابی پانی جب آتا ہے تو اسے تالاب میں اسٹور کیا جاتا ہے پھر وہی پانی انسان اور حیوان اکھٹے پیتے ہیں۔ بعض اوقات سیلابی پانی نہیں آتا تو پھر وہ پانی بھی دستیاب نہیں ہوتا تو پھر شہر میں کربلا کا سماں ہوتا ہے پینے کے صاف پانی کے لیے بھاگ کے عوام نے بہت ہی جدوجہد کی ہے کیونکہ دو دہائیوں سے ایک سوچی سمجھی سازش کے طور پر بھاگ کی عوام کو پانی نہیں دیا جا رہا ہے اس لیے بھاگ کے نوجوان بھاگ سے ڈھائی سو کلومیٹر لانگ مارچ کر کے کوئٹہ گئے مگر محکمہ پی ایچ ای نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ بھاگ کے عوام کو پانی نہیں دینا ہے یہاں تک کہ سپریم کورٹ اسلام آباد نے بھی نوٹس لیا مگر پھر بھی بھاگ کو پینے کا پانی نہیں دیا گیا۔ حالانکہ بھاگ شہر کے لیے تین علیحدہ علیحدہ علاقوں سے واٹر سپلائی لائنیں آتی ہیں جس میں سنی واٹر سپلائی لائن سب سے پہلے یہی لائن تھی کئی سالوں تک اس لائن سے وافر مقدار میں پانی ملتا رہا بلکہ کئی دوسرے قصبوں کو بھی اسی لائن سے پانی دیا جاتا تھا مگر پھر اس سے دانستہ طور پر پانی دینا بند کر دیا گیا۔ اسکے علاوہ شوران واٹر سپلائی لائن اور پٹ فیڈر کینال سے کچھی واٹر سپلائی

پلان۔ ان تینوں واٹر سپلائی لائنوں پہ مختلف اوقات میں کروڑوں روپے خرچ ہوئے تمام لائنوں پہ عملہ آفیسران موجود ہیں تنخواہ گاڑیوں اور جنریٹروں کی تیل مرمت کے پیسے کھا رہے ہیں مگر پانی کی ایک بوند بھی نہیں دیتے۔ محکمہ پی ایچ ای اپنی ضد اور انا کی بنیاد پر بائیس سالوں سے بھاگ شہر کو پانی دینے سے یکسر طور پر انکاری ہے تمام ریاستی ادارے نمائندوں اور عوامی چیخ و پکار کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ آج تک محکمے کی آفیسران تو دور کی بات ہے کہ والومین کو بھی معطل نہیں کیا گیا ہے۔ بے حسی لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا اگر ایوارڈ بنتا تو دنیا کا سب سے بڑا نوبل انعام کا حقدار محکمہ پی ایچ ای بلوچستان کے آفیسران ہوتے۔

بھاگ کی زیادہ تر آبادی بلوچ اقوام کی ہے اسکے علاوہ جاموٹ اقوام بھی کافی تعداد میں ہے ہندوؤں کی کافی تعداد ہے اور تمام کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں اس علاقے میں بلوچی براہوئی سرائیکی اور سندھی زبانیں بولی جاتی ہیں ہندوؤں کی مادری زبان سرائیکی ہے۔ بھاگ شہر میں پیر صابر شاہ حیدر شاہ صوفی احمد فقیر صوفی زمان فقیر کے مزارات ہیں اور شہر سے سات کلومیٹر کے فاصلے پہ مشہور درگاہ پیر تیار غازی اور صوفی اشرف فقیر کے مزارات واقع ہیں۔ بھاگ سے شمال کی جانب تقریباً ستر کلومیٹر کے فاصلے پہ سبی اور ڈھاڈر شہر واقع ہیں ڈھاڈر کچھی ضلعے کی ہیڈ کوارٹر ہے بھاگ کچھی ضلع کا سب سے بڑا اور تاریخی شہر ہے۔ مغرب کی جانب تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پہ تحصیل

بیس سال سے
بھاگ کو پانی
فراہم نہیں کیا جا رہا

سنی اور کیرتھر پہاڑی سلسلہ ہے مشرق کی جانب اٹھارہ کلومیٹر کے فاصلے پہ کوئٹہ نیشنل ہائی وے ریلوے اسٹیشن بیل پٹ اور اس سے آگے تیس کلومیٹر مشرق کی جانب تحصیل لہڑی شہر واقع ہے اس سے تھوڑے فاصلے پہ مشرق کی جانب ڈیرہ بگٹی کا پہاڑی سلسلہ واقع ہے بھاگ سے جنوب کی جانب تقریباً اسی کلومیٹر کے فاصلے پہ گنداواہ شہر اسکے بعد جھل مگسی واقع ہے اسکے علاوہ ڈیرہ مراد جمالی جھٹ پٹ جیکب آباد بھی جنوب کی جانب واقع ہیں۔ بھاگ گرم ترین علاقہ خط استوا کے نیچے واقع ہونے کی وجہ سے جون جولائی اور اگست میں پچاس اور اکاون ڈگری گرمی ہوتی ہے کم مئی سے دس جون تک انتہائی گرم لُو چلتی ہے جو بہت خطرناک ہوتی ہے جس کی وجہ سے مسافروں کو اگر راستے میں پانی دستیاب نہ ہو تو فوراً موت واقع ہو جاتی ہے اپریل تا اکتوبر گرم موسم شمار کیے جاتے ہیں دسمبر جنوری اور فروری میں کافی سردی پڑتی ہے۔ خصوصاً ساون کو موسم میں جب زیادہ بارشیں پڑتی ہیں اور میدانی علاقوں میں پانی آجاتا ہے تو سارا میدان علاقہ سرسبز ہو جاتا ہے اور ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے جس سے زمین کی خوبصورتی میں بے اضافہ ہو جاتا ہے۔

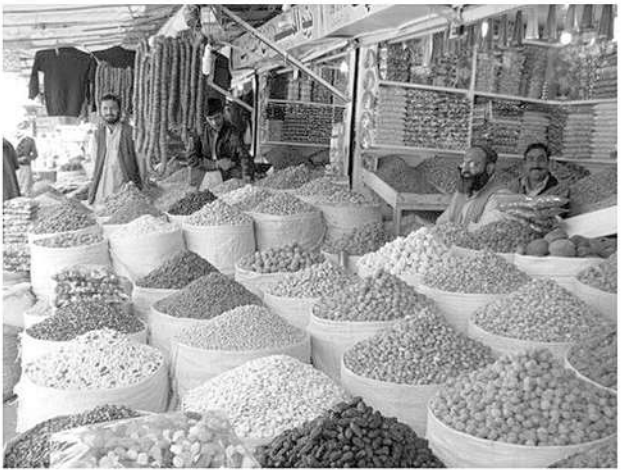

کوئٹہ عالمی شہرت یافتہ شہر بہت حساس بہت اہم بھی۔ محمد اجمل انتہائی سینئر صحافی۔ 'جنگ' میں ہمارے رفیق کار تھے۔ اب ماہنامہ 'اطراف' میں بھی بلوچستان کی نمائندگی بہت ذمہ داری سے انجام دے رہے ہیں۔ کوئٹے کی معیشت پر ایک جامع تحریر سے نواز رہے ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

کوئٹہ۔ مرکزی شہر کی آبادیاں بازار بن گئیں

تحریر: محمد اجمل، کوئٹہ

شہر جو 1876 میں آباد کیا گیا لیکن 31 مئی 1935 کے زلزلے میں ملبے کا ڈھیر بن گیا اس کی پچاس ہزار کی آبادی میں سے 30 ہزار افراد ہلاک ہو گئے لیکن انگریزوں نے فوراً ہی اس شہر کی تعمیر نو شروع کر دی اور زیادہ اور بہتر منصوبہ انداز میں اس شہر کو 1947 تک تعمیر اور آباد کیا۔ اس وقت اس کی سڑکیں اور بازاروں کے نام زیادہ تر انگریز حکام اور مقامی ہندو اور سکھوں کے نام پر تھے لیکن پاکستان بننے کے بعد کئی نام تبدیل ہو گئے ماسوائے چند سڑکوں اور مشہور بازاروں کے۔ وہ مشہور بازار آج بھی سورج گنج بازار کے نام سے ہے جبکہ بروس روڈ محمد علی جناح روڈ بن گیا اینڈرسن روڈ اب لیاقت بازار کہلاتا ہے۔ پاکستان بننے سے لیکر 70 کی دہائی تک جناح روڈ لیاقت بازار سورج گنج بازار اور قندہاری بازار جس کا نام اب اقبال روڈ ہے یہی اہم بازار تھے لیکن آج کوئٹہ کی آبادی پچاس ہزار سے بڑھ کر 35 لاکھ تک پہنچ چکی ہے اس لئے شہر کے مرکزی حصے میں جو آبادیاں تھیں وہ تمام سڑکیں اور گلیاں اب کمرشل ایریا بن چکے ہیں جیسے کاسی روڈ پرنس روڈ شاہ کشاہ روڈ موتی رام روڈ عبدالستار روڈ مسجد روڈ مشن روڈ میکانگی روڈ سرکلر روڈ طوغی روڈ یہ تمام اب مختلف نوعیت کے بازاروں اور مارکیٹوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ بلکہ شہر سے باہر نئی اور گنجان آباد بھی وجود میں آ گئیں جن میں اپنا مارکیٹیں اور شاپنگ پلازے بن چکے ہیں۔ لیاقت بازار میں لیاقت مارکیٹ' ہاشمی مارکیٹ' سنہری مارکیٹ' الیکٹرانک اشیا' بچوں کے کپڑے اور ایرانی اشیا سوئیٹر وغیرہ فروخت ہوتے ہیں۔ پرنس روڈ جسے اب فوڈ اسٹریٹ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مختلف کھانوں کا مرکز بن گیا ہے جہاں نعمت کدہ ہوٹل کیفے جہانگیر چھ عشرے قبل سے بڑے زور و شور سے کاروبار میں مصروف ہیں جبکہ پرنس روڈ پر بلوچی چپل کی دکانیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ عبدالستار روڈ پر شیشے کے برتن اور مختلف اشیا کی دکانیں موجود ہیں۔ کاسی روڈ پر سبزی کی

پرنس روڈ
فوڈ اسٹریٹ بن گئی

دکانیں اور گوشت' چکن فروخت ہوتا ہے جبکہ ساتھ ہی قدیم لنڈا بازار ہے جہاں غیر ملکی استعمال شدہ پرانے کپڑے فروخت ہوتے ہیں۔ یٹ روڈ پر ادویہ کے ہول سیل کا بزنس اور نئی پرانی گاڑیاں فروخت کی جاتی ہیں۔

مسجد روڈ پر دلچسپ بات بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا شاید پاکستان کا پہلا بازار ہے جہاں گوردوارہ مندر اور جامع مسجد

مسجد روڈ۔ گوردوارہ، مندر اور جامع مسجد۔ قریب قریب

تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موجود ہیں یہاں پر کتابوں کی دکانوں اور نمکو وغیرہ فروخت ہوتے ہیں جبکہ ہومیو پیتھک اور یونانی ادویہ کی خرید و فروخت کا بھی بہت بڑا مرکز ہے۔

قندھاری بازار میں چائے خشک دودھ اور دال چاول چینی اور دیگر اشیا کی ہول سیل کی دکانیں ہیں۔ جناح روڈ پر زیادہ تر بنک واقع ہیں اور فتح خان مارکیٹ اور دیگر کاروباری ادارے کام کر رہے ہیں پٹیل روڈ اور زرغون روڈ پر پرائیوٹ ہسپتالوں نے اپنا کاروبار چمکا رکھا ہے۔ ڈبل روڈ پر گاڑیوں کے پرزہ جات اور ورکشاپ واقع ہیں۔ ایئرپورٹ روڈ پر بڑے بڑے کھانوں کے مرکز بن گئے ہیں۔ ہزار گنجی

ایئرپورٹ روڈ پر بڑے بڑے کھانوں کے مراکز

میں ملک کے دیگر حصوں سے سبزیاں اور پھل آتے ہیں اور سبزیوں کی تھوک کی دکانیں ہیں۔ تھانہ سٹی میزان چوک پر سٹیل کی دکانیں اور ڈرائی فروٹ کی دکانیں ہیں جن میں بابا نصیب اور زیارت ڈرائی فروٹ مشہور ہیں۔ سیٹلائٹ ٹاؤن میں بڑیچ مارکیٹ واقع ہے جس میں زیادہ تر ایرانی قالین صرف اور دیگر اشیا فروخت کی جاتی ہیں۔ گورو سنگھ روڈ پر پتنگوں کی دکانیں اور کھیلوں کا سامان فروخت ہوتا ہے۔ شاہ کشاہ روڈ پر گوشت، فاسٹ فوڈ، بریانی کی معروف دکانیں ہیں جبکہ شاہ کشاہ روڈ سے ملحقہ موتی رام روڈ پر تازہ پھولوں کی پتیاں، قومی پرچم، شادی بیاہ کا سامان اور دیگر اشیا فروخت کی جاتی ہیں کوئٹہ کے آرچر روڈ کو اردو بازار کہا جا سکتا ہے جہاں پر مختلف تعلیمی اداروں کی کتابیں اور یونیفارم فروخت ہوتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر کی سطور میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ گزشتہ دو تین

سرکی روڈ پر ایرانی سامان کی خرید و فروخت

دہائیوں کے دوران پورے کوئٹہ شہر کا نقشہ تبدیل ہو گیا خاص طور پر نائن الیون کے بعد دہشت گردی کی جو لہر آئی اس دوران دہشت گردی سے متاثرہ کئی علاقوں کے عوام نے کوئٹہ میں ہی دیگر محفوظ علاقوں کا رخ کیا جو پہلے تو بہت ویران تھے لیکن اب وہ کوئٹہ کے معروف علاقوں کا روپ دھار چکے ہیں جن میں نواں کلی قابل ذکر ہے ''کلی'' کا لفظ پشتو میں دیہات کیلئے استعمال کیا جاتا ہے یہ قدیمی دیہات تھا لیکن اب یہ صرف نام کا دیہات رہ گیا ہے یہاں بلند و بالا شاپنگ پلازے شورومز سرکاری ونجی ہاؤسنگ اسکیمیں معرض وجود میں آ چکی ہیں اور چند برس کے دوران لاکھوں افراد اس علاقے کو اپنا رہائشی اور کاروباری مسکن بنا چکے ہیں اور مستقبل قریب میں اس کی آبادی میں مزید تیزی سے اضافے کا امکان ہے۔ صوبائی دارالحکومت میں ملک کے دیگر صوبوں کی نسبت سمگل شدہ ایرانی پٹرولیم مصنوعات کا کاروبار کھلے عام ہو رہا ہے دکانوں میں لوگوں نے پمپس نصب کر کے چھوٹے چھوٹے پٹرول پمپس بنا رکھے ہیں جہاں پٹرول اور ڈیزل فروخت کیا جاتا ہے شہری آبادیوں میں قائم یہ پٹرول پمپس نہ صرف قریبی آبادی کیلئے خطرہ ہیں بلکہ دیگر صوبوں سے آنے والے لوگوں کیلئے باعث حیرت بھی ہیں۔ اسی طرح ایرانی خوردنی اشیا بھی فروخت ہوتی ہیں سرکی روڈ پر واقع بڑیچ مارکیٹ ایرانی خوردنی اشیا کا بہت بڑا مرکز ہے جہاں ملک بھر سے لوگ آ کر ایرانی سامان کی خریداری کرتے ہیں۔ کوئٹہ کو غیر ملکی گاڑیوں اور پرزہ جات کی خرید و فروخت کا حب کہا جا سکتا ہے۔ یہ پرزہ جات کافی سستے اور اچھی حالت میں مل جاتے ہیں۔ ۞

1935 کے زلزلے سے پہلے جناح روڈ کا ایک خوبصورت منظر

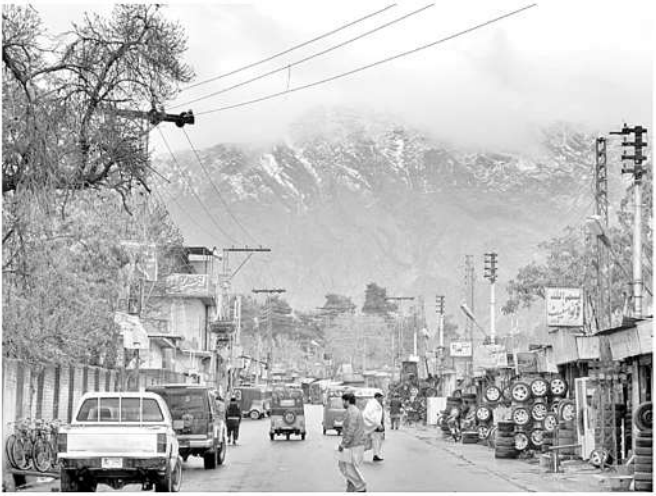

ہر باپ عظیم۔لائق تعظیم

عظیم والد کے حضور خراج تحسین کا سلسلہ۔بہت پذیرائی ہو رہی ہے۔ صدف بنت اظہار شاعرہ ہیں۔ادب نواز ہیں۔ادبی حلقوں میں سرگرم بھی رہتی ہیں۔اپنے قابلِ احترام والد اظہار حیدری کی یاد میں بھی متحرک رہتی ہیں۔'اطراف' کی فرمائش پر ان کا منظوم خراج نذر قارئین ہے۔

سچ یہی ہے بہت دلدار تھے میرے والد

اپنی اولاد کے معمار تھے میرے والد

☆صدف بنتِ اظہار

سر سے پاؤں تک ایثار تھے میرے والد
سچے ہمدرد و ملن سار تھے میرے والد
حرفِ تعمیر کا اظہار تھے میرے والد
اپنی اولاد کے معمار تھے میرے والد
جھوٹ سے برسرِ پیکار تھے میرے والد
یقنی حق سچ کے علمدار تھے میرے والد
شیر آمیز، شکر بار تھا لہجہ اُن کا
اتنے پیارے تھے ملنسار تھے میرے والد
میں نہیں کہتی یہ کہتے ہیں معاصر اُن کے
اپنے ہر فن میں ہی شہکار تھے میرے والد
مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ اندھیرا کیا ہے
یعنی اک عالمِ انوار تھے میرے والد
جب بھی کچھ کہتے تو لفظوں سے مہک آتی تھی
اپنی گفتار سے عطار تھے میرے والد
چودھویں رات چمکتا ہوا اک چاند نہیں
ہر سیہ رات میں صوبار تھے میرے والد
اُن کی تربت پہ ہو رحمت کی ہمیشہ بارش
آدمی دوست، مددگار تھے میرے والد
وہ بہت دور ہیں لیکن ہیں صدفؔ دل کے قریں
سچ یہی ہے، بہت دلدار تھے میرے والد

❀❀❀

ہر باپ عظیم۔لائق تعظیم

اب 'اطراف' کا مستقل سلسلہ

ہم آج کے دَور میں اپنے خاندان کو پالنے۔ اولادوں کو تعلیم دلوانے والے باپ کو خراج ہر شمارے میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ آئندہ شماروں میں درج ذیل کرم فرماؤں کی دل میں اترتی تحریریں نذر قارئین کی جائیں گی۔

1۔سکینہ خالدہ
2۔میر حسین علی امام۔کراچی
3۔ریحانہ اعجاز۔کراچی
4۔ہنی رضا۔کراچی
5۔رکشا ڈرائیور
6۔علی فیصل۔ملیر کینٹ
7۔جمیل اطہر قاضی۔لاہور
8۔علی عمران ممتاز
9۔طوبیٰ خلیل۔مظفر گڑھ
10۔رانا محمد شاہد۔بورے والا

هر باپ عظیم۔ لائق تعظیم

’اطراف‘ کی خوش قسمتی ہے کہ بہت سے قابل احترام اساتذہ۔ دانشور۔ اہل قلم نقاد اپنی تحریروں سے نوازتے ہیں۔ والد محترم کے حضور خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں منہاج یونیورسٹی کے پیروفیسر اور ممتاز نقاد ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی شمولیت سے ہمارا یہ جائزہ اور زیادہ موقر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صمدانی کی تحریر میں سلاست اور گداز ہوتا ہے۔ قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اسلوب بیاں ایسا کہ یہ ایک عظیم باپ کی کہانی نہیں بلکہ ان دہائیوں کے ہر باپ کی داستان ہے، پڑھئے کہ ایک انتہائی سینئر استاد اپنے والد محترم کو کس عقیدت سے خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔

کوئی مشکل درپیش ہو تو پاپا یاد آتے ہیں

ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی کی پُراثر تحریر

ترمذی شریف کی حدیث ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ’’اللہ کی رضا باپ کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے‘‘۔ ایک اور حدیث جو ترمذی شریف ہی کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اس حدیث کے روی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ’’اللہ تعالیٰ کی اطاعت ’’والد‘‘ کی فرماں برداری میں ہے‘‘۔ ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ ’صحابی رسول حضرت ابو الدروہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ’’باپ‘‘ جنت کا درمیانی دروازہ ہے، اگر تو چاہے تو اس دروازے کی حفاظت کر یا اسے بند کر دے‘۔ اس حدیث مبارکہ سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور یہ جنت ماں کی اطاعت، فرماں برداری اور اس کے رضا میں رکھی گئی ہے تو ’باپ‘ کی خدمت، اطاعت اور فرماں برداری اور اس کی رضا کا صلہ جنت میں داخلے کا باعث اور اس کا درمیانی دروازہ ہے۔ گویا ماں کی خدمت اور اطاعت کے ساتھ ساتھ باپ کی اطاعت و فرماں برداری بھی لازم و ملزوم ہے۔ کوئی اگر یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ماں کی خدمت کر کے جنت میں چلا جائے گا خواہ باپ کی فرماں برداری نہ کرے تو یہ ممکن نہیں۔ دونوں کی خدمت، اطاعت و فرماں برداری لازم و ملزوم ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ارشاد فرماتے ہیں ’تین آدمی ایسے ہیں جن کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی، باپ، مظلوم اور مسافر‘۔ تابعی حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں ’باپ کی دعا اور اللہ عز وجل کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا‘۔ ام المومنین حضرت عائشہ۔ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں

ماں اور باپ دونوں کی فرمانبرداری لازم و ملزوم

حاضر ہوا، اس کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے دریافت کیا کہ تمہارے ساتھ یہ (بزرگ) کون ہیں؟ اس شخص نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ ﷺ یہ میرے والد بزرگوار ہیں۔ یہ سن کر آں حضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’والد کے ادب و احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے ان سے آگے ہرگز نہ چلنا کہ اس سے ان کی بے ادبی ہوگی۔ اپنے والد کے بیٹھنے سے پہلے ہرگز نہ بیٹھنا اور ان کا نام لے کر انہیں نہ بلانا اور ان کی وجہ سے کسی کو گالی نہ دینا کہ جواباً وہ بھی تمہارے والد کو گالی دے‘۔ ان احادیث مبارکہ سے باپ

ہمارے امی ابو رشتوں کو اہمیت دیتے تھے

کی قدر و منزلت واضح ہو جاتی ہے۔ بقول شاعر عابیؔ لکھنوی ؎

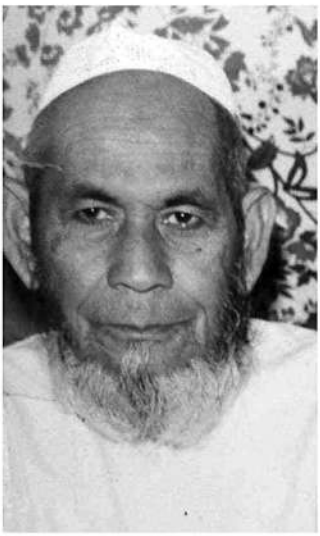

اگر ہو گود ماں کی تو فرشتے کچھ نہیں لکھتے
جو ممتا رُوٹھ جائے تو کنارے پھر نہیں دِکھتے
یتیمی ساتھ لاتی ہے زمانے بھر کے دکھ عابیؔ
سنا ہے باپ زندہ ہو تو کانٹے بھی نہیں چُبھتے

میرے والد محترم کا نام انیس احمد صمدانی تھا۔ ہم انہیں ’پاپا‘ کہا کرتے تھے۔ جب کہ والدہ کو ہمیشہ ’امی‘ کہا۔ باوجود اس کے کہ جس گھر میں ہم سات بہن بھائی یکے بعد دیگر آئے ہم سے پہلے ہمارے والد صاحب کے دو بھائی اور چار بہنیں تھیں اور وہ سب ہمارے والد صاحب کو بھائی صاحب اور ہماری امی کو بھابی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اکثر گھرانوں میں ایسا ہوتا ہے کہ گھر کے دیگر افراد اپنے بڑوں کو جو کہتے ہوں وہی ان کے بچے بھی کہنے لگتے ہیں لیکن ہم نے اپنے والدین کو بھائی صاحب اور بھابی نہیں کہا۔ اس کی بنیادی وجہ جو سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے امی اور ابا رشتوں کو اہمیت دیا کرتے تھے۔ جس سے جو رشتہ ہے اس کا احترام اور اہمیت دینے کا درس ان کا پہلا سبق تھا۔ بعض

احباب اس بات کو اہمیت نہیں دیتے یا انہیں شوق ہوتا ہے کہ بچے انہیں بڑے رشتہ سے مخاطب کریں۔ بظاہر یہ عام اور چھوٹی بات لگتی ہے لیکن انسان جس رشتہ سے پکارا جاتا ہے اس سے اس کے وقار کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ دادا، دادی، نانا اور نانی کے رتبے پر پہنچتے ہیں تو وہ اپنے پوتوں، پوتیوں، نواسے اور نواسیوں سے دادا، دادی، نانا یا نانی کہلوانا پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ جب بچے انہیں ان کے رتبے سے پکارتے ہیں تو ان کی اس پکار سے جو خوشی محسوس ہوتی ہے اس کا کوئی مول نہیں۔ ہمارے والدین نے ہمیشہ رشتوں کو اہمیت دی۔ جس کا جو رشتہ ہے اسے اسی نام سے مخاطب کرنے کی تلقین کی۔ میں بھی اپنے والدین کی طرح رشتوں کی سچائی اور اہمیت کا قائل ہوں میرے بچے مجھے 'ابو' اور اپنی ماں کو 'امی' ہی کہتے ہیں۔ اسی طرح میرے پوتے صائم، ارسل، پوتی حمیہ مجھے 'دادا' اور دادی کو 'دادی' جب کہ میرا نواسہ ارحم اور نواسیاں نیہا اور کشف نانا اور نانی ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ وقت ہوتا ہے جب ان کی اس پکار سے میرے اندر خوشی کی ایسی لہر دوڑتی ہے جو مجھے توانا کر دیتی ہے۔ اردو کے شاعر معراج فیض آبادی نے کہا کہ

میرے بچے مجھے بوڑھا ہونے نہیں دیتے۔ میں کہتا ہوں کہ میرے پوتے، پوتی، نواسہ اور نواسیاں مجھے توانا اور تندرست رکھتے ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر اور ان کی زبان سے دادا اور نانا سنتا ہوں تو میری روح توانا ہو جاتی ہے۔ اپنی اس کیفیت کو اس شعر میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے

پکارتے ہیں جب میرے پوتے، پوتیاں، نواسے اور نواسیاں
آواز سے ان کی عجب خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے میرے بدن میں

میرے والد صاحب نے ایک حویلی نما گھر میں آنکھ کھولی۔ یہ حویلی آزاد منزل کہلاتی تھی۔ حویلی کے مالک میرے والد صاحب کے دادا شیخ محمد ابراہیم آزاد تھے اسی مناسبت سے یہ حویلی آزاد منزل کہلائی۔ آزاد صاحب ہندوستان ریاست بیکانیر کے نامی گرامی وکیل تھے۔ بعد میں بیکانیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔ پیسہ اچھائی اور برائی دونوں کام خوب خوب انجام دیتا ہے۔ والد صاحب کے دادا حضور کی دولت نے ان کی اولاد کو سہل پسند بنا دیا، آٹھ بیٹوں میں سے ایک یا دو ہی اپنے والد کے نقش قدم پر چلے باقیوں نے اپنے والد کی دولت کو ہی اپنا مستقبل سمجھا ان میں سے ایک میرے دادا بھی تھے یعنی میرے والد صاحب کے والد محترم جو خوددار، دادی ان سے بھی زیادہ خوددار تھیں۔ دولت کی چمک کچھ ہی دن میں ماند پڑ گئی۔ دادا نے مختلف کاروبار کیے لیکن کسی میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس صورت حال میں ہمارے والد صاحب کو کم عمری میں ملازمت کرنا پڑی۔ اس زمانے میں وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ منشی ہونا بھی پڑھے لکھے لوگوں کا خاص ذریعہ معاش تھا چنانچہ والد صاحب منشی ہو گئے۔ مالی حالات نے انہیں صرف مڈل تک ہی تعلیم حاصل کرنے دی اور وہ میٹرک بھی نہ کر سکے۔ اس زمانے کا مڈل پاس آج کل کے ایم اے سے بہت آگے تھا۔ ان کی ملازمت کا سلسلہ جو ہندوستان میں شروع ہوا تھا زندگی کے اختتام تک جاری و ساری رہا لیکن انہوں نے اپنی اولاد کو پڑھائی کی نہ صرف ترغیب دی بلکہ پڑھنے کے تمام وسائل مہیا کیے۔ والد صاحب مرحوم کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرے۔

میری امی اور ابا 15 مارچ 1947ء بروز ہفتہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے، گویا قیام پاکستان سے صرف چھ ماہ قبل۔ والد صاحب ملازمت کی وجہ سے راجستھان کے شہر گنگا نگر میں رہا کرتے تھے، جب کہ دیگر اہل خانہ بیکانیر میں رہتے تھے۔ میرے والدین کی شادی کو چھ ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ پاکستان

آگرہ تاج کالونی میں 12 افراد پر مشتمل کنبے نے کئی سال گزارے

کے قیام کا اعلان ہو گیا۔ ہندوستان سے مسلمان ہجرت کر کے پاکستانی علاقوں میں آنے لگے۔ میرے والد صاحب ہندوستان کے شہر گنگا نگر کی عدالت میں پیشکار تھے انہوں نے وہاں سے پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا، ان کے والد اور بہن بھائیوں نے بعد میں ہجرت کی اور کراچی منتقل ہوئے۔ پاپا مستقل مزاج تھے۔ 1947 میں ہندوستان سے کراچی ہجرت کی، ابتداء میں ایک پرائیویٹ کمپنی 'انٹرنیشنل فارورڈنگ' میں ملازمت کی جب یہ کمپنی بند ہو گئی تو ایک اور کمپنی میں ملازمت مل گئی جس کے مالکان پارسی تھے۔ تین بھائیوں کی یہ کمپنی 'ایس پی گاندھی اینڈ کمپنی' کہلاتی تھی، تین بھائیوں میں مینو، بہرام اور خورشید تھے۔ پاپا اسی کمپنی سے ریٹائر ہوئے۔ پرائیویٹ کمپنی میں کام کرنے والے بہت جلد دل برداشتہ ہو جاتے ہیں اور ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری جگہ ملازمت کرتے ہیں لیکن والد صاحب میں حوصلہ، قوت برداشت، درگزر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اپنی زندگی کا طویل عرصہ ایک ہی کمپنی میں ملازمت کرتے ہوئے گزارا۔

پاپا رحم دل اور دوسروں کی پریشانیوں اور مشکلات کو حل کرنے میں ہر وقت تیار رہا کرتے۔ ہم کراچی کی ایک کچی بستی آگرہ تاج کالونی میں رہا کرتے تھے۔ کچھ کچا اور کچھ پکا لیکن کشادہ مکان تھا، جس میں ہمارا خاندان یعنی امی، ابا، سات بہن بھائیوں کے علاوہ ہمارے دو چچا (جلیس احمد اور مغیث احمد) اور دو پھوپھیاں (مبینہ خاتون اور تسلیمہ خاتون) بھی رہا کرتے تھے۔ کمانے والے ہمارے والد صاحب ہی تھے، ہم سب بہن بھائی چھوٹے اور پڑھ رہے تھے، شاید ہمارے چچا بھی کچھ کرنے لگے تھے، صحیح یاد نہیں، گزر بسر اچھے طریقے سے ہو رہا تھا کیوں کہ والد صاحب اور والدہ دونوں ہی فضول خرچ نہیں تھے، قناعت پسند تھے، تھوڑے کو بہت جانتے تھے، ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں کو ہی دیکھا کرتے تھے، ہم نے انہیں کبھی اپنے سے اوپر والوں کے بارے میں بات کرتے نہیں سنا۔ ہمارے خاندان کے کئی احباب کو جب رہائش کی مشکلات کا سامنا ہوا تو والد صاحب نے بے چوں و چرا انہیں اپنے گھر میں جگہ دی۔ ان میں لئیق احمد مرحوم جو ہماری امی کے رشتہ کے بھائی ہوتے تھے۔ وہ نامساعد حالات سے دوچار ہوئے ملازمت جاتی رہی لیکن خوددار تھے، حالات کا مقابلہ کرتے رہے، اتنی مشکل آن پڑی کہ کرائے کے گھر میں رہنا بھی مشکل ہو گیا، مجبوراً ہمارے والد صاحب سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا انہوں نے بے چوں و چرا اس کرایہ کا مکان چھوڑ کر اپنے گھر منتقل ہونے کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ انہیں بمعہ ساز و سامان اپنے گھر لے آئے۔ ہمارے والد صاحب اللہ مغفرت کرے کسی بھی اپنے یا پرائے کا دکھ تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا اس کی مدد کرنے میں کسی سے مشورہ کرنا تو دور کی بات دیر نہیں کرتے تھے۔ یہ پہلا واقعہ نہ تھا وہ ایسا پہلے بھی کئی بار کر چکے تھے۔ میرے والد صاحب کے ماموں جناب غلام مصطفیٰ سبزواری مرحوم کے سالے ضمیر حسن سبزواری مالی طور پر پریشانی کا شکار ہوئے اور ان کے ساتھ بھی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کرائے کے مکان میں رہنا مشکل ہو گیا اس وقت بھی ہمارے والد صاحب نے انہیں اپنے گھر میں پناہ دی، ہمارے گھر کا صحن کافی بڑا تھا، کمرے تو شاید ایک یا دو ہی تھے، آنگن میں جھونپڑی ڈالی اور ہنسی خوشی کافی عرصہ رہتے رہے۔

خاندانوں کو اپنے گھر پناہ دینے کے علاوہ انفرادی طور پر مختلف شخصیات کو دوران تعلیم اپنے گھر رکھنا، ان کے کھانے پینے کا اہتمام کرنا بھی ہمارے والد صاحب مرحوم کی زندگی کا حصہ تھا۔ ہمارے خاندان کے وہ احباب جو اندرون ملک سے کراچی میں حصول تعلیم کے لیے آئے اکثر کو ہمارے والد صاحب نے اپنے گھر پناہ دی اور جب تک انہوں نے اپنی تعلیم مکمل نہ کر لی، ان کی تمام تر سہولتوں کا خیال رکھا، مجھے ان میں سے بعض کے بارے میں علم ہے، ایک شیخ طاہر حسن جو میرے والد صاحب کے چچا ''مشفق احمد مرحوم'' کے متبنیٰ بیٹے تھے، دوسرے شاہد احمد صدیقی واجد احمد مرحوم کے صاحبزادے تھے۔

میری یاد داشت میں ہے کہ شکیل احمد سبزواری جو میرے ماموں زاد بھائی تھے جب پنجاب سے کراچی آئے تو ہمارے ہی گھر قیام کیا۔ صوفی محمد احمد مرحوم بھی بہت عرصہ ہمارے ہی گھر میں رہے۔ ہم نے کسی لمحے اپنے والد صاحب کی زبان سے یہ بات نہیں سنی کہ انہوں نے کسی کے ساتھ کوئی احسان کیا، گویا وہ نیکی کر کے بھول جانے والوں میں سے تھے۔ وہ اس بات سے

بخوبی آگاہ تھے کہ یہی حکمِ خداوندی بھی ہے۔سورۃ النحل آیت نمبر 90، ارشاد باری تعالیٰ ہے’’ خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے ‘‘۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے گھر کی قریب ترین مسجد جس میں پاپا نماز پڑھنے جایا کرتے اور اس کی انتظامی امور میں بھی شریک رہے کہ پیش امام طویل عرصے تک ہمارے گھر ایک وقت کھانا کھانے آیا کرتے تھے۔

ہمارے خاندان کے بزرگ فقہ حنفی سے تعلق رکھتے تھے، نذر و نیاز، محفل میلاد اور درود وسلام کے قائل تھے۔ میرے والد صاحب بھی انہی نظریات پر عمل پیرا رہے۔ہم نے انہیں جوانی میں بھی نماز سے غافل نہیں دیکھا، ہمارے گھر کا ماحول مذہبی تھا، گھر میں نعتِ رسول مقبول ﷺ اور میلاد کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ہر اسلامی مہینے میں اس کے تقدس کی مناسبت سے پروگراموں کا اہتمام کرتے جس میں ہمارے قریبی عزیز رشتہ دار بھرپور شرکت کیا کرتے۔ ماہِ شعبان کی پندرھویں شب خصوصی عبادت کا اہتمام ہوا کرتا، پاپا اس دن ہمیں قبرستان جانے کی تاکید کیا کرتیں، شروع میں ہم شیر شاہ کے قبرستان جایا کرتے تھے جہاں پر میرے دادا اور دیگر احباب دفن ہیں، جب ہم دستگیر منتقل ہو گئے تو یٰسین آباد کے قبرستان جانا ہمارا معمول بن گیا، اب میرے ابا اور امی اِسی قبرستان میں مدفن ہیں۔ ماہِ رمضان کا پورا مہینہ موسم بہار کی طرح ہوا کرتا تھا۔ عبادت کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کا خصوصی اہتمام ہوتا۔ پاپا کھانے کے شوقین تھے، عام دنوں میں بھی اور ماہ رمضان میں خاص طور پر دسترخوان بے شمار قسم کے کھانوں سے بھرا ہوتا۔ پاپا کے اس دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد یہ سلسلہ کم ہوا پھر ختم ہی ہوگیا۔

ہم نے کبھی اِمی اور ابا کے درمیان لڑائی جھگڑا ہوتے نہیں دیکھا، حتیٰ کہ دونوں کو کبھی اونچی آواز سے بولتے نہیں سنا۔اس میں ہمارے پاپا کا بھی کمال تھا۔ وہ انتہائی صلح جو قسم کے انسان تھے، پان دان ہمارے گھر کی روایت تھی، پاپا اور امی دونوں ہی پان کھایا کرتے، پاپا اپنے ساتھ پان کی ڈبیا اور بٹوا رکھا کرتے تھے، امی کی دیگر ذمہ داریوں میں پان بنا کر دینا بھی تھا، مجھے یاد ہے کہ پاپا شروع میں سگریٹ بھی پیا کرتے تھے، جب پان کھانا شروع کیا تو سگریٹ پینا چھوڑ دی۔ میرے سب ہی بہن بھائیوں نے اپنے امی ابا کی اس روایت کو جاری رکھا ہوا ہے لیکن مَیں ان دونوں ہی چیزوں یعنی پان اور سگریٹ سے ہمیشہ بچا رہا اور اب بھی بچا ہوا ہوں۔ ہمارے گھر کا دستر خوان ہمیشہ دراز رہا جو ہمیشہ فرشی ہوا کرتا تھا، ہم نے ہمیشہ نیچے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ طویل عرصہ رہنے والے مہمان بھی ہمارے گھر میں اکثر رہے۔ دراصل ہمارے ابا جان انتہائی نرم دل، مہمان نواز اور کسی کی دکھ تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے، جب بھی کسی رشتہ دار نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تو وہ فوراً اپنی خدمات حاضر کردیا کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ شخص ہمارے ہاں مستقل مہمان ہوجایا کرتا۔ ایسی متعدد مثالیں ہیں ۔ حتیٰ کہ پوری پوری فیملی کو ہمارے ابا جان اور امی نے اپنے گھر میں پناہ دی وہ کافی عرصہ تک ہمارے گھر میں رہتے رہے۔ گویا ہمارا گھر مہمان سرائے بھی تھا، ہم میں سے کسی کی یہ مجال نہیں تھی کہ ان کے فیصلے پر اُف بھی کرتے بلکہ وہ وقت بہت ہی ہنسی خوشی گزرتا۔

جب ہم سب بھائی بڑے ہوگئے ، کسی حد تک مالی طور پر آسودہ حال بھی، باہمی مشورہ سے کراچی کے کسی اچھے علاقے میں منتقل ہونے کی منصوبہ بندی کی گئی، اس منصوبہ پر عمل کی صورت ایک ہی تھی کہ اس مکان کو جس میں ہم گزشتہ کئی دہائیوں سے رہ رہے تھے، جسے پاپا نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے رفتہ رفتہ تعمیر کیا تھا سیل آوٹ کردیا جائے۔ پاپا کے لیے یہ ایک تکلیف دہ فیصلہ تھا۔ امی بھی پاپا کے ساتھ تھیں، شروع میں وہ تیار نہ ہوئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی اولاد کی یہی خواہش ہے تو وہ اپنی اولاد کی خواہش کے آگے دست بردار ہو گئے۔ انہیں آمادہ کرنے میں ہماری امی نے اہم کردار ادا کیا، مغیث چچا بھی پاپا کو ذہنی طور پر آمادہ کرنے میں پیش پیش تھے ۔ نومبر 1986 میں ہم دستگیر سوسائٹی کی آبادی آصف نگر میں منتقل ہوگئے۔ یہ 120 گز پر بنا ہوا مکان تھا، گنجائش کم تھی، مکین زیادہ تھے، لیکن اس وقت دلوں میں کشادگی تھی ، رفتہ رفتہ مکان میں بھی بڑھاوا آتا گیا یعنی 120 گز کا مکان جو زمینی منزل پر مشتمل تھا گراؤنڈ پلس ٹو ہوگیا۔ ستمبر 1997 میں ایک ایسا سانحہ رونما ہوا جس نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ ہمارے والد صاحب کا صدمۂ ارتحال تھا۔ پاپا انجائنا کے بھی مریض تھے، شوگر بھی تھی لیکن انہیں پیشاب میں تکلیف کے باعث ابن سینا اسپتال، گلشن اقبال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں پر ان کا پراسٹریٹ گلینڈ کا آپریشن ہوا، نہیں معلوم کیا پیچیدگی ہوئی دوسرے دن ہی طبیعت بگڑ گئی، 5 ستمبر، بروز جمعہ، صبح صادق کے وقت اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ انا اللہ وانا علیہ راجعون۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

پاپا کا دسترخوان ہمیشہ بالخصوص رمضان میں بہت وسیع ہوتا

باغباں نے اپنے گلشن کے ایک ایک پودے کی دل وجان سے آبیاری کی تھی، اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا، دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا تھا، اس کی محنت کا ثمر تھا کہ باغباں کا لگایا ہوا ہر ہر پودہ تناور درخت بن چکا تھا، ہر درخت چھاؤں دینے کے قابل ہو چکا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ باغباں کو اپنے درختوں کی چھاؤں سے راحت میسر آتی، وہ سکون و آرام سے زندگی بسر کرتا، لیکن مالک کائنات نے قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ باغباں کا کام پورا ہو چکا تھا، اب اُسے اُس دنیا سے جانا تھا جس کی تیاری بھی اس نے کر لی تھی۔ اس نے خاموشی سے اللہ کے حکم کو لبیک کہا اور اپنے ہرے بھرے گلشن کو الوداع کہا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی دنیا وہاں بسالی جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ پرنم آنکھوں، دکھے دل کے ساتھ پاپا کے بیٹوں، پوتوں، نواسوں اور دیگر احباب نے انہیں آخری آرام گاہ پہنچایا، ہم بھائیوں نے لرزتے ہاتھوں اور پرنم آنکھوں پاپا کے جسد خاکی کو لحد میں اتارا اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہا۔

آج میں از خود دادا اور نانا بن چکا ہوں لیکن جب کبھی کوئی مشکل یا پریشانی آتی ہے والد صاحب کی یاد شدت سے آجاتی ہے۔ وہ میرا آئیڈیل تھے ۔ میں نے اپنی زندگی ان کے بتائے ہوئے اور سکھائے ہوئے اصولوں کے مطابق گزارنے کی کوشش کی ہے۔ پاپا کی جائیداد یعنی ہمارے آبائی گھر کی شرعی تقسیم کا وقت آیا۔ ہم سب بہن بھائی مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے تاکہ اپنا شرعی حصہ حاصل کرسکیں۔ مکان کی فروخت کے بعد شرعی تقسیم کی یہ صورت نکالی گئی کہ یہ مکان قانونی طور پر اب میرے نام ہوجائے اور پھر اس کی فروخت عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ رجسٹرار کے سامنے میرے تمام بہن بھائیوں نے اپنا حق میرے نام منتقل کرنے کا اقرار کیا۔ یہ مجھ پر ان کا اعتماد، بھروسہ تھا اور مجھ پر بھاری ذمہ داری بھی، اللہ تعالیٰ مجھے اس ذمہ داری کو ایمان داری اور سچائی کے ساتھ سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ میری ہرگز ہرگز یہ خواہش نہیں تھی کہ جائیداد کی شرعی تقسیم اس طرح ہو لیکن قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے یہی صورت شاید آسان تھی۔ جتنے وقت میں رجسٹرار کے آفس میں رہا پاپا کے متعلق سوچتا رہا ان کی زندگی جو ایک کھلی کتاب تھی میری نظروں کے سامنے فلم کی طرح چلتی رہی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو سب کچھ دیا دنیا سے رخصت ہوکر بھی اپنی اولاد کو لاکھوں دے گئے۔ بے شک باپ ایک عظیم ہستی کا نام ہے۔ پاپا آپ کو ہمارا سلام، پروردگار عالم ہمارے والد صاحب کی مغفرت فرمانا، ان کے چھوٹے بڑے گناہوں کو معاف فرمانا، انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمانا۔ آمین۔ آخر میں اپنی بات رئیس فروغ کے اس شعر پر کرتا ہوں

میرا بھی ایک باپ تھا اچھا سا ایک باپ
وہ جس جگہ پہنچ کے مرا تھا وہیں ہوں میں

❀❀❀

”پروفیسر شاداب احمد صدیقی حیدر آباد سے ماہنامہ 'اطراف' کے قلمی سرپرست ہیں۔ 'جنگ'، ایکسپریس میں بھی مضمون لکھتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے بھی وابستہ ہیں۔ بہت ہی والہانہ انداز میں اپنے عظیم والد کو خراج عقیدت پیش کررہے ہیں۔ اپنی کامیابیوں کو ان کی دعاؤں کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں۔“

میرے والد نے کبھی کوئی فیصلہ مجھ پر مسلط نہیں کیا

☆ پروفیسر شاداب احمد صدیقی، حیدر آباد

ہمیشہ کی طرح محمود شام صاحب نے انتہائی خوبصورت موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے درخواست کی ہے۔"ہر باپ عظیم ہے...... لائق تعظیم ہے"۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ میں اس مقدس رشتے کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اپنے دلی جذبات کا اظہار قلمبند کرتا ہوں۔ قلم تھام کر جب اپنے والد کو تصور میں لا کر ماضی کے جھروکوں میں پہنچا تو آنکھیں بچپن کی حسین یادوں میں کھو گئیں۔ والد کو جب محسوس کیا تو لگا والد صاحب میرے سامنے کھڑے میری کامیابی پر دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا کر مجھے شاباش دے رہے ہیں۔ یکدم میرے قلم نے کاغذ پر گرفت پکڑی اور الفاظ قلمبند کرنے لگا۔ والد کی خدمات اور اہمیت کو بیان کرنا ایسا ہی ہے جیسے دریا کو کوزے میں بند کرنا۔ زندگی کے کسی بھی دور میں بچپن کی نٹ کھٹ یادیں جب سر اٹھائیں تو چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ضرور لے آتی ہیں۔ میرا بچپن بھی اسی طرح کی شوخ و چنچل اور معصوم یادوں سے بھرا پڑا ہے والد یا باپ اس لفظ کے آتے ہی ذہن کے کتنے دریچے کھل گئے۔ اس لفظ کو اک لفظ یا جملے میں کیسے بیان کیا جائے۔ میرے نزدیک باپ کی قدر و قیمت کسی دوسرے شخص سے کہیں زیادہ ہے کیوں کہ میرا باپ اس دنیا میں حیات نہیں۔ باپ کیا ہوتا ہے کیسا ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے شاید مجھ سے یا مجھ جیسے لوگوں سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا اور نہ سمجھ سکتا ہے جن کے والد محترم کا وصال ہو چلا ہے۔ باپ وہ ہستی ہے جو اپنے اہل خانہ کی کفالت کے لے دن رات جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ نا اس کو اپنے آرام کی پرواہ ہوتی ہے اور نا ہی اپنے صحت کی۔ وہ اپنے دن رات صرف اس جہد میں صرف کرتا ہے کہ کچھ اور محنت کرلوں تو اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ کرلوں۔

باپ دنیا کی وہ عظیم ہستی ہے۔ جو اپنے بچوں کی پرورش کے لئے اپنی جان تک لڑا دیتا ہے۔

والد ایک مقدس محافظ ہے۔ جو ساری زندگی خاندان کی نگرانی کرتا ہے۔ باپ ہی ہوتا ہے جو اپنے اہل و عیال اور اولاد کو پالنے کے لیے خود بھوکا رہ کر یا روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتا ہے۔ باپ ایک سائبان شفقت ہے جس کے سائے میں اولاد پروان چڑھتی ہے۔ باپ کے ہوتے ہوئے اولاد خود کو محفوظ سمجھتی ہے۔ باپ کے ہوتے ہوئے بیٹے بے فکری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جیسے ہی باپ کا سایہ عافیت سر سے اٹھتا ہے تو فوراً ہی اولاد کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے سر پر کتنا بوجھ آن پڑا ہے۔ باپ دنیا میں اللہ رب العزت کی عظیم نعمت ہے۔ ہر والد کا یہی خواب ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ معیار زندگی فراہم کرے تا کہ وہ معاشرے میں باعزت زندگی بسر کرسکیں اور معاشرتی ترقی میں بہتر طور پر اپنا کردار ادا کرسکیں۔ شریعت اسلامی میں والد کو بڑا رتبہ حاصل ہے جب کہ احادیث مبارکہ میں والد کی ناراضی کو اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اُس کی خوش نُودی کو ربّ تعالیٰ کی خوشنودی قرار دیا گیا ہے۔ اولاد کی بہترین تعلیم و تربیت کی غرض سے والد کا کردار ذراسخت ہوتا ہے، جب کہ اس کے برعکس ماں کی حد سے زیادہ نرمی اور لاڈ پیار سے اولاد نڈر اور بے باک ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی تعلیم، تربیت اور کردار پر بُرا اثر پڑتا ہے، جب کہ والد کی سختی، نگہہ داشت اور

عید آتی ہے تو والد صاحب کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے

تیزی سے اولاد کو من مانی کرنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اولاد والد سے زیادہ ماں کے قریب ہوتی ہے، لیکن اولاد یہ نہیں جانتی کہ ان کے والد کو گھر چلانے اور تعلیم و تربیت کا مناسب اہتمام کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ وہ والد ہی ہوتا ہے جو اپنے اہل و عیال کو پالنے کے لیے خود بھوکا رہ کر یا روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرتا ہے، لیکن پوری کوشش کرتا ہے کہ اس کے بچوں کو اچھا کھانا، پینا، تعلیم اور تربیت میّسر ہو۔ والد چراغ سحری ہوتا ہے اور وہ بڑھاپے کی حدود تک پہنچ کر اپنی طبعی زندگی گزار چکا ہوتا ہے اور اس کی زندگی بس اب اور جب پر ہی ہوتی ہے۔ جس طرح چراغ سحری تمام رات جل کر اپنی روشنی سے ہماری تاریک رات کو منور کرتا رہا اور اب جبکہ صبح قریب ہے، لیکن چراغ کا تیل خاتمے کی جانب رواں دواں ہوتا ہے اور آپ اسے نہ بھی بجھائیں تو وہ خود چند لمحوں بعد دو چار مرتبہ بھڑک کر بجھ جاتا ہے اور جب چراغ میں دم نہیں رہتا اور روشنی کو تیل کی سپلائی بند ہو جاتی ہے تو معمولی سی پھونک بھی اس روشنی کو گل کرنے کے لئے کافی ثابت ہوتی ہے۔ ابا، ابّو، بابا کتنے پیارے الفاظ ہیں۔ ایک باپ، جو اولاد کو دنیا میں لانے کا سبب بنتا ہے، پھر ساری زندگی اس کے لیے تگ و دو میں گزار کر اور اس کے مستقبل کو سنوارنے، بہتر بنانے کے لیے زمانے کی سختیاں، صعوبتیں برداشت کرتے کرتے بالآخر قبر میں جا سوتا ہے۔ بلاشبہ، اللہ تعالیٰ نے والدین کا رتبہ عالی شان بنایا ہے۔ بحیثیت

مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ اگر ماں کے قدموں تلے جنّت ہے تو باپ جنّت کا دروازہ ہے کہ جو ساری زندگی خود مصائب و تکالیف سے گزر کر اپنی اولاد کی پرورش کرتا، اسے پالتا پوستا ہے تو رب کریم نے اُس کا مقام بھی بہت ارفع رکھا ہے۔ اُس کے سامنے اُف تک نہ کرنے کا حکم ہے۔ "ماں کے قدموں تلے تو جنّت ہوتی ہے، لیکن باپ کے قدموں میں صرف پھٹا ہوا جوتا ہوتا ہے، جو اپنی اولاد کی خاطر رزق کمانے میں گھس جاتا ہے۔

میرے والد نے کبھی بھی کوئی فیصلہ مجھ پر مسلط نہیں کیا، وہ کہتے تھے آپ اپنے مستقبل کا خود تعین کریں۔ اور انہی کی دی ہوئی خود اعتمادی کی وجہ سے مجھے اپنی مرضی کی تعلیم اور روزگار کے مواقع ملے اور میں آسانی سے اپنی منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ میں یہاں ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ والدین کو اپنی اولاد پر اپنے فیصلے مسلط نہیں کرنا چاہئیں۔ والدین اپنی اولاد کی مرضی کی تعلیم اور ان کے پروفیشن حاصل کرنے میں رہنمائی کریں۔ والدین چاہتے ہیں کہ بچے ہماری مرضی سے تعلیم حاصل کریں زیادہ تر والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ اور دیگر ان کی پسند کے شعبوں کا انتخاب کریں مگر والدین کو اپنی اولاد کی ذہنی سطح اور صلاحیتوں کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ الحمد للہ میں نے اپنی زندگی کے فیصلے خود کیے اور اپنی پسند کی تعلیم اور روزگار حاصل کیا۔ میرے والد نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ مجھے ٹیچنگ کا شوق تھا اور الحمد للہ آج میں کامیاب انسان اور پروفیسر ہوں۔ الحمد للہ میں نے سات ماسٹرز مختلف مضامین میں پاس کیے ہیں۔ حیدر آباد میں میں واحد ہوں جس کو یہ اعزاز حاصل ہے۔ میرے والد انتہائی سادہ مزاج، خوش اخلاق اور فرینڈلی تھے۔ انہوں نے مجھے کبھی بھی کسی قسم کے ذہنی دباؤ میں مبتلا نہیں کیا۔ میرے والد کو کبھی غصہ نہیں آتا ہے۔ افسوس میرے والد میری کامیابی دیکھے بغیر دنیا سے جلدی چلے گئے۔ والد صاحب وقت کے بہت پابند تھے ہر کام وقت پر

کرنے کے عادی تھے اور بہت ذمہ دار انسان تھے۔ یہ عادتیں مجھ میں بھی ہیں۔والد بہت حساس تھے۔غریبوں کی امداد خاموشی سے کرتے تھے۔نماز اور قرآن پاک کی تلاوت باقاعدگی سے کرتے تھے۔ پورا محلہ میرے والد صاحب کی بہت عزت کرتا تھا اور آج تک محلہ والے میرے والد کو یاد کرتے ہیں۔میرے والد میرے آئیڈیل ہیں۔

والد کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔والدین اپنی اولاد سے شفقت اور محبت سے پیش آئیں ان کی ایسی اخلاقی تربیت کریں کہ وہ آپ کا کہنا خود بخود مانیں۔ زیادہ غصہ اور ڈانٹ ڈپٹ سے بچہ باغی بدتمیز ہوجاتا ہے۔بچوں کے پہلے معلم والدین ہیں۔

والد ایک شجر سایہ دار کی مانند ہوتا ہے جو زمانے کی گرم ہواؤں کو خود سہتا ہے اور اولاد کو صرف پھل اور سایہ مہیا کرتا ہے۔جس طرح سورج حدت کا منبع ہوتا ہے مگر اس کے نہ ہونے سے ساری دنیا اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح والد کا پیار بھی اس کی ڈانٹ ڈپٹ اور سختی میں چھپا ہوتا ہے۔ ایثار و قربانی کا یہ پیکر مجسم اولاد کی بہترین تربیت اور روشن مستقبل کے لیے ہمیشہ سرپا دعا رہتا ہے جس کی دعا کو اللہ تعالیٰ کبھی رد نہیں فرماتا۔

جن کے والد حیات ہیں،ان سے میری یہ فریاد ہے کہ وہ خوش دلی کے ساتھ اپنے والد کی خدمت کریں اور ان کا ادب و احترام کر کے جنت کے حقدار بنیں۔

والد سے ہمیشہ محبت اور نرمی کا سلوک کریں۔ان کی رائے کو ترجیح دیں۔یعنی ان کی رائے کو مقدم کر کے اسے تسلیم کریں۔اور اس کی بجا آوری کریں۔خاص طور پر جب والد بڑھاپے میں پہنچ جائیں تو ان کے جذبات اور احساسات کا خیال کریں۔ان سے نرمی اور محبت سے پیش آئیں۔اپنی مصروفیات میں کچھ وقت ان کے لئے مخصوص کردیں۔ان کی بھرپور خدمت کریں۔اور ان کی وفات کے بعد ان کے ایصال ثواب کیلئے وقتاً فوقتاً دعائے مغفرت و رحمت کا اہتمام کرتے رہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں والد کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

مجھ کو چھاؤں میں رکھا اور خود جلتا رہا دھوپ میں
میں نے دیکھا اک فرشتہ باپ کے روپ میں

وقت گزر جائے تو واپس نہیں آتا صرف یادیں رہ جاتی ہیں اسی لئے ہمیں وقت کی قدر کرتے ہوئے ان لمحات کو خوبصورت بنالینا چاہیے۔اس طرح وقت امر ہوجاتا ہے۔جب عید آتی ہے تو والد صاحب کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے کیونکہ میں بچپن میں ان کے ساتھ عید کی نماز ادا کرنے عیدگاہ جاتا تھا اور واپسی پر عیدی ملتی تھی۔

ہر باپ عظیم۔لائق تعظیم

عاصم متین خان رہتے نیویارک میں ہیں لیکن دل پاک سرزمین میں اٹکا رہتا ہے۔'اطراف' کے لیے خاص طور پر فکر مند ہیں۔ہماری تصنیفات کے لیے بھی وہ خصوصی پیشکش کرتے ہیں۔ہم شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے والد محترم کی یاد میں ایک مختصر سی تحریر بھیجی ہے۔پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

والد محترم عبدالمتین خان نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا

بھارت میں اپنی چھوڑی ہوئی زمینوں کا کلیم داخل نہیں کیا

تحریر: عاصم متین خان، نیویارک

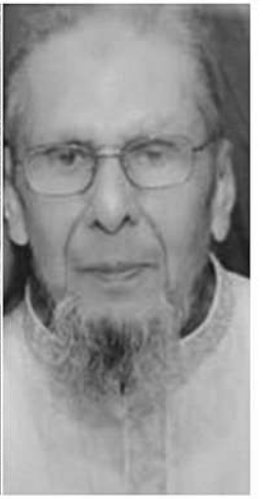

میرے والد مرحوم عبدالمتین خان صاحب نے علیگڑھ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور پاکستان بننے کے بعد ہجرت کی۔طالب علمی کے زمانے میں والد صاحب نے علیگڑھ یونیورسٹی سے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور علی گڑھ یونیورسٹی میں قائداعظم کے تمام جلسوں میں اور میٹنگوں میں شرکت کی۔بھارت میں اپنی چھوڑی ہوئی زمینوں کا پاکستان میں کبھی کلیم نہیں کیا۔محنت اور ایمانداری سے ہم سب بہن بھائیوں کو پڑھایا۔مجھے پڑھنے کے لئے امریکہ بھیج دیا تاہم میں پاکستان میں مارشل لاء اور دیگر سیاسی افراتفری کے بعد واپس پاکستان نہ جاسکا اور یہیں مقیم ہوگیا۔1994 میں پوری فیملی امریکہ آگئی اور والد صاحب نے اپنا زیادہ تر وقت مسجد میں پانچ وقت حاضری کے ساتھ گزارا۔اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہ کرنے والے میرے والد 2 اپریل 2021 کو ہمیں چھوڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ جنت میں درجات بلند فرمائے،آمین!

ہر باپ عظیم۔ لائق تعظیم

فرزین لہرا کراچی میں رہتی ہیں۔ کئی کتابوں کی مصنفہ۔ بچوں بڑوں دونوں کے لیے لکھتی ہیں۔ اپنے مخصوص اسلوب میں انہوں نے اپنے عظیم والد کی محبت کا ایک واقعہ نذر قارئین 'اطراف' کیا ہے۔

مجھے فخر ہے کہ میں رشید جمبو کی بیٹی ہوں

میری بیٹی کا فون یہاں رہ گیا ہے

سر۔ یہ رہا آپ کی بیٹی کا فون

اللہ میرے والد صاحب کی عمر دراز کرے۔ کسی کا محتاج نہ کرے

فرزین لہرا

اگر فون نہیں ملا تو صبح ایسا ہی لے کر دونگا لیکن آنسو نہیں چاہئے مجھے۔۔" میں سوں سوں کرتی سن رہی تھی۔ جلد ہی ہم وہاں پہنچ گئے۔ صرف اسٹاف ہی رہ گیا تھا جو جانے کی تیاری میں تھا۔

ڈیڈی نے بڑے تحمل سے کہا، "میری بیٹی کا فون یہاں رہ گیا ہے۔ میں اسے لینے آیا ہوں"

مینیجر سمیت سارے اسٹاف نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

اب ڈیڈی نے دبنگ انداز میں کہا، "تھوڑی دیر میں ٹیم یہاں پہنچ ہی جائے گی۔ نتائج کے ذمہ دار آپ ہونگے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے لے کر گاڑی میں آبیٹھے۔

ابھی ڈیڈی کسی آفیسر کو فون کرنے ہی لگے تھے کہ ایک بندہ بھاگتا ہوا گاڑی تک آیا، "سر! یہ رہا آپ کی بیٹی کا فون۔۔ پلیز مجھے معاف کردیں۔ میری نوکری نہ چلی جائے۔۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے سی پی ایل سی سے فون آنے لگا، ڈیڈی نے فون اٹھا کر کہا، "جی مل گیا ہے فون۔۔ یہیں پارکنگ میں گرا ہوا تھا۔"

یہ کہہ کر ڈیڈی نے فون رکھا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس بندے کی آنکھوں میں تشکر اور سکون اتر آیا تھا۔

گھر آ کر ایک لیکچر اور ملا کہ چیزوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔ آنی جانی ہے۔ مجھے سب بتایا کرو۔ وغیرہ وغیرہ

جب میاں اور بھائی کو پتہ چلا کہ فون مل گیا ہے تو ان کی شکلوں پر بے یقینی مزاد ے گئی۔

آج میری کتاب اپنے ہاتھوں میں لئے اتنے پیارے لگے کہ بس آپ سب سے شیئر کرنے کا دل چاہا۔

مجھے فخر ہے کہ میں رشید جمبو کی بیٹی ہوں۔

اللہ میرے والد صاحب کی عمر دراز کرے اور انہیں کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔ آمین۔

'اطراف' کی درخواست پر اُردو اور بلوچی کے سینئر مقبول اور متحرک ادیب پناہ بلوچ نے اپنے عظیم والد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جو اپنی جگہ ایک ادبی شہ پارہ ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم پورے پاکستان میں اپنے اپنے محترم اور معظم والد کو خراج پیش کرنے کے لیے ایک تحریک چلا رہے ہیں۔

بابا جانی سے جدائی کے دو سال

تحریر: پناہ بلوچ

ماں مرے تے ماپے
مکدے پیئو مرے گھر
ویلا
شالا مرن نہ ویر کسے دے
اجڑ جاندا اے میلا
میاں محمد بخش

اولاد کے لئے باپ شفقت، سایہ، چاہت اور تحفظ کی سب سے بڑی علامت ہے۔ دنیا کے سب زبانوں کے الفاظ اگر اکھٹے کر دیئے جائیں تب بھی باپ کی ہستی کو بیان کرنے اور اس روپ کی مکمل عکاسی نہیں کر سکتے ہیں۔ کل کائنات کو چند الفاظ میں سمیٹنا کسی کے بس کی بات نہیں، باپ کی محبت، احساس، احسان، شفقت، تحفظ، چاہت کو کس طرح سمیٹا جا سکتا ہے۔ باپ کے سینے میں اولاد کے لئے موجزن شفقتِ پدرانہ، اولاد کے بہتر مستقبل کے لئے عمر بھر کی ریاضت، ان کی تربیت اور بحیثیت باپ اولاد کی تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی سعی۔ یہ سب عوامل اکھٹے ہوں تو باپ کا مثالی کردار جھلک کر سامنے آجاتا ہے۔

باپ کے روپ میں انسان جو اپنی سانس تک اولاد کے سانسوں میں شامل کر کے اس کو زندگی کا حوصلہ بخشتا ہے۔ اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو کڑی دھوپ، لُو، جھکڑ، بارش، شدید سردی سمیت ہر موسم میں کھیتوں میں کام کرنے والا کسان، گلیوں میں مختلف چیزیں بیچنے والا چھابڑی فروش، بلند و بالا عمارتوں کے تعمیر میں پسینہ بہانے والا جفاکش مزدور، مٹی کے برتن بنانے والا کمہار، جوتے بنانے موچی سمیت انگنت کام

26 اگست 2021 کے بعد میں دنیا کا کمزور ترین انسان ہو گیا ہوں

کرنے والی یہ ہستیاں ملازم یا مزدور نہیں بلکہ زندگی کے مختلف شعبہ جات میں خدمات سرانجام دینے والے باپ ہیں۔ جو سارا سارا دن، ساری ساری راتیں، سردی، گرمی، نامساعد حالات، غیر متوقع موسم، انگنت تکالیف، بے انتہا دکھ اور کثیر الجہتی پریشانیوں کے باوجود باپ نامی یہ ہستی کھیتوں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں، دفتروں میں باتیں سنتے ہیں، طعنے سنتے ہیں اور دم دم جیتے ہیں اور دم دم مرتے ہیں مگر وہ مسلسل کام جاری رکھتے ہیں تاکہ وہ اپنی اولاد ضرویات کا خیال رکھ سکیں اور ان کے تابناک مستقبل کو یقینی بنا سکیں۔

والد کے اس دنیا سے کوچ کر جانے سے اولاد کا بہترین دوست باقی نہیں رہتا۔ اولاد ناکامی اور کامیابی میں باپ کی محبت بھری ہمت بڑھانے والی تھپکی کو ترستا ہے۔ مشکلات میں کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دینے والا شخص ساتھ نہیں رہتا۔ اولاد کی زبان سے "بابا جانی" لفظ کھو جاتا ہے۔ جن کے باپ دنیا سے رخصت ہو جائیں ان کو زندگی کی دھوپ، آندھی اور طوفان سے ہمیشہ خوف ستاتا رہتا ہے۔ کسی نے کیا خوب تحریر کیا ہے۔ "باپ نے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا، بتاؤ دنیا کا طاقتور انسان کون ہے؟۔ بیٹے نے جواب دیا

باپ کھیتوں۔ سڑکوں۔ بازاروں۔ دفتروں میں طعنے سنتے ہیں مگر مسلسل کام جاری رکھتے ہیں

میں ہوں۔ پھر باپ نے کندھوں سے ہاتھ ہٹا کر پوچھا کہ دنیا کا کمزور انسان کون ہے؟ بیٹے نے جواب دیا میں ہوں۔ باپ نے پوچھا کہ کیوں؟ تو بیٹے نے جواب دیا جب آپ کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا تو میں دنیا کا طاقت ور ترین انسان تھا اور جب آپ نے ہاتھ ہٹا دیا تو میں دنیا کا کمزور انسان بن گیا"۔

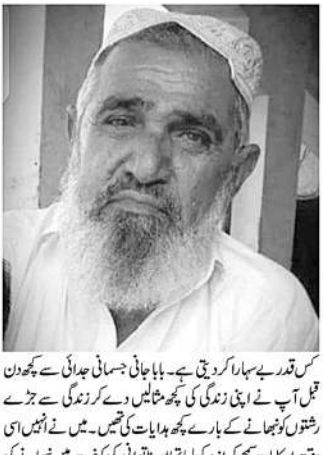

بابا جانی جب آپ نے 26 اگست 2021 کو سی ایم ایچ کوئٹہ میں ہم سے جسمانی دوری اختیار کی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری پشت پر کھڑی چٹان ہٹ گئی ہو۔ بابا جانی آپ کے جانے کے بعد میں اپنے آپ کو دنیا کا کمزور ترین انسان محسوس کرنے لگا ہوں۔ درہ بولان کے راستے آپ کے جسد خاکی لے جاتے ہوئے بولان کے پہاڑ پہلی مرتبہ میرے آنکھوں سے جاری ساون کی جھڑی دیکھ کر محو حیرت تھے کہ پہاڑوں جیسے جذبے والے "پناہ" کو کیا ہوا ہے؟ لیکن انہیں کیا پتہ کہ اس دن "پناہ" سایہ دار شجر سے محروم ہو کر جھلساتی ہوئی لو کی زد میں آگیا تھا، شفقت و تحفظ کے جذبے میرے زندگی سے دور چلے گئے، میں اردگرد انگنت خوفناک کرداروں میں گھر کر عدم تحفظ کی کیفیت سے دوچار ہوا تھا اور یہ محسوس کر رہا تھا کہ یتیمی تو کسی بھی عمر کی ہو وہ انسان کو

کس قدر بے سہارا کر دیتی ہے۔ بابا جانی جسمانی جدائی سے کچھ دن قبل آپ نے اپنی زندگی کی کچھ مثالیں دے کر زندگی سے جڑے رشتوں کو نبھانے کے بارے کچھ ہدایات کی تھیں۔ میں نے انہیں اسی وقت احکامات سمجھ کر ازبر کر لیا تھا اور ناتوانی کی کیفیت میں نبھانے کی کوشش کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ آپ کی طرح زبان پر نہ کوئی شکوہ ہے، نہ کوئی شکایت ہے اور نہ ہی کوئی گلہ۔ البتہ بزدلی، نالائقی، نااہلی سمیت متعدد خطابات اور القابات کی بارش اسی طرح برقرار ہے۔ ہاں البتہ کچھ دُور جا کر بیٹھا ہوں کہیں آپ کے احکامات کی حکم عدولی سرزد نہ ہو اور اس پر استقامت سے قائم رہ سکوں۔ بابا جانی آپ سے بچھڑے دو سال گذر گئے لیکن میں آج بھی اس امید سے ہوں کہ آپ ابھی کہیں سے نمودار ہو کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں گے! کیوں پریشان ہو رہے ہو، فکر نہ کرو خدا بہتر کرے گا۔ لیکن میاں

آپ کی رشتے نبھانے کی ہدایات میں نے احکامات سمجھ کر ازبر کر لی ہیں

محمد بخش کا یہ شعر پڑھ کر پھر صبر کر لیتا ہوں۔

عیداں تے شب براتاں آئیاں سارے لوکی گھراں نوں آئے
اونہیں آئے محمد بخشا جیہڑے آپ ہتھیں دفنائے۔

❀❀❀

ہر باپ عظیم قابلِ تعظیم

اللّٰہ کا شکر ہے کہ 'اطراف' کی اپنے عظیم والد کے بارے میں لکھنے کی تحریک مقبول ہو رہی ہے۔ سینئر صحافی۔ نئی بات۔ 'معیار'، 'امن'، 'جنگ' سے وابستہ رہنے والے ادبی صفحات کے انچارج۔ ادبی حلقوں میں ہر دلعزیز مقبول خان صاحب نے بھی اپنے محنت کش والد کے بارے میں بہت دل موہ لینے والی تحریر بھیجی ہے۔ پڑھئے۔ آپ کو بھی اپنے والد محترم کے بارے میں لکھنے کی دعوت ہے۔

ہمارے محنت کش باپ نے سب بیٹوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا

تحریر، مقبول خان

میرے والد حافظ مقصود خان کو ہم سے بچھڑے ہوئے 35 برس ہو چکے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایسے غریب محنت کش باپ کا بیٹا ہوں جس نے اپنا تن من مار کر مجھ سمیت تمام بھائیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ پاکستان آنے کے بعد ان کی تمام زندگی روزی روٹی کے حصول کے لئے جدو جہد کرتے ہی گذری۔ وہ ہمیں بھی جدو جہد کی ترغیب دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آرام طلبی جسم کی دشمن ہے۔ اس جسم کو ایک دن رزق خاک ہونا ہے۔ ہم نے

پہلی ملازمت بطور مکینک 150 روپے ماہوار

ہوش سنبھالنے کے بعد سے ان کے آخری وقت تک کبھی اپنے والد کو قیمتی لباس میں ملبوس نہیں دیکھا۔ ہم نے انہیں ہمیشہ سادگی اور قناعت پسند پایا۔ جب تک ان کے ہاتھ پاؤں میں قوت رہی محنت کشی کرتے رہے۔ اس کے ساتھ جب بھی انہیں وقت ملتا، مجھ سے قرآن سنتے تھے۔ اور حرفوں کی ادائیگی کے بارے میں بتاتے تھے۔ والد صاحب کو تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے، کہ جو تاریخ اسلام اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے، وہ اسلامی تاریخ نہیں بلکہ مسلمان حکمرانوں کی تاریخ ہے، جسے مسلم حکمرانوں نے درباری مورخین سے لکھوایا ہے۔ میرے خاندان کے بیشتر افراد تصوف کے سلسلہ وارثیہ سے وابستہ ہیں۔ لیکن میرے والد کو تصوف سے دلچسپی نہیں تھی۔ میرے والد نے 1924 میں غیر منقسم ہندوستان کے شہر آگرہ میں ایک متوسط طبقے کے مذہبی گھرانے میں جنم لیا تھا۔ دادا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو مذہبی تعلیم لئے حصول کے لئے آگرہ کے ایک معروف مدرسے میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں والد کے خالو مولانا حافظ جلال الدین تدریس اور مسجد میں خطابت اور امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ حفظ قرآن کے بعد دادا مرحوم نے اپنے ایک ہندو دوست کے ورکشاپ میں موٹر میکینک کا کام سیکھنے کے لئے لگا دیا۔ قیام پاکستان کے سات سال بعد 1954 میں والد ہماری والدہ کے بے حد اصرار پر پاکستان منتقل ہو

ہمیشہ قناعت پسند۔ کبھی قیمتی لباس میں نہیں دیکھا

گئے۔ میرے دادا محمود خان ہندوستان میں ہی رہنا چاہتے تھے۔ جبکہ میری والدہ کے والد (ہمارے نانا) سمیت تمام قریبی رشتہ دار پاکستان آچکے تھے۔ اس لئے والدہ کے زور دینے پر والد کو آگرہ چھوڑ کر پاکستان کراچی آنا پڑا۔ دادا اور دادی آگرہ ہی میں رہے۔ والد کے لئے اجنبی شہر کراچی میں روزگار کی تلاش بڑا مسئلہ تھا۔ جلد ہی ساتھ لائی ہوئی رقم ختم ہوگئی، والدہ کے زیورات بک گئے۔ والد کے استاد اور خالو مولانا جلال الدین (جن کا مزار پاپوش نگر میں مرجع خلائق ہے)، جو اس وقت اوکھائی میمن مسجد کھارادر میں امامت اور خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کے توسط سے ایک میمن سیٹھ حاجی عبدالطیف کی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی لطیف گڈز ٹرانسپورٹ میں ڈیڑھ سو روپے ماہانہ پر بطور میکنک ملازمت مل گئی۔ (یہ ان دنوں کی بات ہے جب آٹا سوا چار روپے کا دس سیر، اور گوشت ایک روپے سیر تھا) یوں زندگی کی گاڑی چلتی رہی۔ ساڑھے چار سال بعد لطیف سیٹھ کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے بیٹوں کو اس کام سے دلچسپی

جب تک اعصاب جواب نہ دے گئے محنت کرتے رہے

نہیں تھی۔ انہوں نے یہ گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی بند کر دی۔ والد کو ایک بار پھر بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا۔ 1959 میں مولانا جلال الدین کے توسط سے اوکھائی میمن مسجد انتظامیہ کی جانب سے والد صاحب کو نائب امام، موزن، اور تراویح میں قرآن کریم کے سامع اور مدرسہ میں بچوں کو قرآن پڑھانے کے طور پر معقول مشاہرہ پر ملازمت اور رہائش فراہم کرنے کی پیشکش کی گئی۔ لیکن والد نے

والد حافظ مقصود خان

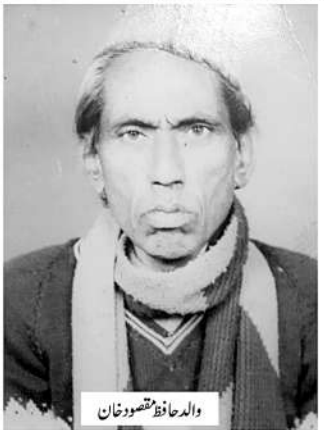

حافظ قرآن اور دینی تعلیم رکھنے کے باوجود محراب و منبر کو روزی، روٹی کا ذریعہ بنانے سے انکار کر دیا۔ یہ مشکل وقت جلد ہی گذر گیا۔ صدر میں لکی اسٹار کے قریب شاہ جی ایکسل والے کے بڑے بھائی نے کچھ معاوضہ پر اپنی ورکشاپ پر بیٹھنے اور کام کرنے کی اجازت دے دی۔ ان دنوں کراچی میں آج کی طرح کاروں کی بھر مار نہیں تھی۔ کراچی میں شاید اس وقت چند ہزار ہی کاریں ہوں گی۔ تاہم اللہ کریم روزی رساں ہے۔ گذر بسر ہو ہی جاتی تھی۔ جہاں وہ جب تک ان کے اعصاب نے جواب نہیں دیا، کام کرتے رہے۔ اس دوران ہم دو بھائی ملازمت کرنے لگے تھے۔ ہم نے ان کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے گھر میں آرام کرنے کی درخواست کی جس پر والد مرحوم بمشکل راضی ہوئے اور چند ماہ بعد کچھ عرصے بستر علالت پر زندگی کے دن پورے کئے، اور دسمبر 1988 میں رضائے الٰہی سے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، اور اپنے پیچھے حالات کا حوصلہ مندی کے ساتھ مقابلہ کرنے، حوصلہ نہ ہارنے اور محنت سے جی نہ چرانے کی داستان کی تلخ و شیریں یادیں ہمیں ورثہ میں دے گئے، جو ہمارے لئے انمول خزانے سے کم نہیں ہے۔ ❁

اپوا گورنمنٹ گرلز ہائی سیکنڈری اسکول لیاقت آباد

عام طور پر سرکاری اسکولوں کے بارے میں پورے ملک میں منفی رائے پائی جاتی ہے۔ جہاں جہاں متعلقہ پرنسپل اور ایجوکیشن آفیسر کی غیر معمولی دلچسپی اور محنت سے معاملات بہتری کی طرف بھی گامزن ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس تاثر کی زد میں آجاتے ہیں۔ جہاں آراء 'اطراف' کو ایسے منفرد اداروں سے روشناس کرواتی رہتی ہیں۔ اس بار ایک ایسی ہی درسگاہ اپوا گورنمنٹ گرلز ہائی سیکنڈری اسکول لیاقت آباد کے بارے میں قابل رشک روداد پڑھیں اور اپنی رائے کا اظہار کریں۔

حکومتی تعلیمی اداروں میں بھی مثبت علم دوست اقدامات

تحریر: جہاں آراء

ہم نصابی سرگرمیاں اسکولوں میں طلبا کی جسمانی اور ذہنی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ان کے سیکھنے کے عمل کو تیز تر بناتی ہیں۔

تعلیمی نصاب اور کتب کمرہ جماعت میں طالبعلموں کو معلومات فراہم کرتی ہیں۔ لیکن ہم نصابی سرگرمیاں کمرۂ جماعت سے باہر غیر رسمی اور ہلکے پھلکے انداز میں سیکھنے کے مواقع پیش کرتی ہیں۔ کیونکہ تعلیم صرف درسی کتب اور لیکچر تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہم نصابی سرگرمیاں بھی اس کا بہت اہم حصہ ہوتی ہیں، جن سے طلباء کی ذہنی، جسمانی اور اخلاقی نشوونما ہوتی ہے۔ ان سرگرمیوں میں کھیل، شجر کاری، فنون، تربیتی ورکشاپس، سماجی خدمات اور ثقافتی اور مذہبی تقریبات اور خاص کر ہفتہ طلباء کی صورت میں تفریحی اور معلوماتی مقابلوں اور کھیلوں کا انعقاد طالبعلموں میں قائدانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں تعلیمی نظام اپنے ان گنت مسائل کی وجہ سے جس زبوں حالی کا شکار ہے وہاں اس قسم کی سرگرمیوں کا انعقاد بھی معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ البتہ نجی تعلیمی اداروں میں عام طور پر فنڈز کی کمی جیسے مسائل کا سامنا نہیں ہوتا اس لئے وہاں ہم نصابی سرگرمیاں نصاب تعلیمی عمل کا لازمی جز ہوتی ہیں۔ یہی

> ہفتۂ طالبات میں ذہنی اور جسمانی توانائی کے مقابلے

وجہ ہے کہ نجی تعلیمی اداروں کے طالبعلم زیادہ بہتر تعلیمی نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

لیکن جب مجھے ایک سرکاری تعلیمی ادارے اپوا گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری اسکول لیاقت آباد کے کالج سیکشن میں بطور (انٹرنی سیجیکٹ

اپوا گورنمنٹ گرلز ہائی سیکنڈری اسکول لیاقت آباد

اسپیشلسٹ) لیکچرار پڑھانے کا موقع ملا تو وہاں پر منعقدہ ہم نصابی سرگرمیاں اور ان میں طالبات کی کارگردگی دیکھ کر میں ششدر و متحیر رہ گئی اور اندازہ ہوا کہ ہمارے ملک کا اصل سرمایہ اور قابلیت تو گورنمنٹ تعلیمی اداروں میں موجود ہے۔ایک تو اس بات کی بہت خوشی ہوئی کہ حکومتی تعلیمی ادارے جن کے متعلق ہم اکثر منفی بیانات ہی سنتے ہیں اب وہاں بھی بہت کچھ مثبت اور قابل ستائش ہو رہا ہے دوسرا یہ کہ ان مثبت اور علم دوست اقدامات کا تذکرہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ہم خامیوں اور کمزوریوں کا کرتے ہیں۔تاکہ ایسی مثبت کاوشوں کو دوسروں کے سامنے بطور مثال پیش کیا جا سکے اور دیپ سے دیپ جلایا جا سکے۔

یوں تو اپوا گورنمنٹ گرلز ہائیسکنڈری اسکول لیاقت آباد میں منعقدہ ہم نصابی سرگرمیوں کی ایک لمبی فہرست ہے لیکن مضمون کی طوالت کے خدشے کے باعث کچھ کا ذکر قارئین کی نذر ہے۔سب سے پہلے تو ذکر ہو جائے اسکول میں منعقدہ ہفتہ طالبات کا۔جس میں اسکول اور کالج کی جماعتوں کی طالبات کے درمیان ذہنی اور جسمانی نشوونما کے مختلف مقابلوں کا انعقاد کیا گیا۔سب سے پہلے قرات، حمد اور نعت کے مقابلے کروائے گئے جس میں حصہ لینے والی طالبات نے اپنی خوبصورت اور پرترنم آوازوں سے سب کو حیران کر دیا۔کیونکہ یہ آوازیں کسی بھی طرح کسی ماہر نعت خواں سے کم نہ تھیں۔اس کے بعد اگلے روز اردو اور انگریزی تقاریر کے مقابلے ہوئے۔دوران

سائنس کے موضوعات پر ماڈلز اور پروجیکٹ

تقریر طالبات کا پرجوش انداز ان کی قائدانہ صلاحیتوں کا پتہ دے رہا تھا۔تو دوسری جانب مقابلہ مضمون نویسی کے انعقاد نے اعلیٰ فکر کی حامل بہترین لکھاریوں کی نشاندہی کی۔جبکہ اگلے دن مصوری (آرٹ) کے مقابلے میں طالبات نے اپنے برش سے کینوس پر ایسے ایسے رنگ بکھیرے کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے اور داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔صرف اتنا ہی نہیں اگلا مقابلہ کھیلوں کا تھا جس میں طالبات کو جسمانی مشقت کرنا تھی۔لیکن جسمانی سرگرمیوں کے لئے بھی دماغی طور پر چاق و چوبند ہونا ضروری ہوتا ہے تب ہی تو مناسب حکمت عملی سے مقابلہ جیتا جاتا ہے۔کھیلوں میں دوڑ، نیٹس اور کرکٹ کے مقابلے شامل تھے۔لیکن اسکول کی طالبات نے دوڑ جبکہ کالج کی طالبات نے کرکٹ میں خاص دلچسپی ظاہر کی۔اسکول کی طالبات کو دوڑتے دیکھ کر مجھے مستنصر حسین تارڑ صاحب کا ایک سفر نامہ تھر کی نادیہ کماچی یاد آیا جو گیارہویں جماعت کی اردو کی کتاب میں شامل ہے۔جس میں انہوں نے تھر میں ننگر پارکر کے علاقے سے تعلق رکھنے والی ایک آٹھ سالہ بچی نادیہ کا ذکر کیا ہے، جسے انہوں نے ننگر پارکر کے پہاڑی سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی پر نہایت پھرتی اور چابک دستی سے صرف پانچ منٹ میں چڑھتے اور واپس آتے دیکھا۔وہ بھی بغیر کسی احتیاطی تدابیر کے۔مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر نامے میں اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ یہ بچی اولمپک

گولڈ میڈل جیت سکتی تھی۔ کیونکہ کوئی بھی بین الاقوامی شہرت یافتہ راک کلائمبر (rock climber) بھی اس چوٹی تک حفاظتی اقدامات کے سات پہنچنے میں پندرہ سے بیس منٹ لازمی لیتا ہے۔ جبکہ واپسی کا وقت الگ ہوگا۔ اسکول کے مقابلے میں دوڑتی بچیاں بھی مجھے نادیہ کمانچی ہی لگیں اور نہ جانے کتنی نادیہ کمانچی ان اسکولوں میں موجود ہیں لیکن ان صلاحیتوں کو نکھارنے اور انہیں آگے بڑھانے والا کوئی نہیں ہے۔ ہفتہ طالبات کے آخری دن فن گالا بھی سجایا گیا جس میں طالبات مزید رکھانوں اور جھولوں سے لطف اندوز ہوئیں۔ یہاں بھی تمام تر کھانوں اور دستکاریوں کے اسٹالز بھی طالبات نے خود لگائے تھے۔

اس کے علاوہ اسکول میں ہر ہر اہم موقع پر چاہے وہ یوم آزادی ہو یا یوم پاکستان، تحریک پاکستان کے کسی اہم رہنما کا یوم پیدائش ہو یا یوم وفات، یوم تکبیر ہو یا یوم دفاع، یوم ثقافت ہو یا کوئی مذہبی تہوار، یوم مزدور ہو یا یوم اساتذہ، شجر کاری مہم ہو یا یوم ارض وغیرہ وغیرہ ہر اہم دن کی مناسبت سے سرگرمیوں کا باقاعدہ انعقاد کیا جاتا ہے اور طالبات کو آگاہی فراہم کی جاتی ہے اور ان کی صلاحیتوں کو نکھارا جاتا ہے۔ تاکہ ان کی معلومات صرف درسی کتب تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ جنرل نالج اور پاکستانی معاشرے سے بھی انہیں ہم آہنگ کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں اسکول میں طالبات کی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لئے ایک آرٹ روم بھی بنایا گیا ہے جس میں طالبات کو مصوری، سلائی کڑھائی اور کھانا پکانے کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

اسکول میں منعقد کی جانے والی سائنسی ماڈلز کی نمائش کا ذکر بہت ضروری ہے جس میں اساتذہ اور طلبا کا جوش وخروش بھی قابل دید تھا۔ طالبات نے جس مہارت سے سائنس کے مختلف موضوعات پر پروجیکٹ اور ماڈلز بنائے تھے وہ سائنس کے میدان میں ان کی باکمال صلاحیتوں کی نشاندہی کر رہے تھے۔ اور یہ بھی کہ ان طالبات میں مستقبل میں سائنس دان بننے کی صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ بچوں کے سوچنے کا انداز بڑوں سے کچھ مختلف ہوتا ہے جو اس قسم کی سرگرمیوں کے ذریعے سب پر عیاں ہوتا ہے۔ اور ان کی مخفی صلاحیتوں کی شناخت کرنے اور انہیں نکھارنے کا موقع ملتا ہے۔ میرے پوچھنے پر جب سائنس پراجیکٹ اور ماڈلز بنانے والی اکثر طالبات نے ڈاکٹر اور انجینئر بننے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس وقت ایک خیال نے کچھ دیر کے لئے میرے دل کو افسردہ کیا۔ وہ یہ کہ اس اسکول میں زیادہ تر طالبات کا تعلق ان گھرانوں سے ہے جو غربت کی سطح سے بھی نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں اور ایسے گھرانوں کے کتنے فیصد بچے ڈاکٹر اور انجینئر بن جاتے ہیں؟

ان بچوں کے پاس تو آگے کالج کے اخراجات پورے کرنے کے وسائل بھی نہیں ہوتے ہیں تو پھر یہ میڈیکل اور انجینئرنگ کالج یا یونیورسٹی کی بھاری بھرکم فیسیں کیسے ادا کر پائیں گے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ نا جانے کتنے ایسے خواب ٹوٹ جاتے ہیں، نہ جانے کتنی بچیوں کی آرزوئیں ان کے گھروں کے چولہوں میں پھونک دی جاتی ہیں اور نہ جانے کتنی نادیہ کمانچی کم عمری کی شادی کا شکار ہو کر جوڑوں کے درد اور دیگر امراض میں مبتلا ہو کر بستر مرگ پر پڑ جاتی ہیں۔ لیکن امید پر دنیا قائم ہے۔

اس ضمن میں جب میری اسکول کی پرنسپل فرح شاہد صاحبہ سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ 2017 میں انہوں نے بطور انچارج

متعلقہ حکام سرکاری اسکولوں میں قیمتی سرمائے کی قدر کریں

پرنسپل اس اسکول کا انتظام سنبھالا تھا۔ بعد ازاں 2018 میں جب انہیں پرنسپل کے تمام تر اختیارات تفویض کئے گئے تو اس وقت اسکول میں کوئی ایسا ہال یا بڑا کمرہ نہیں تھا جس میں ان ہم نصابی سرگرمیوں کا انعقاد کیا جا سکے۔ لہذا انہوں نے عمارت میں موجود دو خالی کمروں کی درمیانی دیوار کو توڑوا کر ایک ہال بنوایا۔ اب اسی ہال میں اسکول کی اکثر تقریبات اور سرگرمیوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس

کے علاوہ اسکول میں ایک آرٹ روم اور لائبریری بھی قائم کی گئی ہے جس سے طالبات اپنے فارغ اوقات میں مستفید ہوتی ہیں۔ اسکول کے مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے فرح شاہد صاحبہ نے بتایا کہ اسکول کے فنڈز بہت کم ہیں۔ جبکہ اسکول کو ہائر سیکنڈری بنانے کے باوجود حکومت کی جانب سے فنڈز میں اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ لہذا محدود وسائل ہی میں سارے مسائل پر قابو پانا ہوتا ہے، حتی کہ اسکول میں صفائی کے لئے کوئی جمعدار موجود نہیں ہے۔ یہ پوسٹ ایک عرصے سے خالی ہے۔ اور ہم نے خود ایک جمعدار رکھا ہوا ہے جس کی تنخواہ بھی ہمیں ہی دینی ہوتی ہے۔ شام کی شفٹ میں بھی یہاں اسکول لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکول کے احاطے میں موجود اضافی جگہ دوسرے کالج اور اسکولوں کو دے دی گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسکول میں صفائی کے مسائل ہیں۔ جس پر وہ ہر ممکن قابو پا رہی ہیں۔

ان تمام مسائل کے باوجود اپوا گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری اسکول لیاقت آباد میں منعقد کی جانے والی ہم نصابی سرگرمیاں نہایت ہی قابل ستائش ہیں۔ محدود وسائل میں ان سرگرمیوں کے انعقاد سے نہ صرف طالبات ذہانت، قابلیت اور ان کی پوشیدہ صلاحیتیں سامنے آئیں بلکہ ان میں مستقبل میں کچھ کر گزرنے کی ترکیب بھی ملی۔ مزید برآں اسکول کی پرنسپل محترمہ فرح شاہد صاحبہ کی ان سرگرمیوں کے انعقاد میں خاص دلچسپی اور ہر ہر مرحلے پر طالبات اور اساتذہ کی حوصلہ افزائی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اگر ادارے کا سربراہ اپنے کام سے مخلص اور اپنے اسٹاف کا معاون ہو تو ہر نا ممکن کو بھی ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ میں اسکول پرنسپل فرح شاہد صاحبہ اور اسکول کے تمام اساتذہ کو محدود وسائل اور ان گنت مسائل کے باوجود ان کامیاب سرگرمیوں کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتی ہوں اور ان کے حوصلے کی ہمت افزائی کرتی ہوں۔ اسکول کی تمام تر سرگرمیوں میں اسکول اور کالج کے تمام اساتذہ، کالج کی انٹرنی لیکچرار اور دیگر معاون اسٹاف بھرپور معاونت فراہم کرتا ہے۔ اسکول پرنسپل اور تمام اساتذہ کی ان کاوشوں کو سراہنا لازم ہے۔

اس ضمن میں ڈسٹرکٹ (سینٹرل) ایجوکیشن آفیسر محترم مشرف علی راجپوت کی خدمات بھی قابل ستائش ہیں کیونکہ وہ اپنے ڈسٹرکٹ کے تمام اسکولوں کی نا صرف کڑی نگرانی کر رہے ہیں بلکہ تعلیمی معیار کی بہتری اور ہم نصابی سرگرمیوں کے انعقاد میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔ جو کہ سرکاری اسکولوں کے نظام تعلیم میں مثبت تبدیلی اور ایک اچھے مستقبل کی ایک نوید ہے۔ اس ادارے میں کام کرنے کے بعد میرا ذاتی تجربہ یہ رہا کہ ہمارے ملک کی اصل ذہانت، صلاحیت اور ہنر سرکاری اسکولوں میں موجود ہے۔ ماہنامہ اطراف کے توسط سے میری حکام بالا اور سرکار سے درخواست ہے کہ خدارا سرکاری اسکولوں میں موجود اس قیمتی سرمائے کی قدر کریں۔ اور کچھ ایسی حکمت عملیاں ترتیب دیں جن کی مدد سے ان بچیوں کے مستقبل کو محفوظ بنایا جا سکے۔ اور ان کے خواب ٹوٹنے نہ دیئے جائیں۔ ❁

2047 کے لیے پاکستان کے اہداف

کاظم سعید صاحب کی کتاب "دو پاکستان" اگرچہ 2021 میں شائع ہونی تھی آج کے بدلتے حالات میں اس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اب جب پاکستان انتہائی بدحال معیشت کا سامنا کر رہا ہے۔ اس وقت اس کتاب کا مطالعہ ہر پاکستانی کے لیے لازمی ہے۔ اس کتاب پر کالم تو 'جنگ' میں لکھ چکے ہیں۔ لیکن اس کے آخری باب کو بھی نذر قارئین کرنا ضروری تھا۔ اس کے لیے اجازت ہم نہیں لے سکے۔ امید ہے مصنف اور ناشر کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کریں گے۔

21 ویں صدی۔ اصل میدان جنگ عالمی معیشت

کاظم سعید کی شہرۂ آفاق تصنیف 'دو پاکستان' سے آخری باب

خوشحالی کی کنجی دراصل خرید و فروخت کی مالیت میں اضافہ ہے جس سے فروخت کرنے والے کو کچھ کمانے کا موقع ملتا ہے۔ یہ بات معیشت کی خوشحالی کے لیے بھی اتنی ہی درست ہے جتنی کسی گھرانے کی خوشحالی کے لیے۔ دم تحریر کورونا کی وبا کی وجہ سے خرید و فروخت کے عمل میں خاصی کمی آئی ہے جس نے دنیا بھر کی

2047 تک 2017 کی پیداواری مالیت کو 8 گنا کرنا ہے

معیشتوں اور گھرانوں کی خوشحالی پر ضرب لگائی ہے۔ بنی نوع انسان کو دیگر بیماریوں کی طرح کورونا پر بھی قابو پانے کی امید ہے۔ لیکن کورونا کی وجہ سے معیشت کی ترقی اور غربت کے خاتمے کے بارے میں بنیادی کورونا اصولوں کے بدلنے کی توقع بے سود ہے۔ اس لیے دنیا بھر کے تجربے سے ہدایت لینا بہتر ہے جو کہتا ہے کہ غربت کا خاتمہ کئی دہائیوں تک معیشت کی پیداواری مالیت یعنی جی ڈی پی میں زبردست اضافے کے ساتھ ہی ممکن ہوتا ہے۔ جی ڈی پی بنیادی طور پر معیشت کی سطح پر خرید و فروخت کا پیمانہ ہے۔ جی ڈی پی میں اضافہ گھرانوں کی طرف سے خریداری، حکومتی اخراجات اور کاروباری اداروں کی سرمایہ کاری سے بھی ہوتا ہے۔ لیکن عالمی تجربہ کہتا ہے کہ خوشحالی کی جس سطح پر ہماری معیشت اس وقت ہے وہاں سے جی ڈی پی میں زبردست اضافہ برآمدات کے ذریعے ممکن رہا ہے۔ یہ سب کچھ اب ایک زمانے سے عیاں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی معیشت خود میں مگن رہنے کی عادی ہوتی چلی گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہماری معیشت کے تجارتی توازن میں وہ استحکام بھی نہیں ہے جو مغل سلطنت کو حاصل تھا۔ آج ہماری برآمدات سے درآمدات کہیں زیادہ ہیں۔ اکیسویں صدی کا اصل میدان جنگ عالمی معیشت ہے۔ اس میدان کارزار میں مقابلہ کرنے سے ہی ملکی وقار حاصل ہوتا ہے۔ عالمی معیشت کو دیکھ کر صاف ظاہر ہے کہ بہتر سے بہتر اشیاء اور خدمات مہیا کر کے دنیا بھر کے خریدار جیت لینا ہی معاشی قوت کی بنیاد بنتی ہے۔ لیکن ہم نے اپنی معیشت کو اس عالمی مقابلے سے گریز پر مائل رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری معیشت کے ہر شعبے کی ساخت میں کسی نہ کسی سطح پر مغل معیشت کی چھاپ نظر آتی ہے یعنی محض قلعے کے اندر والوں کو پیداواری مالیت میں اضافے کا فائدہ

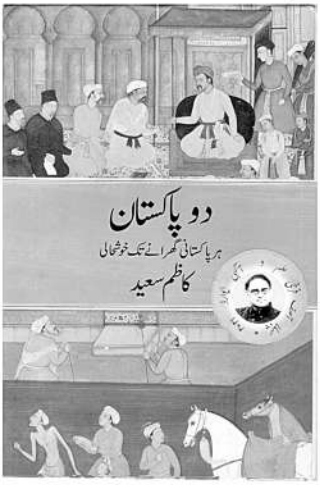

پہنچتا ہے۔ اس قسم کی پیداواری ترتیب نے معاشی جمود اور سکوت کو جنم دیا ہے۔ اس سے زیادہ مہلک اثر یہ ہوا ہے کہ نئے علم کی

بنیاد پر جو نئے معاشی شعبے دنیا میں متعارف ہوئے ہیں ان کے پیداواری عمل سے ہماری معیشت نابلد ہے اور جدید عہد کے ساحل پر کھڑی رہ گئی ہے۔ اکیسویں صدی علم کی صدی ہے۔ آج عالمی معیشت کی چوٹی پر وہی ممالک ہیں جو نئے علم کی تخلیق کے ذریعے نئی اشیاء اور خدمات ہی نہیں نئے شعبے تخلیق کر رہے ہیں۔ اس لیے اکیسویں صدی میں جدت و ترقی کے اس تمام عمل سے نابلد ہونا اور روایتی اشیاء و خدمات میں پھنسے رہنا ہی معاشی پسماندگی کی تعریف ہے۔ اصل المیہ یہ ہے کہ ہماری معیشت کی ساخت اس پسماندگی کو فروغ دیتی ہے۔ اس کی مثالیں ہماری پوری معیشت میں جا بہ جا ملتی ہیں۔ ہماری برآمدات ان شعبوں

میں ہیں ہی نہیں جن کی وسیع ترین عالمی برآمدات ہیں۔ ہماری تین چوتھائی افرادی قوت روایتی دستی مشقت سے کماتی ہے جس میں علم و ہنر یا تو کم درکار ہوتا ہے یا اس کی ضرورت ہوتی ہی نہیں۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ ہماری افرادی قوت میں چالیس فی صد کے قریب ناخواندہ پاکستانی شامل ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ پاکستانی معیشت کے آج کے کلیدی شعبوں کے بل بوتے پر برآمدات کے ذریعے پیداواری مالیت میں زبردست اضافہ اور غربت کا خاتمہ ممکن نہیں۔ ہم یوں ہی چلتے رہے تو ہمارے مستقبل میں دیگر عالمی طاقتوں کی غلامی ہی نظر آتی ہے۔

معاشی جمود و سکوت کی اس جکڑ بند کا توڑ محض کاروباری شخصیات کا احتساب نہیں ہے۔ جمود کا توڑ حرارت ہے اور معیشت میں حرارت مقابلے سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ یہ حرارت متعارف کروانے کے لیے ہمیں شعبہ بہ شعبہ معیشت کی ساخت بدلنا ہو گی۔ خرید و فروخت کی مالیت میں اضافے کی خاطر ہمیں ہر کاروبار میں مقابلہ متعارف کروانا ہوگا اور زیادہ کمائی والے شعبوں میں داخل ہونا ہوگا۔ اس کے لیے شعبہ بہ شعبہ ہماری معیشت کو عالمی معیشت سے تعلق پیدا کرنا ہوگا۔ جہاں جہاں حکومت کی طرف سے قیمتوں اور پیداوار کا تعین ہوتا ہے وہاں بااثر طبقوں کو فائدہ پہنچنے کا سب سے زیادہ امکان ہوتا ہے۔ اس سے قلعے کے اندر ثمر ناجائز اور قلعے کے باہر محنت بے ثمر جنم لیتے ہیں۔ ہمارے پیداواری سلسلوں میں شعبہ بہ شعبہ قیمتوں اور پیداوار کا حکم حکومتی اہل کاروں کے بجائے کاروباری محرکات کو بنانا ہوگا۔ چین نے بھی یہی سب کیا اور معاشی ترقی کے ساتھ غربت میں کمی کرنے میں اتنا کامیاب ہوگیا کہ آج عالمی سطح پر امریکہ کا فریق ہے۔ اس کے ساتھ چین کی طرح ہمیں بین الاقوامی سطح کے علم اور مہارت کو سرمایہ کاری سے بھی زیادہ اہمیت اور توجہ دینی ہوگی۔ پاکستان کا معاشی وقار اور غربت کا خاتمہ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اس لیے ان دونوں کے اہداف کو بھی ساتھ ساتھ ذہن نشین کرنا بہتر ہے۔ معیشت کی ترقی کا پیمانہ خرید وفروخت کا حجم ہے جسے پیداواری مالیت یا جی ڈی پی سے ناپا جاتا ہے۔ غربت میں کمی خیرات سے نہیں کمانے کی صلاحیت میں اضافے سے ہوتی ہے۔ کسی گھرانے کی کمانے کی صلاحیت کا پیمانہ اس کا فی کس روزانہ خرچ سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں معیشت کی پیداواری مالیت میں اضافے پر یکسوئی سے کام کر کے 2047 تک 2017 کی پیداواری مالیت کو آٹھ گنا کر دینا ہوگا۔ یعنی کوشش یہ ہونا چاہیے کہ اس عرصے میں معیشت کی شرح نمو کی اوسط سات فی صد سے خاصی اوپر ہی رہے۔ یوں 2017 میں پاکستان کا فی کس جی ڈی پی کوئی ڈیڑھ ہزار ڈالر فی کس سالانہ سے 2030 میں اٹھائیس سو ڈالر فی کس سالانہ اور 2047 میں ساڑھے سات ہزار ڈالر فی کس سالانہ تک پہنچانا ہوگا جو 2017 میں چین کی سطح سے دور نہیں۔ لیکن غربت کے خاتمے کے لیے شرح نمو کا ہدف کافی نہیں۔ آج پاکستان کی اتنی فی صد آبادی دو ڈالر فی کس روزانہ سے کم خرچ پر زندہ ہے۔ غربت کے خاتمے کے لیے 2047 تک ہر پاکستانی گھرانے کو دو ڈالر فی کس روزانہ سے زیادہ خرچ کی سطح پر پہنچانا ہوگا۔ یوں 2030 تک بھوک اور جبری مشقت کا بھی خاتمہ ناگزیر ہے۔ اس سطح کی کامیابی کے لیے

ہر گھر میں کمانے کی صلاحیت
کمانے والوں کی تعلیمی سطح سے منسلک

معاشی ترقی اور شرح نمو میں اضافے کا بھوت سوار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن بھوت سوار کرنے کے ساتھ نیت بھی احسن ہونا ضروری ہے۔ معیشت کا حجم طویل مدت تک بڑھاتے رہنے کے لیے پاکستانیوں کو یہ طے کرنا ہوگا کہ ملک کی خدمت کرنے کا بہترین طریقہ عالمی منڈیوں میں پاکستانی مصنوعات اور لیاقت کا لوہا منوانا ہے۔ یہ مقصد ہر پاکستانی اور ہر پاکستانی کاروباری ادارے کو متحرک کر کے حاصل کرنا ہوگا۔ حکومتی اداروں کو پیداوار میں نہیں پیداواری اداروں کی معاونت و اعانت پر توجہ رکھنی ہوگی۔

جدید عہد میں ایک گھرانے کی کمانے کی صلاحیت اس کے کمانے والوں کی تعلیمی سطح سے منسلک ہے۔ لیکن قلعے کے اندر والے پاکستانی قلعے کے باہر والوں کی فلاح کے لیے ان بنیادی تقاضوں پر توجہ دیتے ہیں جو محض زندہ رہنے کے لیے ضروری ہیں۔ یوں قلعے کے باہر والوں کی خوشحالی کا پیمانہ یا تو یہ ہوتا ہے کہ کتنی آبادی خط غربت سے نیچے رو رہی ہے یا آبادی میں ناخواندہ لوگوں کی شرح کیا ہے۔ لیکن محض خط غربت سے اوپر آنے اور خواندہ ہونے سے خوشحالی نہیں مل سکتی۔ اس لیے اس کتاب میں ہم نے خوشحالی کے لیے نہایت واضح اہداف کا تعین کیا ہے۔ 2047 تک ہر پاکستانی گھرانے تک خوشحالی پہنچانے کے لیے آج کے پاکستان کی ضعیف فلاحی ریاست کی جگہ 2030 تک توانا اور مالی طور پر مستحکم شعبہ ہائے تعلیم وصحت و

فلاح قائم کرنا ہیں۔ ان شعبوں کو ملنے والا سرمایہ حکومتی وسائل تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ تعلیم اور صحت کے لیے سرمائے میں زبردست اضافہ اعلیٰ تعلیم کے قرضوں کے نظام اور ملک گیر تحفظ صحت سے کرنا ہوگا۔ یہ دونوں نظام قانون سازی کے ذریعے قائم کرنا ہوں گے تاکہ حکومتی وسائل کو اسکولوں اور طبی خدمتگاہوں کی تعمیر وافزائش پر مرکوز کر کے 2030 تک ملک کے ہر علاقے میں ہر پاکستانی کے لیے تعلیم وصحت کا انفراسٹرکچر مہیا کیا جا سکے۔ اگر 2030 تک ہر پاکستانی بچہ اہلیت والے اساتذہ کے زیر تربیت ایک جدید اسکول میں ہوگا اور اعلیٰ تعلیم کے معیاری اداروں میں زبردست اضافہ ہو چکا ہوگا تب ہی 2047 تک اتنی فی صد پاکستانیوں کے پاس میٹرک کی سند اور تیس فی صد کے پاس کوئی نہ کوئی ڈگری ہونے کے اہداف حاصل ہو سکیں گے۔ اس کے ساتھ اگر ہم 2030 تک آج کے ترکی کی سطح کا نظام صحت بنا سکے تو اس نظام صحت کو 2047 میں آج کے ترقی یافتہ ملکوں کی سطح کے قریب پہنچانا ممکن ہوگا۔ یوں 2047 میں پاکستان کی پندرہ کروڑ افرادی قوت میں سے کوئی ایک کروڑ نوکریاں تعلیم، صحت اور دیگر فلاحی شعبوں میں ہوں گی۔ یہ جدید عہد کا وہ معقول روزگار ہوگا جو عام معاشی اتار چڑھاؤ کے باعث کم نہیں ہوگا۔ یہ تمام اسکول کالج اور ہسپتال حکومت تنہا نہیں بنا سکے گی۔ اس لیے جتنے پاکستانی شہری معیاری اسکول کالج اور طبی خدمتگاہیں بنانے میں اعانت کریں گے اتنا ہی ملک کا فائدہ ہے۔ ہر پاکستانی گھرانے تک خوشحالی پہنچانے کا اصل فیصلہ پاکستانی خواتین کے مقدر سے منسلک ہے۔ قلعے کے باہر کی خواتین کی زندگیوں کو ہم نے قریب سے دیکھا۔ ان خواتین کی تعلیم وتربیت، ان کی صحت، ان کی خوش گوار ازدواجی زندگیاں اور ان کی جانوں کا تحفظ ہی ہر گھرانے تک خوشحالی پہنچانے کا راستہ ہے۔

قلعے کے باہر رہنے والوں کو قلعے کے اندر کی زندگی دینے کے بہترین ذریعے معیاری تعلیم اور معقول روزگار ہیں۔ غربت کے خلاف کام کرنے والے ان طاقتور ترین ہتھیاروں کو آپس میں ہم آہنگ رکھنا ضروری ہے۔ عموماً غریب گھرانوں کے لیے غربت سے نجات کا پہلا قدم ہر مہینے تنخواہ دینے والی نوکری ہوتی ہے۔ یہ قدم کم ہنر یا بلا ہنر پاکستانی افرادی قوت کی زراعت سے صنعت کی طرف منتقلی سے ممکن ہوگا۔ معاشی ترقی کے ساتھ غربت ختم کرنے والے ملکوں کا مقدر یہی رہا ہے۔ آج زیادہ تر پاکستانی دستی مشقت سے کما رہے ہیں۔ یہ جسمانی قوت ایک صدی پہلے تو معاشی طاقت کا سرچشمہ سمجھی جا سکتی تھی لیکن اکیسویں صدی میں مشین کے استعمال کے ساتھ ہی دستی مشقت اور ہنر کارآمد ہوتے ہیں۔ انسان خواندہ ہو بھی تو بے ہنر یا کم ہنر کاموں کی بنیاد پر خوشحالی تو بعید غربت میں کمی بھی مشکل ہے۔ 2047 کے پاکستان میں اگر ہر گھر تک خوشحالی پہنچانا ہے تو پاکستان کی افرادی قوت میں جو بھی دستی مشقت ہوگی وہ نہایت ہنرمند اور رشک عالم تکنیکی علم کاروں کے ذریعے ہونا چاہیے چونکہ یہ لوگ ہی پیداواری طاقت کے ستون ہوتے ہیں۔ اس لیے زرعی پیداواری مالیت میں اضافے کے ساتھ زراعت میں نوکریاں بڑھیں گی نہیں کم ہوں گی۔ قلعے کے باہر کے زیادہ سے زیادہ گھرانوں کو صنعت میں روزگار کا موقعہ فراہم کرنے کے لیے کاروباری اداروں کے الحاق کے ساتھ ملک بھر میں تکنیکی تربیت کے معیاری اداروں کا جال بچھانا ہوگا۔ اس کے ساتھ 2030 تک معیشت میں کام کرنے والے عام

خوشحالی کے لیے لاوا پک رہا ہے۔ فیصلہ ہمیں کرنا ہے

پاکستانیوں کی فلاح کے لیے معقول روزگار کے ارکان مہیا کرنا ہوں گے۔ ان میں سے کچھ ارکان کاروباری اداروں پر قانون کے اطلاق سے ممکن ہو سکیں گے جیسے مناسب معیاد کی چھٹی، یونین بنانے کا حق، وغیرہ اور کچھ ارکان ملک گیر فلاحی اداروں کے ذریعے جیسے تحفظ صحت، پنشن، کم از کم اجرت کے بقدر صلاحیت میں اضافہ وغیرہ۔ اس صدی کے وسط تک کمانے کی عمروں والے پاکستانی مجموعی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہوں گے۔ ان پاکستانیوں میں تعلیم وہنر کی سطح ہر گھرانے تک خوشحالی پہنچانے کا ذریعہ ہوں گے۔ ملکی آبادی میں اضافے کی شرح بھی ہر گھرانے تک خوشحالی پہنچانے سے ہی کم ہوگی۔ 2047 میں پاکستان کی آبادی کے متعلق پیش گوئی یہ ہے کہ تقریباً آدھی آبادی شہری علاقوں میں اور آدھی دیہی علاقوں میں مقیم ہوگی۔ جدید عہد میں شہری علاقے ہی پیداواری مالیت یا جی ڈی پی میں اضافے اور اس کے نتیجے میں آنے والی خوشحالی کے پھیلاؤ کے مراکز ہیں۔ پاکستان میں غربت سب سے زیادہ دیہی علاقوں میں پلتی ہے۔ شہری اور دیہی پاکستان میں بڑھتے تفاوت کو کم کرنے پر محنت لازمی ہے ورنہ قلعے کی چند فصیلوں کے ڈھاتے ڈھاتے نئی فصیلیں کھڑی ہو جائیں گی۔ دیہی پاکستان کی پسماندگی میں کمی کے لیے زراعت کی ترقی کے ساتھ دیگر معاشی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہوگا خصوصاً زرعی پیداوار کی بنیاد پر چلنے والی صنعتوں کو۔

سانوں اچھی بات یہ ہے کہ پاکستان میں غربت آج مخفی نہیں ہے اور ہر ہر گھرانے کی غربت کے بارے میں اعداد وشمار موجود ہیں۔ ان اعداد وشمار کو باقاعدگی سے جمع کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ جدید عہد میں ایک طرف تو غربت کے خاتمے کے لیے ایک ماحول چاہیے۔ اس ماحول کے اجزا معقول روزگار کے مواقع میں مسلسل اضافہ، ان مواقع سے ہم آہنگ نظام تعلیم وہنر، انسان دوست نظام صحت حکومت کی طرف سے مخصوص ترقیاتی اور کاروباری مقاصد کے لیے اعانت، محنت کشوں کے حقوق کا قانونی تحفظ اور ان تمام امور کے لیے مستحکم مالی بنیاد ہیں۔ دوسری طرف معاشی ترقی کے لیے اکیسویں صدی کا تقاضہ یہ ہے کہ پاکستان میں ایک علم آفرین معیشت قائم ہو۔ ڈیٹا یا اعداد کی بنیاد پر نئے کاروبار پیدا کرنے کی صلاحیت ترقی کی ضامن بنتی جا رہی ہے۔ ان شعبوں میں مہارت حاصل کرنا ناگزیر ہے لیکن پاکستان کو کئی دہائیوں تک زیادہ تر پاکستانیوں کو قلعے کے باہر رکھنے کا ازالہ بھی کرنا ہے۔ یہ صنعتی پھیلاؤ سے ہی ممکن ہے تاکہ کم ہنر اور بے ہنر پاکستانیوں کو ذرائع معاش مہیا کیے جا سکیں۔ لیکن کسی صنعت میں استعمال ہونے والی پیداواری ٹیکنالوجی بھی اگر عالمی معیشت کے ساتھ ہم آہنگ نہ رکھی جائے تو وہ اس صنعت میں کام کرنے والوں کو غریب رکھ سکتی ہے۔ اس لیے صنعتی ترقی کی سیڑھی پر چڑھتے رہنا اصل ترقی ہے۔ اس سیڑھی پر چڑھنے میں چین جیسی معیشت جو اس سیڑھی پر نچلی سطح کی صنعتوں کو خیر باد کہہ رہی ہے ان کا پاکستانی معیشت کی طرف منتقل ہونا سی پیک کے باب دوئم کا مقصد ہونا چاہیے۔ اس تمام ترقی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی مٹی اور آب وہوا کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ان تمام مقاصد کی خاطر ہمیں عالمی تجارت میں انصاف اور عالمی ماحولیات کے تحفظ کو اپنی خارجہ پالیسی کی کلیدی ترجیحات میں شامل کرنا ہوگا۔

2047 تک قلعے کی فصیلوں کو ایک ایک کر کے گرانے سے پاکستانی معیشت بھی بدل جائے گی اور ساتھ ساتھ ہماری معاشرت اور سیاست بھی۔ دراصل خوشحالی حاصل کرنے کے لیے جوش قلعے کے باہر ایک لاوے کی طرح پک رہا ہے۔ اگر ہم نے دیر کر دی تو یہ لاوا ہم سب کو بھلس بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم اس کی طاقت کو راستہ دے سکے تو اس کی آتش عالمی معیشت کے میدان میں فتوحات کو جنم دے گی اور پاکستان کی تقدیر بھی بدل دے گی۔ اس کتاب میں راستے تجویز کیے گئے ہیں۔ یہ لاوا کیا رخ اختیار کرے گا فیصلہ ہمارا ہے۔ ❁

”پاکستان لائبریری“ کا وطن عزیز میں قیام

101 کتب جن کی مالیت دو لاکھ روپے ہے صرف تیس ہزار روپے **(Rs:30,000)** میں حاصل کریں۔ پاکستان لائبریری کے نام سے اپنے گھر، محلے، گاؤں، ہسپتال، جیل خانہ جات، کالونی، سکول، کالج، یونی ورسٹی میں اور اپنی اپنی مادرِ علمی میں، اپنے والدین، قومی ہیروز اور اپنے پیاروں کے نام پر یہ کتب خرید کر لائبریری قائم کریں۔

نوٹ: **100** خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔

قدم بڑھائیں، لائبریری بنائیں
کتابیں ایک سو ایک، مقصد اعلیٰ اور نیک

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

یثرب کالونی، بینک سٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ

ای میل: qalamfoundation2@gmail.com 0309-4105484 / 0300-0515101

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جولائی 2024 سیاحت نمبر کے لیے دلچسپ مضامین کے علاوہ

انتہائی اہم انکشافات سے بھرپور

شہری آزادیوں کی جدوجہد کے سرکردہ رہنما۔ سینئر صحافی

حسین نقی

سے ڈاکٹر سید جعفر احمد کی گفتگو

ایوب۔ یحییٰ۔ بھٹو۔ ضیاء الحق۔ تمام ادوار میں

بے باک۔ آزادیٔ اظہار کے نقیب

اپنی کاپی ابھی محفوظ کرالیں

فون: 0300-8210636

تذکرہ کتابوں کا

اب کے 'اطراف' کے مدیر اور حرف مطبوعہ کے دلدار خان ظفر افغانی تین آپ بیتیوں کا تذکرہ کررہے ہیں۔ ان میں دو کا تعلق صحافت کے خارزار سے ہے۔ اور ایک ہمہ مقتدر ادارے یعنی فوج سے علاقہ رکھتے ہیں۔بعد میں سفارت کار بھی رہے ہیں۔خود نوشت ہمیشہ سے قارئین کی اولیں پسند رہی ہے کہ یہ ایک فرد کی نہیں ایک عہد کی داستان ہوتی ہے۔ بہت سے انکشافات۔ بہت سے پوشیدہ گوشے سامنے آتے ہیں۔ خان ظفر افغانی کا اسلوبِ تذکرہ قارئین 'اطراف' میں بہت مقبول ہورہا ہے۔ پڑھئے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

''صحافت کے خاروگل'' اشرف شاد کی یادداشتیں

☆ خان ظفر افغانی

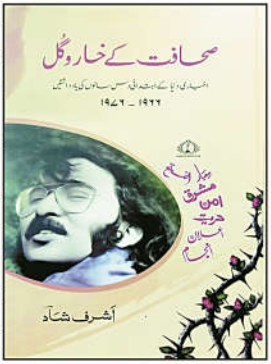

معروف صحافی اشرف شاد نے اخباری دنیا کے اپنے ابتدائی دس برسوں (1970-1966) کی یادداشتیں قلم بند کرکے، اسی سال فروری میں کتابی شکل میں پیش کی ہیں۔

مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ''معروف افراد کی یادداشتیں'' خودنوشت سوانح حیات پوری دنیا میں، مطالعے کے شوقین لوگوں کی پسندیدہ صنفِ ادب ہے۔ ایسی کتابوں میں، مصنفین اپنے مشاہدات، تجربات، اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات بیان کرتے ہیں، جن افراد کے ساتھ وقت گزرا ہوتا ہے اُن کا ذکر کرتے ہیں، یہ سب اُن کے لے دلچسپی کا باعث ہوتا ہے جو دوسروں کے مشاہدات وتجربات سے سیکھتے ہیں اور معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے ہاں بھی کتب بینی کے شوقین لوگوں میں یادداشتیں، سوانح حیات کی کتابیں، کتب بینوں تک پہنچ رہی ہیں۔ ادباء، شعراء، صحافیوں، سفارتکاروں، سیاستدانوں، فوجی افسران، نوکر شاہی کے شعبے سے متعلق افراد کی یادداشتیں، خودنوشت سوانح حیات، کتابی شکل میں شائع ہورہی ہیں۔

اس وقت ہم جن کتابوں کو زیرِ تذکرہ لارہے ہیں ان میں معروف صحافی اشرف شاد کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب ''صحافت کے خاروگل'' ہے جو ان کی ،اخباری دنیا کے ابتدائی دس برسوں کے بارے میں ہے۔ یہ کتاب سفید کاغذ پر مضبوط جلد سے آراستہ ہے۔ اسے ''پاکستانی ادب پبلی کیشنز (کراچی)'' نے شائع کیا ہے۔ تقسیم کار ہے ''فضلی سنز (اُردو بازار کراچی)'' قیمت ہے ہزار روپے۔

اس کتاب کے تیرہ ابواب ہیں جن میں اشرف شاد نے اپنی صحافت کے ابتدائی برسوں، 1970 میں صحافت کی آزادی کی جدوجہد، اپنی رپورٹنگ کے حوالے سے تجربات اور واقعات، کراچی پریس کلب سے وابستہ واقعات' جیل میں گزرے شب وروز، صحافت کے حوالے سے بیرونِ ملک قیام ہفت روزہ معیار (کراچی) کی کہانی اور سنسر زدہ پاکستان کے بارے میں اپنے ذاتی تجربات کو تحریر کیا ہے۔

کتاب کے آخری صفحات پر، اشرف شاد کے ادبی کام کے حوالے سے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کی آراء درج ہیں۔

اشرف شاد، مختلف الجہت فرد کا نام ہے۔ وہ ناول نگار، افسانہ نویس اور شاعر کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ زیرِ تذکرہ کتاب سے پہلے اُن کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ یہ ہیں:

وزیرِ اعظم، بے وطن، جج صاحب، کراچی پریس کلب، صدر محترم، اللہ میاں کے گھر، آ میرے قریب آ، نصاب، احمد فراز بقلم خود، انڈر گراؤنڈ۔ ان کی کتاب ''بے وطن'' ہندی زبان میں بھی شائع ہوچکی ہے۔ ان کے علاوہ اشرف شاد کی ادبی خدمات، ان کی شخصیت وانٹرویوز کے حوالے سے کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

کتاب کے اوّلین صفحات پر مصنف کی کچھ تصاویر ہیں جو معروف افراد کے ساتھ یادگار ہیں۔ معروف صحافی ڈاکٹر توصیف احمد خان کے اس کتاب کے بارے میں تحریر کردہ تبصرے سے چند سطریں بطور اقتباس:

''اس کتاب کا احتیاط سے جائزہ لیا جائے تو صحافت کے ادنیٰ طالب علم کے لیے کئی نئی معلومات بیان کی گئی ہیں۔ کئی شخصیتوں کے بارے میں ایسے حیرت انگیز انکشافات سامنے آتے ہیں کہ جو قارئین ان شخصیتوں کو جانتے ہیں ان کی رائے تبدیل ہوسکتی ہے اور جو قارئین اس کتاب کے مطالعہ سے ان شخصیتوں سے واقف ہوں گے وہ ان شخصیتوں کے عقیدت مند ہوجائیں گے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اشرف شاد صاحب کبھی صحافی اور کبھی ابلاغ عامہ کے استاد کی حیثیت سے طلوع ہوتے ہیں جب کہ کبھی لمیٹڈ ٹریڈ یونینسٹ کبھی ایک ایڈیٹر اور کبھی ایک ایسی شخصیت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جو اپنے تمام ادوار کے دوستوں کو یاد رکھتا ہے۔''

قارئین کرام! یادداشتوں پہ مشتمل زیرِ تذکرہ تصنیف، بہت دلچسپ ہے، اس میں مصنف کی جدوجہد، مشاہدات وتجربات ہیں، انکشافات ہیں، دس برسوں کی تاریخ بھی ہے، احباب سے محبت کا عکس بھی در آتا ہے۔ یادداشتیں پڑھنے کے جویا کتب بینوں کے لیے، یہ کتاب ابتدائی صفحات سے آخر تک توجہ ودلچسپی لیے ہوئے ہے۔

''افتخار نامہ'' افتخار احمد سندھو کی خودنوشت

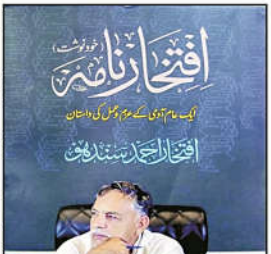

''میرا نکتۂ نظر یہ ہے کہ پاکستان کے مسائل کی جڑ اشرافیہ ہے۔ مختصر سا ٹولہ ملک کے سو فیصد وسائل پر قابض ہے۔ باقی عوام ان کے رحم وکرم پر ہیں۔ میرا تعلق دیہاتی علاقے سے ہے اس لیے میں جانتا ہوں کہ سب سے نچلی سطح پر اشرافیہ کا نمائندہ گاؤں کا وہ کن ٹٹا ہوتا ہے جسے لوگ چودھری کے نام سے پکارتے ہیں، اس چودھری کا تعلق پٹوار خانے سے بھی ہے اور تھانے سے بھی۔ یہ چودھری اس قدر طاقت ور ہے کہ وہ تھانے کے منشی سے کہہ کر جس کی مرضی چھترول کروا دیتا ہے۔ جسے چاہے حوالات میں بند کروا سکتا ہے، جس کی چاہے ضمانت ہونے دے، جس کی چاہے ضمانت نہ ہونے دے۔ یہ اشرافیہ درجہ بدرجہ معاشرے میں سرطان کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔

عجب ستم ظریفی ہے کہ پاکستان، اسلام کے نام پر بنا، یہاں لوگوں کو مساوات کا خواب دکھایا گیا، بنیادی حقوق کے وعدے وعید کیے گئے۔ لیکن قائداعظم کی رحلت کے ساتھ ہی یہ سارے وعدے اور خواب، سراب ثابت ہوئے۔ ملک میں طرح طرح کی اشرافیہ نے جنم لیا۔ پہلے بیوروکریسی حکومتی معاملات میں غالب رہی۔ پھر ایوب خان اور اس کے فوجی جرنیلوں نے اس ملک کی قسمت کے ساتھ کھلواڑ کیا۔ انہیں اپنے مفادات کے لیے عدلیہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو نظریۂ ضرورت کے فیصلوں کے ساتھ عدلیہ نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ صنعتکاروں اور تاجروں نے اپنی اپنی گروپ بندی کر لی، زمین داروں اور جاگیرداروں نے بھی عوام کے گلے میں طوق غلامی ڈالا۔ اب ملک پر اشرافیہ کا مافیا حاوی ہے۔''

قارئینِ کرام! درج بالا اقتباسات کسی سیاستدان، سیاسی تبصرہ نگار یا صحافی کی تحریر سے نہیں لیے گئے۔ یہ ایک ''عام آدمی'' کی خودنوشت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں کوئی لکھاری نہیں ہوں، میں ایک عام آدمی ہوں اور یہ ایک عام شخص کی زندگی کی کہانی ہے۔ ہمیشہ بڑے لوگوں نے اپنی آپ بیتی لکھی۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی عام آدمی نے اپنی آٹو بائیوگرافی لکھی ہو۔ میں نے اپنے احساسات، خیالات، مشاہدات تجربات اور زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا خلاصہ قلم بند کرتے ہوئے ہر ممکن حد تک احتیاط کی کوشش کی ہے اور انصاف واحتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔''

معروف صحافی اسد اللہ غالب نے زیرِ تذکرہ کتاب کا فلیپ لکھا ہے کہ ''یہ کتاب ایک دیہاتی شخص کی سادگی کا بھی عکس ہے اور ایک کاروباری شخص کی تہہ در تہہ کامیابیوں کا انبار بھی۔ یہ کتاب ایک سادہ منش انسان کے علم وفضل سے بھی لبریز ہے۔ افتخار احمد سندھو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا نہیں ہوئے بلکہ اپنی محنت اور اللہ کے بھروسے پر آج ایک بہت بڑی کاروباری شخصیت ہیں۔ انہوں نے علم وادب کی فضائے بسیط میں ایک نئی کہکشاں کو جنم دیا ہے، اس کہکشاں کی ایک ایک سطر جگمگ جگمگ کر رہی ہے۔ لوگوں کو ایک سچے انسان کے اندر جھانکنے کا موقع ملے گا۔''

معروف صحافی مجیب الرحمٰن شامی کا کہنا ہے کہ ''افتخار احمد سندھو کی خودنوشت میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ان کی آنکھوں، دل اور دماغ میں پایا جاتا ہے، پایا جاتا رہا ہے۔ انہوں نے مشقت کی ہے اور راحت کا لطف بھی اٹھایا ہے۔ وہ اپنے حلقۂ تعارف کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ جو ان کو جانتا ہے وہ تو جانتا ہی ہے، جو نہیں جانتا وہ 'افتخار نامہ' پڑھ کر جان لے گا۔''

''افتخار نامہ'' جب ہم نے پڑھا تو یقین نہیں آیا کہ وہ عام آدمی ہیں۔ تحریر میں جہاں سادگی وبے ساختگی ہے وہاں ایک پختہ سوچ، وطنِ عزیز کے حالات، معاشرتی ماحول، رسوم ورواج کی تصویر بھی نظر آتی ہے۔ سیاسی و معاشرتی معاملات پر ان کی رائے کاٹ دار ہے اور بے باکی لیے ہوئے ہے۔ ان کی اس کتاب میں جگہ جگہ ایسے تبصرے ہیں جو قابلِ تحسین ہیں۔ سچائی، بے باکی اس خودنوشت کی جان ہیں۔

یہ خودنوشت ''قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل (یثرب کالونی، بینک اسٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ) نے سفید چکنے کاغذ پر طبع کی ہے، مضبوط جلد کے ساتھ 272 صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ہے ڈھائی ہزار روپے۔

(سندھو صاحب آپ بھلے عام آدمی ہیں لیکن آپ کی خودنوشت پر مشتمل کتاب عام آدمی کی قوت خرید سے باہر ہے۔)

''پروازِ خاک'' میجر جنرل محمد سعد خٹک (ر) کی کہانی

''مجھے کولہو پہنچے ہوئے تقریباً دو اڑھائی ماہ گزرے تھے اور مارچ کے وسط میں کورونا وبائی مرض کا پہلا لاک ڈاؤن شروع ہو چکا تھا۔ اس دوران مجھے خیال آیا کہ میرے پاس بتانے کے لیے ایک کہانی ہے۔ ایک فوجی کی کہانی..... میرا دہائیوں کا طویل سفر، مشکلات میں اَن گنت چیلنجوں کا جوان مردی سے مقابلہ کرنے کی ایک کہانی ہے۔ جو اپنے ملک کی وقار کے لیے کسی بھی قسم کی قربانی حتیٰ کہ اپنی جان تک قربان کر دینے سے بھی گریز نہ کرے۔''

تو جناب یہ ایک فوجی کی زندگی کی کہانی ہے، عام آدمی سے عام آدمی تک۔ جس کے بارے میں معروف صحافی، روزنامہ پاکستان کے چیف ایڈیٹر مجیب الرحمٰن شامی کہتے ہیں کہ ''ایک ایسے آدمی کے ہاں 'ایک عام آدمی کے طور پر پیدا ہوا۔ سرکاری اسکول میں ایک عام سے طالب علم کے طور پر پڑھا، فوج میں بھرتی ہوا اور آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ میجر جنرل کے منصب پر فائز ہوا۔ ان کی زندگی کی کہانی خاص طور پر ان نوجوانوں کو پڑھنے کی ضرورت ہے جو اپنی

دنیا آپ پیدا کرنے کی تڑپ رکھتے ہیں، جو ستاروں پر کمندیں ڈالنا چاہتے ہیں۔ انہیں یقین رکھنا چاہئے کہ رشوت اور سفارش کے بغیر بھی ترقی کی جاسکتی ہے اور پاکستانی معاشرے میں نام اور مقام پیدا کیا جاسکتا ہے۔"

سعد خٹک کی زیرِ تذکرہ، آپ بیتی 428 صفحات پہ مشتمل ہے۔ کتاب کے درمیانی صفحات پر اور آخر میں ان کی زندگی کے مختلف ادوار سے وابستہ یادگاری تصاویر ہیں۔ سرورق ان کی میجر جنرل کے عہدے کی دوستارہ وردی سے سجا ہوا ہے جس میں وہ خوب جچ رہے ہیں۔ اور اس میں قطعاً "عام آدمی" نہیں کہے جاسکتے۔

پاکستانی فوج میں کمیشن حاصل کر کے، پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں تربیت حاصل کرنے والے کیڈٹ نے میجر جنرل تک کا سفر کیسے طے کیا اور پھر سری لنکا میں سفیر کی حیثیت میں جو مشاہدات کیے، وہ سب کچھ اس آپ بیتی کا حصّہ ہے۔ سعد خٹک نے بارہ ابواب میں تقسیم، اپنی کہانی میں اپنے خاندان، ابتدائی تعلیم، فوج میں بھرتی ہونے، ترقی کرنے، سفارتکاری کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ یقیناً قابلِ مطالعہ ہے۔ اس میں ان کی ذاتی زندگی کا عکس ہے۔ پیشہ ورانہ زندگی کی یادداشتیں بھی۔ وطنِ عزیز کے مختلف علاقوں میں تعیناتی، بلوچستان میں سیکٹر کمانڈر آئی ایس آئی کی حیثیت سے اہم تعیناتی پر رہتے ہوئے وہاں کے حالات اور تاثرات مختلف عہدوں پر رہتے ہوئے فوج کے ماحول، اپنے ہم عہدہ ساتھیوں اور افسران کا ذکر۔ یہ اور بہت کچھ اس آپ بیتی کے مطالعے سے ملتا ہے۔

یادداشتیں، خودنوشتیں پڑھنے کے رسیا کتب بینوں کے لیے، فوج میں شمولیت کے خواہش مند اور کوشش کرنے والے نوجوانوں کے لیے میجر جنرل (ر) سعد خٹک کی کہانی خود اپنی زبانی، دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔

کتاب کی قیمت ہے 1780 روپے۔

"لمحوں کی دھول" رباب عائشہ کی خودنوشت

رباب عائشہ! صحافی، کالم نویس، افسانہ نگار۔ انہوں نے 1966 میں صحافت کے شعبے سے وابستگی اختیار کی۔ تقریباً پچیس برسوں تک روزنامہ جنگ راولپنڈی کے خواتین کے صفحے کی نگراں رہیں، اخبار جہاں کے لیے فیچرز لکھے، انٹرویوز کیے، رپورٹنگ کی۔ 1991 میں روزنامہ نوائے وقت سے وابستہ ہوئیں اور خواتین کا صفحہ مرتب کرتی رہیں۔ انہوں نے کتابوں کے تراجم بھی کیے۔

خودنوشت سوانح سے پہلے ان کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ یہ ہیں:

خاک کے آس پاس، سدا بہار چہرے، مثالی مائیں، زندگی اور زاویے۔

زیرِ تذکرہ خودنوشت سوانح 192 صفحات پہ مشتمل ہے۔ اس کا دیباچہ وفاقی جامعہ اُردو اسلام آباد کے شعبۂ اُردو کی صدر ڈاکٹر فہمیدہ تبسم نے تحریر کیا ہے۔ ان کی رائے میں "وہ لوگ بڑی توفیق کے حامل ہوتے ہیں جو حریمِ ذات کے سرد و گرم کو شوارہ منظم و مرتب صورت میں آنے والے زمانوں کے سپرد کرنے اور خود کو امر کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ واقعات نگاری منظم و ترتیب کے دائرے میں ہو یا غیر منظم و رغیر مرتب ہو، بقا و دوام اس ہی تخلیق کو حاصل ہوتا ہے جس میں جذبے کی سچائی، بیان کی تاثیر اور تکلف و ریاکاری سے گریز کا عنصر شامل ہو۔ محترمہ رباب عائشہ کی خودنوشت ایسی ہی ایک تصنیف ہے جو اپنی مصنفہ کی سادہ و پرکار تہذیب آشنا، باوقار شخصیت کی آئینہ داری کرتی ہے۔"

معروف شاعر، ادیب، صحافی جناب محمود شام کا کہنا ہے کہ "ویسے تو ہر خودنوشت اس متکلم سے وابستہ عہد کی داستان ہوتی ہے لیکن جب اسے قلم و قرطاس کے ساتھ دن رات گزارنے والی، جھومر نیزیوں کے ساتھ ساتھ محلات کی روداد لکھنے والی رباب عائشہ بیان کرتی ہے اور جسے تقسیمِ ہند کے تاریخی لمحات دیکھنے کو ملے ہوں، دنیا کی سب سے بڑی ہجرت کے قافلوں کا حصّہ بھی رہی ہو، پھر پاکستان جیسے چیلنج کو بھی قبول کیا ہو، جسے اُردو کے کثیر الاشاعت اخبار 'جنگ' کی بلندی سے یہ نشیب و فراز دیکھنے کا اتفاق حاصل ہوا ہو اور ایک نظریے پر قائم رہنے والے 'نوائے وقت' کی سیڑھیاں چڑھنے کا اعزاز بھی نصیب ہوا ہو اور جسے ضیغم زیدی جیسے جرأت مند فوٹو جرنلسٹ کی رفیقۂ حیات رہنے کا شرف میسر آیا ہو، اس کا مشاہدہ کتنا ہمہ گیر ہوگا۔"

میں لمحوں کی دھول، میں رباب عائشہ کو نہیں، ان کے خاندان کو نہیں، بلکہ پورے پاکستان کو دیکھ رہا ہوں۔ رباب کی جدوجہد، ہر پاکستانی کی جدوجہد ہے۔"

یہ خودنوشت سوانح 16 ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جس میں خاندان کا پس منظر، اپنا بچپن، صحافت میں گزارا دور اور دیگر احوال ہے۔ ان کی تحریر کے بارے میں الٰہ آباد یونیورسٹی (انڈیا) کے شعبۂ عربی و فارسی کی سابق صدر ڈاکٹر صالحہ رشید کی رائے، زیرِ تذکرہ کتاب کے پس ورق پر دی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "یہ تحریر ان کے مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، محنت، ریاضت، خلوصِ نیت اور عزم و استقلال کی عکاس ہے۔ اسلوب کی چاشنی اس کی جاذبیت میں مزید اضافہ کرتی ہے۔"

عمدہ قسم کے دبیز کاغذ پہ طبع اس کتاب کی قیمت 1900 روپے ہے۔

اعترافِ خدمت اعزاز 2024

”اطراف‘2017 سے ہر مارچ میں پاکستان کی مختلف شعبوں میں خدمات انجام دینے والی خواتین کو بلا امتیاز رنگ و نسل۔ مذہب۔ اعترافِ خدمت اعزاز سے نوازنے کے لیے ایک شاندار تقریب کا اہتمام کرتا ہے۔ جس کی سرپرستی ہلٹن فارما کے سربراہ سردار یٰسین ملک کرتے ہیں سردار یٰسین ملک پاکستان میں متعدد یونیورسٹیوں میں تحقیقی اداروں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ اس تقریب میں اعزاز یافتگان سے جہاں آراء نے تاثرات حاصل کیے۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔“

زینہ لائبریری کے قیام پر اپنی پذیرائی پر ممنون۔ ہنی رضا

تحریر: جہاں آراء

گذشتہ کی طرح امسال بھی 06 مارچ 2024 کو” ماہنامہ اطراف“ کے بانی محمود شام صاحب کی جانب سے ملک کی نامور خواتین کی خدمات کے صلے میں ”اعترفِ خدمت اعزاز ایوارڈ“ کی پروقار تقریب کا انعقاد پنج لگژری ہوٹل میں کیا گیا۔ اس ایوارڈ کے لئے ہر سال مختلف شعبہ ہائے زندگی سے ایسے گوہر نایاب تلاشے جاتے ہیں جو اپنی مثل آپ ہوتے ہیں۔ گو کہ عصر حاضر میں خواتین کے وقار کی بحالی کے لئے کئی ایک تحاریک چل رہی ہیں لیکن ان سے مطلوبہ نتائج ابھی تک حاصل نہیں کئے جا سکے ہیں۔ بلکہ کچھ تو خود خواتین کا تقدس پامال کرتی نظر آتی ہیں۔ اس طرح عدم مساوات کا شکار ہونے والی خواتین کی تخلیقی قوتیں پژمردہ ہو جاتی ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ خواتین کی تخلیقی قوتوں کو نکھارنے کے لئے ہر شعبہ زندگی میں ان کے لئے راہیں ہموار کی جائیں اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اعزازات سے نوازا بھی جائے۔ اس ضمن میں محمود شام صاحب کی جانب سے خواتین کی خدمات کے اعتراف میں انہیں ایوارڈ سے نوازنا یقیناً ایک نہایت احسن قدم اور قابل ستائش امر ہے۔ محمود شام صاحب نہ صرف یہ کہ بنت حوا کے تقدس کو بحال کرنے کے سلسلے میں ایک نہایت اہم خدمت انجام دے رہے ہیں بلکہ نئے لکھنے والوں کی ذہنی آبیاری بھی کر رہے ہیں۔ جس پر حوا کی بیٹی آپ کی احسان مند ہے۔ اس

> **تقریب کی سب سے خوبصورت بات سماعت سے محروم بچوں کا قومی ترانہ پیش کرنا تھا۔**
>
> **ڈاکٹر طاہرہ ایس خان**

ضمن میں مارچ 2024 کی تمام اعزاز یافتگان محترم خواتین نے ایوارڈ کی تقریب سے متعلق شکریہ کے اور تہنیتی پیغامات بھیجے ہیں جو قارئین کی نذر ہیں۔

محترمہ ہنی رضا نے کہا کہ، ہر سال کی طرح اس سال بھی مورخہ 6 مارچ 2024 کو محمود شام صاحب نے پیچ لگژری ہوٹل میں ایک پر وقار تقریب کا اہتمام کیا۔ جس میں انہوں نے ملک کی نامور اور اپنے شعبہ جات میں ناقابل فراموش وبیکراں خدمات انجام دینے والی خواتین کو ایوارڈ سے نوازا۔ میری یہ بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس سال کی ایوارڈ یافتگان میں میرا نام بھی شامل تھا۔ یہ اعزاز میرے لئے بڑے فخر اور ناقابل بیان خوشی کا باعث ہے۔ مجھے یہ ایوارڈ میری علمی خدمات اور خاص طور پر زینہ لائبریری کے قیام پر دیا گیا۔ شام صاحب کی جانب سے کی گئی اس پذیرائی نے میرے حوصلے اور کام کرنے کے جذبے کو مزید بڑھایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دینے والوں کو ایوارڈ دینے کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے ملک کا نام روشن کرنے والوں کو ان

گھر بیٹھی بچیوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

ڈاکٹر راشدہ اتفاق علی

کی محنت کا صلہ ایوارڈ کی صورت میں ضرور ملنا چاہیئے۔ بے شک شام صاحب اس سلسلے میں نہایت اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ میں اس ایوارڈ پر محمود شام صاحب کی نہایت ممنون ہوں۔

ڈاکٹر طاہرہ ایس خان نے اپنی نیک خواہشات کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ، محمود شام صاحب کی قلمی وادبی خدمات سے شناسائی تھی لیکن ان کی بے شمار سماجی خدمات کے بارے میں اس سے قبل معلوم نہ تھا۔ اور خاص طور پر خواتین کی خدمات پر ایوارڈ کے ذریعے ان کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس مقصد کے لئے باقاعدہ سالانہ تقریب کے انعقاد کا پتہ چلا تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور یہ خوشی اس وقت دوبالا ہوگئی جب مجھے یہ پتہ چلا کہ اس سال میرا نام بھی اعزاز یافتگان میں شامل ہے۔ اور میرے علاوہ جن پانچ خواتین کو ایوارڈ دیئے جا رہے تھے ان کے بارے میں جان کر بھی بہت خوشی ہوئی۔ اور مستقبل میں اپنی علمی خدمات جاری رکھنے کا عہد کیا۔

پیچ لگژری ہوٹل میں منعقدہ تقریب ہر طرح سے بہت ہی پروقار تھی۔ اس تقریب میں مجھے ایسی شخصیات سے ملنے کا موقع ملا جن کے متعلق میں نے صرف پڑھا یا سنا تھا۔ میں نے بھی اپنی ساری زندگی کی جدوجہد کو مختصراً بیان کیا۔ وہ جدوجہد جو کہ پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر سے شروع ہوئی اور پھر کراچی اور نیویارک تک جا پہنچی۔

اس تقریب کی سب سے خوبصورت اور انوکھی بات سماعت سے محروم بچوں کا قومی ترانہ پیش کرنا تھا۔ یہ منظر اتنا جذباتی تھا کہ میں بھی ان کے ساتھ اشاروں سے ترانہ پڑھ رہی تھی۔ یہ تقریب میرے لئے بہت ہی خوبصورت اور منفرد تھی اور شام صاحب کی طرف سے دیئے گئے اعزاز اور عزت افزائی پر میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔

ڈاکٹر راشدہ اتفاق علی اپنے خوبصورت انداز میں کچھ یوں گویا ہوئیں کہ، خواتین کی ہمت افزائی اور ان کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں محمود شام صاحب نے جو روایت عوام کی آگاہی کے لئے ڈالی ہے وہ یقیناً قابل فخر اور قابل تحسین ہے۔ اس روایت کے مطابق

ہر سال کچھ خواتین کو ان کے متعلقہ شعبے میں کچھ کارہائے نمایاں انجام دینے پر اعتراف خدمت اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس سال مجھ ناچیز کو بھی یہ اعزاز حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنی اور تمام خواتین کی جانب سے اس کار خیر پر محمود شام صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ انہوں نے ہم پاکستانی خواتین کی آگے قدم بڑھانے میں بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ اگر ہم اپنے ملک کی تقریباً پچاس فیصد آبادی پر مشتمل خواتین کی صلاحیتوں کو نظرانداز کردیں گے اور انہیں ساتھ لے کر نہیں چلیں گے تو ملک ترقی کے بہت سے مراحل طے نہیں کر سکے گا۔ ان اعزازات سے خواتین کے جوش وجذبے کو تقویت ملتی ہے۔ بلکہ میری تو خواہش ہوگی کہ اس سلسلے میں چند نکات کو مدنظر رکھ کر اجتماعی طور پر خواتین کی مدد کرنا چاہیئے۔ مثلاً بچیوں کی تعلیم سے متعلق مختلف علاقوں کا سروے کیا جائے کہ بچیاں گھروں پر کیوں بیٹھی ہیں؟ اور یہ مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ ایسے کئی گھروں کی بچیوں کو ایک گھر میں جمع کر کے ان کی مفت تعلیم کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ بہت سی خواتین پڑھ لکھ کر گھر میں بیٹھ جاتی ہیں۔ زیادہ تر اس کی دو وجہ ہیں یا تو گھر والے اعتراض کرتے ہیں یا پھر خواتین شادی شدہ ہوں تو ان کی بچے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان کے گھر والوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے اور ہر ورکنگ آرگنائزیشن میں ڈے کیئر بنانے کی ضرورت ہے تا کہ ان مسائل کا حل نکالا جا سکے۔ کیونکہ پڑھ لکھ کر بھی دوسروں کے کام نہ آنا اس ملک کے ساتھ بہت ہی ناانصافی ہے۔ خواتین کی حوصلہ افزائی کے لئے محمود شام صاحب کی جانب سے منعقد کی گئی تقریب بہت ہی پروقار تھی۔ جس میں بہت سی علمی وادبی شخصیات نے شرکت کی تھی۔ اس تقریب کا سب سے اہم پہلو سماعت اور گویائی سے محروم بچوں کی اپنے اساتذہ کے ساتھ شرکت تھی۔ ان بچوں کی ہمت افزائی کے لئے بھی میں محمود شام صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ ایسے بچوں کو آگے بڑھانا ہمارا قومی فرض ہے اور میں اپنی ایک کتاب we are what we eat ان بچوں اور ان کے اساتذہ کو ماہنامہ اطراف کے توسط سے پیش کرنا چاہوں گی۔ میں ایک بار پھر محمود شام صاحب اور ان کی پوری ٹیم کی بہت شکر گزار ہوں۔

آخر میں صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ تدریس ایک ایسا شعبہ ہے جس سے انسان نا صرف اپنے شاگردوں کو بلکہ ملک کو بھی بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ جامعہ کراچی کا فوڈ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کا شعبہ ملک کی معاشی ترقی میں اپنا حصہ ڈال رہا ہے۔ اس شعبے کا قیام میری ایک

ادنیٰ سی کوشش تھی۔ تدریس کے ذریعے اس قوم کے لئے کچھ کرنے کی عکاسی شاید اس شعر کے ذریعے ہو سکے۔

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

ڈاکٹر پروین موی میمن صاحبہ نے بھی اپنے میٹھے لہجے میں کہا کہ پاکستانی خواتین کے لئے اعترف خدمت اعزاز محمود شام صاحب کا ایک قابل تحسین کارنامہ ہے۔ جنوری 2024 میں ماہنامہ اطراف کے چیف ایڈیٹر جناب محمود شام کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس کے مطابق ہر سال ہونے والی اعتراف خدمت اعزاز کی تقریب میں ملک کی نامور خواتین کے ساتھ مجھے بھی شریک کیا گیا

ہے۔ خط پڑھنے کے بعد دلی مسرت ہوئی۔ اور میں نے بخوشی اور فخر اس اعزاز کو قبول کیا۔ اور اس باوقار تقریب میں اپنے بیٹے کے ساتھ شرکت کی جس کا 6 مارچ ہی کو سی ایس ایس کا آخری پرچہ تھا۔ اس خوبصورت تقریب میں شام صاحب خود اعزاز یافتگان خواتین کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھے رہے یہ بھی ہمارے لئے ایک اعزاز کی بات تھی۔ تقریب میں شریک سنجیدہ اور سلجھے ہوئے علمی و ادبی شخصیات کے سامنے مجھے اپنی کاوشوں اور خدمات پر روشنی ڈالنے کا موقع ملا جسے تمام حاضرین نے نہایت انہماک اور دلچسپی سے سنا اور سراہا بھی۔ یہ ہر طرح سے ایک منفرد تقریب تھی۔ میں نے اپنا ایوارڈ جسٹس ماجدہ رضوی صاحبہ کے ہاتھوں سے لیا۔

محمود شام صاحب کا شمار ملک کے نامور صحافیوں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی خودنوشت شام بخیر آپ کے صحافتی و علمی کارناموں کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ نا صرف روزنامہ جنگ اور ڈان سمیت دیگر

> ہر نمبر کی طرح 'اطراف' کا
> عورت نمبر بھی مثالی ہوتا ہے۔
> **ڈاکٹر پروین میمن**

انگریزی اخبارات و جرائد میں آپ کی تحریریں شائع ہوتی ہیں بلکہ سندھی تراجم کی صورت میں سندھ بھر میں مقبول ہوئی ہیں۔ ماہنامہ اطراف کی معرفت پاکستان کے گوشے گوشے سے باخبر رکھنے والے محمود شام صاحب ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے کوشاں ہیں اور دیار غیر میں بسنے والے پاکستانیوں کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اطراف کے ہر نمبر کی طرح مارچ کا عورت نمبر بھی مثالی ہوتا ہے۔ شام صاحب کی یہ

> مجھے بھی اعزاز یافتگان کا تعارف
> پیش کرنے کا اعزاز حاصل ہوا
> **جہاں آراء**

کاوش قابل قدر ہے جس سے ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ یقیناً یہ روشنی چار سو پھیلے گی۔ معزز حاضرین اور میڈیا کی موجودگی میں خوشگوار ماحول میں خواتین کی پذیرائی کی یہ تقریب منعقد کر کے شام صاحب نے سب کے دل جیت لئے۔ میں انہیں دلی مبارکباد دیتی ہوں۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ ہمیشہ شاد و آباد رہیں۔ آمین اس کے علاوہ محترمہ الزبتھ نیامت اور جسٹس ماجدہ رضوی صاحبہ نے بھی محمود شام صاحب کا بہت شکریہ ادا کیا اور اطراف خدمت اعزاز کو اپنے لئے اور دیگر خواتین کے لئے نہایت خوش آئند قرار دیا۔

آخر میں راقم الحروف کی جانب سے بھی محمود شام صاحب کے لئے اظہار تشکر لازم ہے۔ کیونکہ محمود شام صاحب نے اس اعلیٰ پایہ کی پر وقار تقریب میں ملک بھر کی نامور علمی و ادبی شخصیات اور تمام اعزاز یافتگان خواتین کے سامنے نہ صرف یہ کہ اس ناچیز کو بھی عصر حاضر کی خواتین کے مسائل پر روشنی ڈالنے کا موقع فراہم کیا بلکہ معزز اعزاز یافتگان خواتین کا تعارف حاضرین کے سامنے پیش کرنے کی سعادت بھی مجھے حاصل ہوئی۔ ملک کے نامور اینکر پرسن اور ادیب محترم علی حسن ساجد صاحب کے ساتھ اسٹیج شیئر کرنا بھی خود ایک اعزاز کی بات تھی۔ اور ان کے تجربات سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع بھی جو شام صاحب کے توسط سے مجھے حاصل ہوا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ایک نہایت خوشگوار سرپرائز مجھے اس وقت ملا جب محمود شام صاحب نے مجھ ناچیز کو جامعہ کراچی میں دو طلائی تمغے حاصل کرنے پر مبارکباد کے لئے ایک یادگاری شیلڈ پیش کی۔ یہ اعزاز ملنے پر میری خوشی ناقابل بیان ہے۔ آپ کا یہ عمل مجھے بلکل ایسا لگا کہ جیسے ایک شفیق باپ اپنی بیٹی کو فخریہ طور پر سب سے متعارف کروا رہا ہو۔ میں محمود شام صاحب کی اس حوالے سے بھی شکر گزار ہوں کہ طلائی تمغے حاصل کرنے پر آپ نے ماہنامہ اطراف کے مارچ کے شمارے میں بھی ایک تہنیتی پیغام میرے لئے شائع کیا۔ ماہنامہ اطراف کے لئے اپنی خدمات پیش کرنا خود میرے لئے ایک اعزاز کی بات ہے۔ میں اپنی خوشی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ آپ نے میری کوششوں کو سراہتے ہوئے مجھے بہت بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔ آپ میرے لئے ایک شفیق اور مہربان استاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمیشہ قابل احترام ہیں۔

میرے لئے یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے کہ آپ مجھ ناچیز کو سیکھنے اور آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ میرا اپنا ذاتی تجربہ یہ رہا ہے کہ محمود شام صاحب نہایت خیر جانبداری سے اپنے ملک کے نوجوان طلبا و طالبات کی نہ صرف حوصلہ افزائی فرماتے ہیں بلکہ انہیں آگے بڑھنے، سیکھنے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے پورے پورے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ آپ ایسے دیپ جلانا چاہتے ہیں جو تا حیات جلتے رہیں اور اپنی تابندگی سے اس ملک پر منڈلانے والے ظلمت کے بادلوں کو چھانٹ دیں۔ شام صاحب کا یقین ہے کہ پاکستان کا مستقبل تاریک نہیں اور ہم طالبعلم انشاءاللہ آپ کے اس یقین کو شرمندہ تعبیر کرنے میں اپنا ہر ممکن کردار ادا کریں گے۔ بہت شکریہ سر، اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھیں۔ آمین

کفالتِ یتیم سے ... جنّت کا حصول بھی ... رفاقتِ رسولؐ بھی
ALKHIDMAT
الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان
ALKHIDMAT FOUNDATION PAKISTAN
AGHOSH COLLEGE
دُعاء
تقدیر بدلنے کا فن جانتی ہے
تو کیا ہی افضل ہو کسی یتیم کی دُعا لے لی جائے
آپ بھی زکوٰۃ وعطیات دے کر شامل ہو جائیں۔۔۔لاکھوں دُعاؤں میں
زکوٰۃ اور عطیات کے لیے
زکوٰۃ میزان بینک 02140101095120
عطیات میزان بینک 02140100861151
0800 44448
www.alkhidmat.org/give

A place to live, and love, forever
ACTUAL IMAGE
Gulberg
Islamabad
Capital Development Authority
5-7-10 MARLA | 1 KANAL
RESIDENTIAL PLOTS
3-year Payment plans
Golf Course
National Level Stadium
Hospital
International Luxury 5-Star Hotel
Mosques
Universities
Foolproof Security System
Marketed by:
STAR Marketing (Pvt.) Ltd.
Planned & Designed by: UPDL
Urban Planning & Design (PVT) Ltd.
A Project of IBECHS
24 HOURS HELPLINE
0300-5704317
0300-5704318
UAN: 111-111-160
0300-5704317
facebook.com/starmarketingpk
www.starmarketingonline.com
ISLAMABAD: Roshan Center, 78-West, 1st Floor, Jinnah Avenue, Blue Area, Islamabad. Ph: 051-2344491-2

WE CATER

FOR THE WHOLE FAMILY

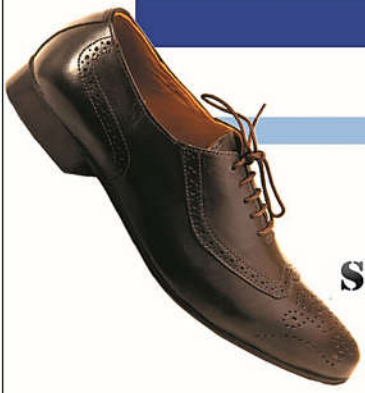

VISIT OUR

SHOWROOMS

ON

Zaibunnisa Saddar, Dolmin Mall Tariq Road
Hydery, Uzma Arcade Clifton

For All Your

Footwear Needs

ENGLISH
BOOT
HOUSE

SHOP ONLINE
@ WWW.EBHSHOP.COM

Regd No. MC - 1398 ☎ 0300-8210636 ✉ www.Atraafmagazine.com